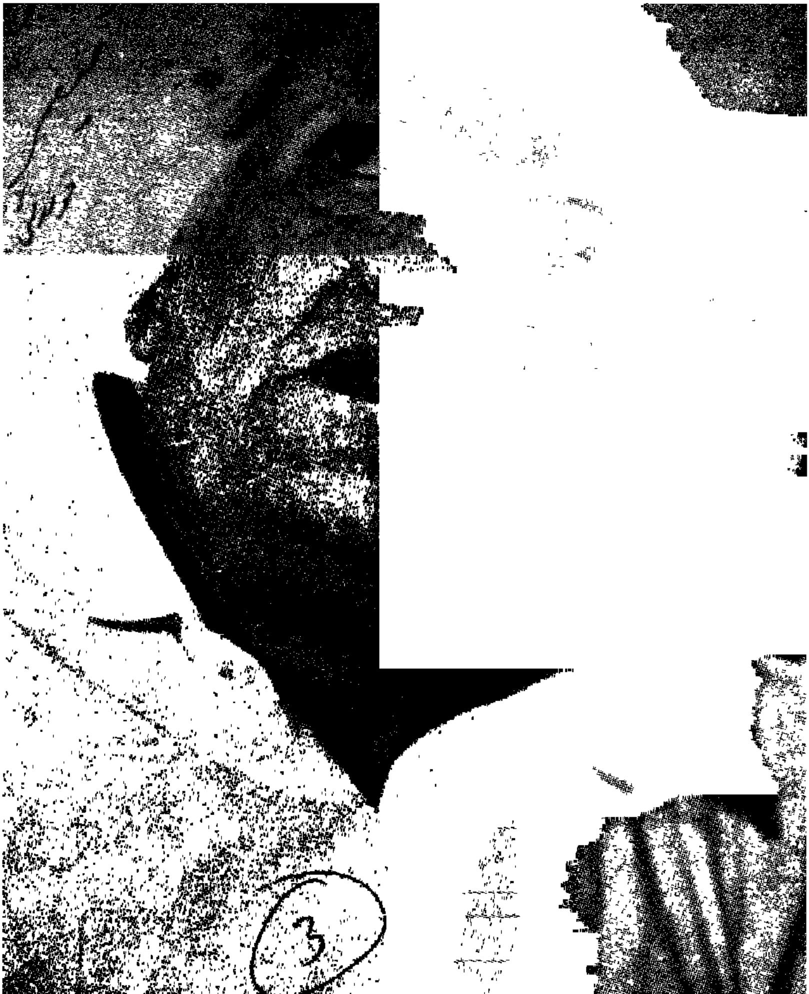
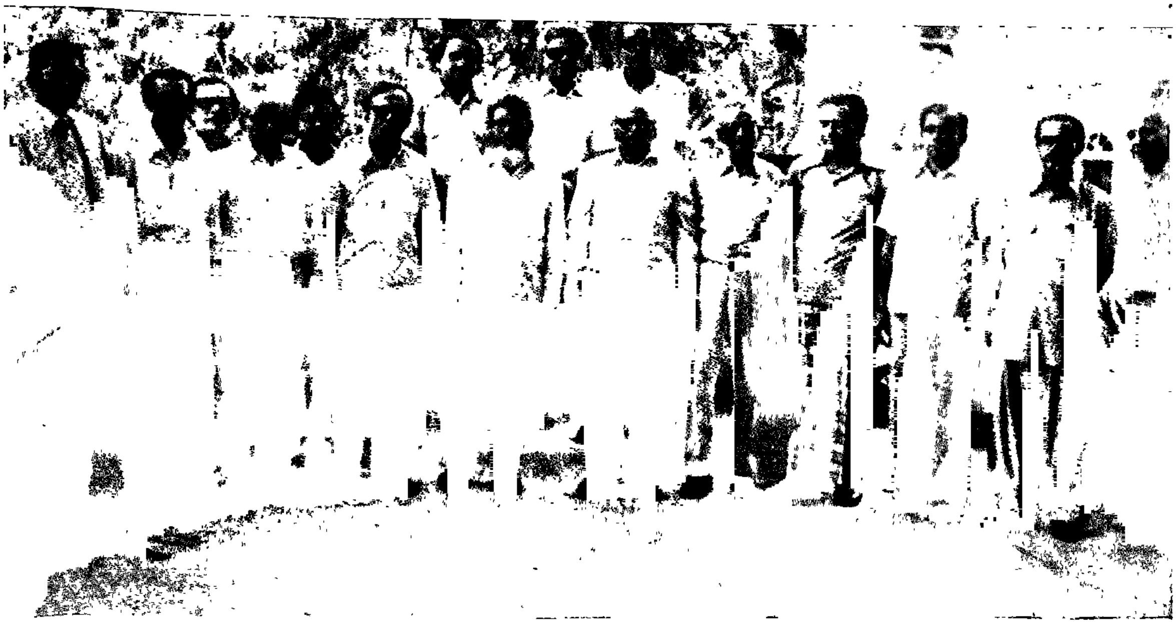


عصری ادب

پاکستانی اردو ادب نمبر

۳۲/۳۱



انجمن ترقی اُردو پاکستان کا استقبالیہ

ریاض الحسن۔ نامعلوم۔ افسانہ نگار۔ شفق خواجہ۔ جلیل قدوائی۔ ممتاز حسین۔ خان رشید۔ محمد حسن۔ شبیر کاظمی سکریٹری انجمن

عصری ادب

پاکستانی اردو ادب نمبر — سال میں چار بار

جولائی ۷۸ء ۱۹ — خاص نمبر ۲۱ تا ۲۴

نگران
محمد حسن

مدیران
سید بہار الدین احمد
روشن آرا

یہ شمارہ: بیس روپے
زر سالانہ: بیس روپے
ممالک غیر سے: چار پونڈ

ادارۂ تصنیف۔ ڈی ۷، ماڈل ٹاؤن۔ دہلی ۹

(سید بہار الدین احمد پرنٹر، پبلشر نے جے کے آفسیٹ پرنٹرس دہلی میں چھپوا کر ادارۂ تصنیف ڈی ۷ ماڈل ٹاؤن دہلی ۹ سے شائع کیا اور بقیہ صفحات حالی پریس میں چھپوائے)

حرفِ آغاز

سیاست انسان کو جغرافیہ اور تاریخ کے دائروں میں بانٹتی ہے اور ادب ان دائروں سے بلند ہونے کی کوشش کرتا ہے اور ایسی صالح سیاست کو جنم دیتا ہے جو بلندی کا نہیں ملانے کا کام کر سکے۔

اردو ادب بھی دلوں کو ملاتا آیا ہے۔ نفرت کے پودے اس کے آنگن میں پھل پھول نہیں سکے ہیں۔ اس لئے ضرورت تھی کہ جغرافیائی اور سیاسی حد بندیوں کو تھوڑی دیر کے لئے نظر انداز کر کے اردو ادب کی پوری اکائی کو سامنے رکھا جائے۔ بدقسمتی سے پچھلے تیس سال سے اردو داں آبادی کے ان دو بڑے ملکوں کے درمیان کتابوں اور رسالوں کی آمد و رفت کا سلسلہ باقاعدگی سے قایم نہیں رہا ہے۔ سرحد کے اُس پار جو کچھ لکھا جا رہا ہے اس کا ایک بہت ہی تھوڑا سا حصہ ہم تک پہنچ پاتا ہے اور پاکستان کے اردو ادیبوں کے فکر و احساس کے سمت و رفتار کو سمجھنا ہمارے لئے ممکن نہیں۔

"عصری ادب" نے پاکستانی اردو ادب کا جائزہ لینے کی ٹھانی۔ مگر اس راہ کی دشواریاں بہت ہیں اور ان کے لئے معذرت ضروری ہے۔

یہ شمارہ پاکستان کے اردو ادب کو ہندوستانی نظروں سے دیکھنے کی کوشش ہے۔ ممکن ہے ہمارے پاکستانی دوستوں کو ہمارے اندازِ نظر سے اختلاف ہو۔ یہ امید بے جا نہ ہوگی کہ وہ اس اختلاف کو خلوص نیت کا نتیجہ جانیں گے یا پھر ہماری نارسائی پر محمول کریں گے۔

پھر بہت سے ادیبوں اور ان کے شاہکاروں کے ذکر کی کمی کھٹکے گی۔ اس کی وجہ بھی ہماری نارسائی ہے۔ جہاں تک ہو سکا اس کی کوشش کی گئی ہے کہ پاکستانی مطبوعات اور رسایل حاصل کئے جائیں۔ کچھ کامیابی بھی ہوئی لیکن ہمیں علم ہے کہ جو کچھ حاصل ہو سکا وہ تیس سالہ ادبی تخلیق کا محض ایک حصہ تھا۔ عین ممکن ہے کہ بعض وقیع کارنامے ہمارے ہاتھ نہ آئے ہوں۔

ان دقتوں کے باوجود پاکستان کے اردو ادب کا برا بھلا جائزہ لازم تھا کہ اردو ادب کی کوئی تصویر بھی اس جائزے کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔ قومی یک جہتی اور قومی دھارے کا چرچا بہت ہوتا ہے لیکن اردو والوں کے لئے ہی نہیں تمام سنجیدہ اور پُرخلوص ہندوستانیوں کے لئے قومی دھارے کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی دھارے سے بھی اپنے رشتے استوار رکھنا ضروری ہے کہ تاریخ سے بے نیاز رہنے والے زندگی بھر ادھورے ہی رہتے ہیں اور ادھوری زندگی پر کون قناعت کر سکتا ہے۔

امید ہے کہ یہ شمارہ پاکستان فہمی اور اردو ادب فہمی میں مددگار ثابت ہوگا۔

محمد حسن

پاکستان کا سفر نامہ

۲۸ر مئی ۱۹۷۷ء تا ۱۵ر جولائی ۱۹۷۷ء

—— ۲۸ر مئی ۱۹۷۷ء کو اکیس سال بعد دوسری بار پاکستان جانے کا موقع ملا۔ اٹاری سے لاہور تک کا یہ سفر ریل گاڑی میں ایک عجیب تجربہ تھا۔ بین الاقوامی سرحد پر اردو میں سائن بورڈ دیکھ کر یگانگت کا احساس ہوا۔ پھر کھیتوں میں کام کرنے والے دبلے پتلے کسان، فاقہ زدہ جانور، دور تک پھیلے ہوئے دیہات بتا رہے تھے کہ ان راستوں نے جنگ کی افتاد جھیلی ہے اور سرحد کے دونوں طرف گرد میں اٹا ہوا ان داتا کسان ابھی آنے والی کل کے انتظار میں ہے۔

—— چند گھنٹے لاہور میں، سب سے پہلے مدیر "نقوش" کا خلوص سے جگمگاتا چہرہ نظر پڑا وہی خوابوں میں کھویا ہوا اور خوابوں کو تعبیر بخشنے والا چہرہ۔ پھر اپنے اعزا، اپنی ہمشیر، جوان عمر بھانجے جنھیں پندرہ سال میں دیکھا تھا ان میں طارق زیدی تھا جو اب اردو میں ایم اے کر کے حلقہ ارباب ذوق لاہور کا سکریٹری تھا اور یہ ضلع کے ایک کالج میں اردو کا استاد۔ اس کرب کا اندازہ کون کر سکتا ہے کہ ریڈکلف کی ایک لکیر نے بہنوں اور بھائیوں کو اس طرح بانٹ دیا ہے کہ ایک دوسرے کے احوال سے بے خبر ہو گئے ہیں۔ جو بچے تھے اب جوان ہو چکے ہیں اور ان کے عزیز ان کی شکلیں بھی نہیں پہچان پاتے اکثر کے نام بھی نہیں جانتے۔ تقسیم کی یہ لکیر خاندانوں سے گزرتی ہوئی دلوں تک جا پہنچی ہے۔ ہندو پاکستان کے باہمی تعلقات میں بھی ان دیکھا کرب اور اس سے بے پایاں مسرت کے سوتے پھوٹے ہیں۔

—— تیز گام سے شام کو کراچی روانگی۔ میرے کراچی پہنچنے سے قبل روزنامہ ڈان اور

جنگ کراچی نے میری آمد کی خبر چھاپی اور دوسرے دن سے پرانے دوستوں، عزیزوں ادیبوں اور دانش وروں کے چہروں کا ایک شناسا ہجوم میرے گرد تھا۔ اس کے بعد ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔

—— سب سے پہلے ڈان کے رپورٹر نے خاصہ طویل انٹرویو لیا۔ اس انٹرویو میں میں نے دو نکات پر خاص طور پر زور دیا تھا۔ ایک یہ کہ پاکستان کی سرکاری زبان اردو ہے لہٰذا عالمی سطح پر اردو کی تعلیم و تدریس اور اعلیٰ تحقیقی کام اور ادبی سرگرمیوں کے درمیان ایک مرکزیت پیدا کرنے کے لئے اقدامات کرنے کی ذمہ داری بھی اس پر عاید ہوتی ہے ضروری ہے کہ عالمی اردو کے لئے مرکزی ادارہ یہاں قایم کیا جائے۔ دوسری بات رپورٹر کے سوال کے جواب میں تھی پاکستان کے اردو ناول میں بھی پاکستان کی جھلک موجود نہیں ہے قریب قریب سبھی اچھے ناول (شوکت صدیقی کے ناول "خدا کی بستی" کے علاوہ) یا تو ہندوستان کے متعلق ہیں یا تقسیم ہندوستان اور اس کے متعلقات کے بارے میں ہیں پاکستان کے کسی ناول میں بھی بلوچستان، سرحد، سندھ یا پنجاب کی عوامی زندگی کو پیش نہیں کیا گیا ہے۔

—— پاکستان میں دو نہایت ہی بلیغ جملے سنے جن کی بلاغت تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔ ایک انجمن ترقی اردو کے سکریٹری شبیر احمد کاظمی صاحب نے کہا کہ "اصل وجود زمین کا ہے میں تو خدا کو پہچانتا ہوں تو زمین کے واسطے سے۔ زمین سب کچھ ہے باقی محض وہم"۔ سیاق و سباق اس کا یہ تھا کہ ایک مدت تک مشرقی پاکستان موجودہ بنگلہ دیش میں اہم مرتبوں پر رہنے کے بعد اپنے خاندان کے نو آدمیوں کو لاپتہ چھوڑ کر پاکستان آئے جبکہ انھوں نے اپنے بچوں کی شادیاں بنگالیوں میں کی تھیں۔ اپنے بچوں کو بنگالی پڑھائی تھی۔ وہ کہتے تھے کہ یونی ورسٹی سنڈیکیٹ کے جلسوں میں یہ مذاق ہوا کرتا تھا کہ ہم بنگالیوں کو مکان بنانے کی ضرورت کیا ہے ہم تو ان پاکستانیوں کے بنائے ہوئے مکانات پر قبضہ کرلیں گے ان کا یہ خیال ہے کہ یہی صورت سندھ میں پیدا ہوگی۔ بات کرتے کرتے خاموش ہوجاتے تھے، بہت اداس اور افسردہ اور بہت مخلص۔

—— دوسرا جملہ اختر لائے بوری نے کہا جو اس دعوت میں موجود تھے۔ جو جمیل جالبی نے میرے اعزاز میں دی تھی ذکر پروفیسر محمد مجیب کی علالت کا تھا جس میں ان کی یادداشت جاتی رہی تھی۔ انھوں نے کہا "ہمارے معاشرے کی بھی یادداشت جاتی رہی ہے"۔

—— ترقی اردو بورڈ گیا۔ ابواللیث صدیقی سے معلوم ہوا کہ ۸۰ لاکھ روپے اب تک اردو لغت کی تیاری میں صرف ہو چکا ہے اور اب تک صرف ۱۲۰۰ صفحات ۱۸ سال کی مدت میں شائع ہوئے ہیں اور اس میں بھی غلطیاں ہیں۔ کارڈ دیکھے لغت نہایت تفصیلی ہے اور آکسفورڈ کی انگریزی لغت کے طرز پر ۱۲ جلدوں میں مکمل ہوتی ہے اب صرف دو لاکھ رقم باقی ہے اس کا اپنا پریس ہے مگر میرے بیٹھنے کے دوران لیث صاحب اور پریس انچارج کے درمیان دفتری احکامات کا تبادلہ ہوتا رہا۔ ان احکامات کی نوعیت یہ تھی کہ لیث صاحب اسے کسی اور شعبے میں منتقل کرنا چاہتے تھے اور وہ نہ تو اس کے لئے تیار تھا اور نہ اسٹاک رجسٹر دینے پر آمادہ تھا۔ سات سو روپے فی صفحہ طباعت وغیرہ کا تخمینہ لگایا گیا تھا جب کہ چالیس روپے فی صفحہ پر طباعت ممکن ہے۔

—— ویسے لیث صاحب نے کام بڑے سلیقے سے کیا ہے کراچی یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو میں .... لسانی معمل کے وہ انچارج ہیں۔ ۱۶ر مئی کو شعبۂ اردو کے استقبالیہ جلسے کے بعد وہ اپنے معمل لے گئے وہاں ریسرچ معمل بھی دیکھا اس میں ایک مشین مائیکروفلم ریڈر پرنٹر دیکھی جس میں مائیکروفلم کا اسٹرپ رکھ کر پڑھا بھی جاسکتا ہے اور اسے بڑا کرکے اس کا زیروگراف بھی تیار کیا جاسکتا ہے۔ اس کی مالیت چالیس ہزار روپے ہے اور فورڈ فاؤنڈیشن سے شعبۂ اردو کراچی یونی ورسٹی کو ملی ہے۔

—— انھوں نے اردو اصوات کی کیموگرافی کی ہے اس کے تقریباً ۵۴ چارٹ کمرے میں لگے ہوئے ہیں اس کے ساتھ مختلف آوازوں کی ادائیگی کے وقت زبان، ہونٹ اور حلق کی پوزیشن ظاہر کرنے والے بہت سے تصویری چارٹ تھے۔ اس کے علاوہ دوسرا بڑا کام بنیادی اردو ہے (حالانکہ جن الفاظ کا انتخاب اس میں کیا گیا ہے ان کے بنیادی ہونے میں مجھے شبہ ہے) پھر ان الفاظ کے متبادل سندھی، پنجابی اور پشتو میں دریافت کرکے الگ

الگ کتابوں کی شکل میں انہیں شائع کیا گیا ہے۔

____ بارہ جلدوں میں اردو میں ایک ضخیم انسائیکلو پیڈیا آف اسلام شائع ہوا ہے جو بقول مشفق خواجہ اتنا اہم کام ہے کہ صرف یہی ایک کام تیس سالہ قیام پاکستان کا حاصل کہا جا سکتا ہے۔ یہ جلدیں بہت خوب صورت چھپی ہیں گو نام کو یہ انگریزی والے انسائیکلو پیڈیا کا ترجمہ ہے لیکن درحقیقت اس میں بہت اضافے کئے گئے ہیں۔

____ اس کے علاوہ لاہور سے شائع ہونے والی بدخشانی کی اردو لغت ہے جو مروجہ الفاظ پر محیط ہے اور ایک سو بیس روپے کی ہے۔ اسی طرح دفاتر میں استعمال ہونے والی اصطلاحات کے اردو تراجم کی لغات ہے چھوٹے نغات بھی ہیں جن میں ایک کتاب " اردو مترادفات " لاہور ریلوے بک اسٹال پر دیکھی تھی۔

____ لیث صاحب جو لغت مرتب کر رہے ہیں (یا جسے شان الحق حقی اور ان سے قبل جوش صاحب، شوکت سبزواری، ڈاکٹر شہید اللہ وغیرہ نے مرتب کیا ہے) اس کا طریق کار یہ ہے کہ ہر لفظ کی اصل، تلفظ، معانی کی تفصیلات کے ساتھ یہ بھی صراحت کی جائے کہ سب سے پہلے کب اور کس معنی میں استعمال ہوا۔ اور بعد کے ادوار میں معنی کی تبدیلی کے ساتھ کس جگہ اور کس کتاب میں استعمال ہوا۔ ان حوالہ جات کی فراہمی کے لئے اب تک کوئی ۲۲۰۰ کتابیں پڑھی گئی ہیں۔ جب کہ پڑھی جانے والی کتابوں کی تعداد زیادہ ہونی چاہئے تھی اندازہ یہ ہے کہ الفاظ کی مجموعی تعداد ۲ لاکھ ہوگی جبکہ اندازاً ان کی تعداد ½۲ لاکھ سے کم نہیں ہونی چاہئے۔

____ یہ معلوم ہوا کہ ۴۸ء میں کوئی صاحب عمر یافعی نامی حیدر آباد (دکن) سے متعدد صندوقوں میں بڑی تعداد میں اپنے جمع کئے ہوئے دکنی اور اردو مخطوطات اور مطبوعات کا بڑا ذخیرہ لے کر کراچی آ گئے تھے۔ یہ ایک غیر شادی شدہ بوڑھے تھے اہل ثروت نہ تھے مگر کتابیں اور مخطوطات جمع کرنے کا غیر معمولی ذوق رکھتے تھے انھوں نے اپنا پورا اثاثہ انجمن کی نذر کر دیا اور ڈاکٹر عبدالحق کو دے دیا۔ اب ان کے دیئے ہوئے مخطوطات نیشنل میوزیم آف پاکستان کراچی میں محفوظ ہیں۔ ان میں بہت ہی نادر مخطوطات ہیں اور جمیل جالبی کے اندازے کے مطابق ان کی تعداد ۲۰۰۰ سے کم نہیں ہے۔ ان میں قاضی محمود دریائی کی کلیات کے تین نسخے

حاتم کے دیوان قدیم کا نسخہ، نظامی کی کدم راؤ پدم راؤ اور دوسرے لاتعداد ایسے مخطوطات ہیں جن کے وجود کا علم ہی دنیا کو نہیں ہے۔ ۴۰ قدیم بیاضیں ہیں جو نویں اور دسویں ہجری کی ہیں۔ اسی طرح پنجاب لائبریری میں ۱۲ ہزار مخطوطات ہیں۔ دیوان آبرو کے دو نسخے بھی انجمن کے کتب خانے سے نیشنل میوزیم پہنچ گئے ہیں ان میں سے ایک نسخہ آبرو کی حیات کا لکھا ہوا ہے غالباً ۱۱۴۴ء کا جبکہ آبرو نے ۱۱۴۶ء میں وفات پائی تھی۔ ناسخ کا دیوان سوم بھی یہاں موجود ہے۔

—— پاکستان کے سبھی مخطوطات کی ایک وضاحتی فہرست دس جلدوں میں مشفق خواجہ مرتب کر رہے ہیں۔ اس کی پہلی جلد زیر طبع ہے۔ اس میں یہ اہتمام کیا گیا ہے کہ مخطوطے کے بارے میں عمومی تفصیلات، خصوصیات کی بحث، ہر مخطوطے کے دوسرے ترجموں کی تفصیلات اور موازنہ، اور اس مصنف یا مخطوطے کے بارے میں دستیاب ہونے والے سبھی مواد کی نشاندہی کی گئی ہے۔ میں نے ناسخ کے دیوان کے مخطوطے پر ایک اندراج دیکھا جو تقریباً ۲ صفحات پر مشتمل تھا۔ مشفق خواجہ کا یہ کام اردو تحقیق کے لئے نہایت اہم ثابت ہوگا اور اس کی مدد سے تحقیقی سرمایے کی نشان دہی آسانی سے کی جا سکے گی۔

—— نظریاتی تنقید کے ضمن میں ایک صاحب ہادی حسن ہیں جو سول سروس کے آدمی ہیں انھوں نے 'شاعری اور تخیل' ایک کتاب شائع کی ہے جو مجلس ترقی ادب سے شائع ہوئی ہے اور اس سلسلے میں اہم مغربی تنقید کے جن شہ پاروں کے ترجمے انھیں کرنے پڑے انھیں 'مغربی شعریات' کے نام سے شائع کیا ہے۔ یہ کتاب میں نے دیکھی ہے۔ ہادی حسن صاحب ان دنوں ترقی اردو بورڈ کے صدر ہیں ان سے ملاقات بھی ہوئی۔ کتاب میں براہ راست فرانسیسی اور شاید جرمن سے بھی ترجمے کئے گئے ہیں مگر بعض غیر اہم نقادوں کو بھی شامل کر لیا گیا ہے اور بعض اہم نقاد نظر انداز ہو گئے ہیں۔

—— جہاں تک تخلیقی ادب کا سوال ہے یہاں جن لوگوں کے ناموں کی دھوم ہے وہ یہ ہیں۔

شعرا:- فیض، ابن انشا، احمد فراز، حبیب جالب، احمد ندیم قاسمی، جیلانی کامران، منیر نیازی فہمیدہ ریاض، پروین شاکر (خوشبو) رضی اختر، ظفر اقبال، ایک اور حلقہ تھا رباب

انیس ناگی کا ہے جو نئی شعری لسانیات وضع کرنا چاہتے ہیں اور ان دونوں کی کتابیں اس سلسلے میں شائع ہوئی ہیں۔

—— وزیر آغا کا اپنا الگ گروہ ہے۔ افسانہ نگاروں میں انور سجاد اہم ہیں۔ یہ پیشے کے اعتبار سے ڈاکٹر ہیں لیکن اداکار، ڈراما نگار اور افسانہ نویس ہیں ان کے علاوہ انتظار حسین، احمد ندیم اور ایک گروہ میں خالدہ اصغر اور ایک دوسرے گروہ میں رشید امجد، قمر عباس، ندیم مقبول ہیں۔

—— ریڈیو اور ٹی وی ڈرامے میں انور سجاد، اشفاق احمد، قدسیہ بانو، اور غیر ادبی نیم مزاحیہ نیم کاروباری ڈرامے میں حسینہ معین اور اطہر شاہ خاں مقبول ہیں جن کے دو ڈرامے۔ جمع ضرب تقسیم اور ہیلو ہیلو ان دنوں ٹی وی پر دکھائے جا رہے ہیں۔ میں نے دونوں ڈراموں کی ایک قسط دیکھی۔ ڈراموں میں کوئی خاص بات نہیں سوائے اس کے کہ پیش کش کا طریقہ فلمی طرز کا ہے اور سیٹنگ اور پیش کش میں وہی انداز ہے۔

—— تنقید کے بارے میں جمیل جالبی کا یہ خیال ہے کہ شکست و ریخت کا عمل جاری ہے اور یہ کاٹ چھانٹ صرف اس لئے ہے کہ خیال کی نئی بنیاد کی تلاش جاری ہے اس ساری جھنجلاہٹ اور اکتاہٹ سے گویا فکر نو کا کھاد تیار ہو رہا ہے۔ سلیم احمد اور شمیم احمد کی تنقیدیں دل چسپی سے پڑھی جاتی ہیں۔ حسن عسکری تو ہیں ہی مگر اب کم لکھتے ہیں۔ پھر فتح محمد نام کے کوئی صاحب ہیں جنھیں احمد ندیم قاسمی نے متعارف کرایا ہے اور جن کی کتاب تعصبات شائع ہوئی ہے۔

—— شاعروں اور ادیبوں کی ایک خاصی بڑی تعداد تصوف اور اسلامیات کا رخ لئے ہوئے ہے۔ تصوف کی طرف مائل ہونے والوں میں محمد حسن عسکری سر فہرست ہے سنا ہے ان دنوں مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کی کتابوں کا انگریزی میں ترجمہ کر رہے ہیں۔ بہشتی زیور بھی ان میں شامل ہے۔ اردو کا اصل اسلوب وہ انھیں کے طرز کو مانتے ہیں۔ ان کے علاوہ اشفاق احمد، انتظار حسین، سلیم احمد، صلاح الدین محمود مدیر 'سویرا' اور دوسرے متعدد مصنفین شامل ہیں درحقیقت پاکستان کی اردو تنقید لائق اعتنا نہیں۔ مجنوں اور ممتاز حسین، جمیل جالبی کے علاوہ کوئی لائق ذکر نقاد نہیں ہے۔ پاکستانی ادیبوں کو اپنی شاعری پر فخر ہے۔ یہ بھی سنا ہے کہ ہندوستان میں اردو شاعری نہیں ہو رہی ہے اس سے میں کیا نتیجہ نکالوں، یہ ناواقفیت کا اظہار ہے یا اختلاف مذاق کا۔

—— ایک اہم بات پاکستان میں ہندی سے دلچسپی ہے۔ ابواللیث صدیقی نے بتایا کہ لغت میں الفاظ کی ہندی اصل واضح کرنے کے لئے ہندی ٹائپ کی ضرورت تھی یہاں ہندی ٹائپ موجود نہیں تھا لہٰذا خاص طور پر ڈھالا گیا۔ جمیل جالبی نے کہا کہ 'نیا دور' کا ہندی ادب نمبر مرتب کرنا چاہتا ہوں جو ضخیم ہو اور ہندی ادب کے تمام اہم رجحانات پر محیط ہو۔ کراچی یونیورسٹی میں ہندی ڈپلوما کی تعلیم شروع ہوئی ہے ابھی ایک مسلمان ہندی داں لیکچرار کا تقرر کیا گیا ہے۔

—— ممتاز حسین کی نئی کتاب امیر خسرو پر شائع ہوئی ہے جس میں پہلی بار ممتاز نے تحقیق کے میدان میں کام کیا ہے اور بہت سی نئی باتیں دریافت کی ہیں جس پر بعض لوگ چیں بجبیں بھی ہیں۔ ممتاز کے کہنے کے مطابق امیر خسرو کے قبیلے ہی کا نہیں بلکہ والد کا نام لاچین تھا اور وہ سلطان کے زرخرید غلام تھے۔ ان کی جائے پیدائش پٹیالی نہیں دہلی ہے اور ان کے بارے میں جو معلومات شبلی اور وحید مرزا نے جمع کی ہیں وہ اکثر ناقص ہیں۔ خواجہ حسن سے ان کی بول چال تک مدتوں بند رہی اور یہ دونوں ایک دوسرے کے حلیف نہیں حریف تھے۔

—— شوکت صدیقی ایک کتاب گم شدہ اوراق کے عنوان سے لکھ رہے ہیں جو ان مہاجرین کی کہانی ہے جنہوں نے آزادی کی جدوجہد کے لئے ترک وطن کیا ان میں وہ مسلم نوجوان تھے جو افغانستان اور روس گئے اور غدر پارٹی کے رہنما بھی تھے۔ اس کے تین ابواب میں نے پڑھے۔

—— جمیل جالبی نے ایک لطیفہ سنایا ذکر تھا کدورت اور مخاصمت کا کہ کام کرنے والوں کو کینہ پروری کی فرصت نہیں ہوتی۔ میرٹھ میں ایک مجذوب ڈیوڑھی میں پڑے رہتے تھے بالکل برہنہ۔ ڈیوڑھی کا صدر دروازہ ایک ہی تھا عورتیں بچے بھی اسی دروازے سے آتے جاتے تھے۔ کبھی کبھی کوئی ان پر چادر ڈال دیتا تھا۔ ایک دن صاحب خانہ نے مجذوب سے کہا کہ بابا صاحب، بہو بیٹیوں کا آنا جانا لگا رہتا ہے آپ کے پاس چادروں کی کمی نہیں جسم پر چادر پڑی رہنے دیا کریں۔ مجذوب آنکھیں بند کئے بیٹھے تھے یہ بات سن کر کوشش کے ساتھ آنکھیں کھولیں اور ان کی طرف غور سے دیکھا بولے۔

—— "میاں! فرصت کی باتیں کرتے ہو!!" یعنی خیال ہارے اتنی فرصت کسے کہ ستر پوشی کرے

—— یہاں ایک صاحب ہیں لطف اللہ خان کے آڈیو ریکارڈنگ (KAY• Advertising) کے

کرتا دھرتا ہیں ۲۵۸، سبن گپتا روڈ۔ کاسموپلٹن کالونی۔ کراچی میں ایک ہندو بزنس مین کے ٹائلوں کے فرش والے مکان میں رہتے ہیں یوں تو رہنے کو چند کمرے ہی ہیں۔ کمرے کرایے کے ہیں اور سندھی بزنس مین خود بھی نیچے کے مکان میں رہتا ہے اور خوش حال معلوم ہوتا ہے اوپر کا کمرہ ایرکنڈیشنڈ اور ساؤنڈ پروف اسٹوڈیو بھی ہے اور ڈرائنگ روم بھی۔ یہ کمرے یورپ کے کمروں کی طرح یا ان سے بھی بازی لے جانے والے تھے۔ مخملی فرش تھا خوشنما لکڑی کے پینل کی پوری لائبریری تھی جس میں مختلف آوازوں کے ریکارڈوں کی فہرست اور مکمل اشاریہ محفوظ تھا۔

—— انھوں نے کمال یہ کیا ہے کہ سبھی بہترین موسیقاروں کی آوازیں محفوظ کرلی ہیں اور سبھی اعلیٰ شاعروں، ادیبوں، بہترین مقرروں کی تقریریں، وعظ اور نعتیں ریکارڈ کر رکھی ہیں۔ چند ادیبوں کے علاوہ باقی سبھی کی آوازیں ریکارڈ کرلی گئی ہیں۔ انھوں نے ان آوازوں کے آمیزوں سے حیرت خیز کارنامے کئے ہیں مثلاً انھوں نے ذوالفقار بخاری کی آواز میں اردو دیوان غالب کا بڑا حصہ ریکارڈ کیا اور ان کا انگریزی ترجمہ احمد علی کی آواز میں ریکارڈ کیا پھر دونوں کو ملایا یعنی پہلے بخاری کی آواز میں غالب کا شعر اور اس کے فوراً بعد احمد علی کی زبانی انگریزی ترجمہ تھا۔ ایک عجیب وغریب تجربہ تھا یہ اتنا بڑا ذخیرہ ہے کہ ان کی مدد سے اردو درس وتدریس کا صوتی اور بصری ذخیرہ فراہم ہے اور تدریس اور تشویق ادب کے سلسلے میں انقلاب انگیز کام کیا جاسکتا ہے۔

—— میرے اعزاز میں جو مشاعرہ ہوا اس میں مجنوں، شور علیگ، رئیس امروہوی اور شان الحق حقی اور شبنم رومانی اور دوسرے شعرا نے شرکت کی۔ جو شعر یہاں پڑھے گئے ان میں مہاجر کی ذہنی کیفیت اور ناسٹلجیا غالب تھا۔ ایک شاعر نے پڑھا:

گراں تھا اس لئے ڈوبا ہوا تھا سبک ہو کر ابھرنا چاہتا ہوں

عادل فریدی نے اچھے شعر پڑھے۔ سرور جاوید نے پڑھا:

یہ لوگ گھر کے تصور سے آشنا ہی نہیں کیسے بتاؤں کہ خانہ خراب میں بھی تھا

شبنم رومانی نے لکھا:

بستیوں کو بانٹنے والا جو خط کھینچا گیا　　خط کشیدہ لوگ اس کو رہ گزر کہنے لگے

شان الحق حقی نے لکھا:

دیکھے کوئی افلاک کا یہ جوش تباہی　　تنکے کو ڈبونا ہو تو طوفان اٹھائیں

اے مسکن خوبانِ زماں شہر عزیزاں　　ہم بھی کبھی بکنے ترے بازار میں آئیں

رئیس امروہوی کا شعر ہے:

یہ راہ شوق تیری رفاقت میں کٹ گئی　　اے دوست چند اور قدم قتل گاہ تک

شور علیگ نے کہا:

ترے شہر میں وہ عالم بھی گزر گیا جنوں پر　　کوئی مجھ سے بات کرتا تو میں اشکبار ہوتا

غم دوستاں غنیمت ہے وطن سے دور ورنہ　　مرے دل پہ کیا گزرتی جو مرا دیار ہوتا

—— میرے اعزاز میں شب افسانہ منعقد ہوئی اس میں آفسر آذر، عشرت حسین اور رضیہ فصیح احمد کے افسانے بہت ہی اچھے تھے سب میں تبدیلی کی خواہش تھی۔ ایک کربیہ اور کلبیہ طنز تھا۔ مشرف کا افسانہ مہاجر کی زمین سے اکھڑے ہوئے ہونے کو کرایے کے مکان کی علامت سے ادا کر رہا تھا۔ افسر آذر کا افسانہ کراچی میں گھی کی قلت اور ٹیڑھی انگلیوں سے گھی نکالنے کی داستان تھا۔ "ایک عجیب اتفاق یہ ہوا کہ اگلی نسل کے سبھی بچے ٹیڑھی انگلیاں لیکر پیدا ہوئے"۔ پھر رضیہ فصیح احمد اور غلام عباس کے معرکے کے افسانے تھے جن میں آزادی کی تڑپ اور انسانیت کا درد غالب تھا۔

—— ایک صاحب ہیں یوسف بخاری۔ انھوں نے جمیل جالبی کے بیان کے مطابق اردو گیت، اردو پہیلیوں اور اردو کے عوامی قصوں کے تین انتخاب شائع کئے ہیں۔ یہ جامع مسجد دہلی کے امام کے خاندان سے ہیں اور یہ کام انھوں نے ٹھیٹھ دہلوی پس منظر میں کیا ہے۔

—— اخباروں میں اردو کالموں کی صورت حال اور کالم نویسی، احمد ندیم، جمیل الدین عالی، مشتاق یوسفی، کے موجودہ مشاغل۔ کہا جاتا ہے کہ احمد ندیم کی ماہانہ آمدنی دس ہزار روپے ہے مختلف اداروں کے صدر اور سربراہ ہیں۔ جمیل الدین عالی نیشنل بنک کارپوریشن کے سربراہ ہیں ہندوستان کے مخالف اور پاکستانیت کے علمبردار ہیں۔

—— غالب پر فلم ابراہیم نے ۱۹۶۹ء میں...... دولاکھ روپے میں رنگین فلم بنائی۔ اس کا

یہ حصہ دیکھا فلم بہت اچھی ہے۔ تاج محل کا ماڈل بنایا ہے ایسے ہی ہندوستان کی دوسری جگہوں مثلاً دلی کی پریڈ گراؤنڈ کو جو غدر کے زمانے میں دہلی کے شرفا کی آبادی کا اہم مرکز تھی، ماڈل بنا کر فلم میں استعمال کیا ہے۔ فلم اچھی ہے عالمانہ ہے اور اس دور کی علمی اور ادبی فضا کی خاصی مستند دستاویز ہے۔ تکنیک ڈاکومنٹری ہی کی ہے۔ غالب کردار کی حیثیت سے سامنے نہ آتے تو اچھا تھا۔

—— مگر لطف یہ ہے کہ پاکستانی گورنمنٹ نے فلم کو دکھانے کی اجازت اس وجہ سے نہیں دی کہ غالب تو ہندوستانی شاعر ہے اس کا چرچا پاکستان میں ہونا مناسب نہیں۔ دوسرا اعتراض شراب وغیرہ پر تھا۔ اقبال پر بھی فیقی نے فلم بنائی ہے مگر اسے بھی ریلیز کی اجازت نہیں ملی۔ وجہ یہ ہے کہ مولویوں کو اقبال رحمۃ اللہ علیہ کو پردۂ سیمیں پر دکھانے ہی پر اعتراض ہے۔

ایک ذمہ دار فرد نے اس خیال کا اظہار کیا کہ پاکستان میں

اردو کا کوئی مستقبل نہیں۔ پاکستان میں تو عربی زبان سرکاری ہونی چاہیئے۔ مجھے تاریخ اور لسانیات..... کے سارے عمل سے اس بے خبری پر سخت صدمہ ہوا۔ دوسرے احباب سے ذکر کیا تو انھوں نے بتایا کہ آغا خاں مرحوم نے اس خیال کی ترویج و اشاعت کی تھی اور اس کے بعد یہاں کے بعض لیڈر اسے لے اڑے۔

—— میرے دورانِ قیام میں بھٹو کو معزول کر کے جنرل ضیاء الحق نے اقتدار ہاتھ میں لے لیا۔ پاکستان میں تیسری بار مارشل لا لگا۔ مہاجر بھٹو سے عموماً سخت ناراض تھے۔ جمیل جالبی نے اس ردعمل کا بڑا خوب صورت اظہار کیا "ایسا لگا جیسے خاص عید کے دن موت ہو گئی ہو" یعنی بھٹو کے جانے کی خوشی اور فوج کے آنے کا صدمہ یکجا ہو گیا۔

پاکستان کیا اور کیسا

—— پاکستان کیسا ہے؟

—— ہندوستان سے جو تصور لے کر آیا تھا پاکستان کو اس سے کہیں زیادہ متمول اور خوشحال پایا دولت لوگوں کے پاس ہے جن کے پاس دولت ہے ان کے پاس بہت ہے۔ دولت کا مظاہرہ فیشن میں داخل ہے لوگ آزادی سے باہر کا سامان منگاتے اور استعمال کرتے ہیں

کم سے کم کراچی کے ہر بیسویں خاندان کا کوئی نہ کوئی فرد بحرین، دُبائی، کویت یا عرب اور افریقی ممالک میں برسرروزگار ہے اور وہاں سے اپنے خاندان کے لوگوں کو رقم اور سامان بھیجتا ہے۔ اعلیٰ تعلیم کم ہے اور اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کی مانگ اچھی خاصی ہے۔ میڈیکل کالجوں میں عام طور پر انگ سے مقابلے کا امتحان نہیں ہوتا بلکہ پچھلے تعلیمی ریکارڈ پر ہی داخلہ ہو جاتا ہے۔ بنک اور پاکستان کی فوج اور پاکستان ایرلائنز میں بھی ملازمت کے یہی راستے ہیں۔

ـــــ البتہ جو قاعدہ بھٹو راج میں مہاجر آبادی کی پریشانی کا باعث تھا وہ کوٹا سسٹم کا تھا۔ بھٹو نے ہر پاکستانی کے لئے شناختی کارڈ لازمی قرار دے دیا تھا اور ہر کارڈ میں ہر باشندے کا صوبہ درج ہوتا تھا اور ہر قسم کی ملازمتوں اور یونیورسٹیوں میں داخلوں میں بھی پاکستان کے چار صوبوں کے لئے برابر جگہیں مخصوص تھیں اس لئے مہاجرین کو مقامی آبادی سے مقابلہ کرنا ہوتا تھا اور مقامی کو مہاجرین پر ترجیح ملتی تھی۔ شاید یہ صورت حال اب بھی ہو۔ اس سے مہاجرین اور مقامی آبادی کے درمیان ایک رسہ کشی کی صورت پیدا ہو گئی تھی۔

ـــــ ایسا لگتا ہے کہ معاشرے اور سیاست دونوں سطحوں پر پاکستان نے مغربی ایشیا کے عرب ممالک کو اپنا معیار بنا لیا ہے عرب ممالک کی طرح پاکستان کی اقتصادیات بھی غیر ملکی زرمبادلے پر قایم ہے اور آزادی سے باہر کی مصنوعات درآمد کی جاتی ہیں۔ جاگیرداری کے پرانے نظام کو تھوڑی بہت کتر بیونت کے ساتھ برقرار رکھا گیا ہے۔ سنا ہے کہ سندھ میں ایسے وڈیرے اور نواب ہیں جن کے اپنے ذاتی ہوائی جہاز ہیں اور ان ہوائی جہازوں میں وہ اپنے جاگیروں کی پیداوار برآمد کرتے ہیں ان کے ذاتی قید خانے ہیں بھٹو سرکار کے زمانے میں صرف ایک ایسے قید خانے سے ایک ہزار قیدی رہا کرائے گئے تھے۔ بلوچستان اور سرحد میں ان نوابان اور امرا کی بڑی تعداد ہے مسلم لیگ کے لیڈر پیر پگاڑو کا بھی یہی حال ہے۔

ـــــ عام لوگوں میں تشدد اور عیش پسندی کا رجحان عام ہے۔ نماز پڑھنے کی تلقین جگہ جگہ بسوں اور چوراہوں پر دیکھی لیکن دوسرے انسانوں سے اچھے برتاؤ کی تلقین یا کمزوروں اور غریبوں، مریضوں اور ناداروں کی مدد کرنے کے بارے میں کوئی جملہ کہیں نہیں دیکھا۔ مسجدیں بڑی بڑی نرالی انوکھی طرز کی ہیں اور بہت ہیں۔ ذوالفقار علی بھٹو نے کراچی کلفٹن کے ساحل پر ایک

کسینو (CASSINO) اس خیال سے بنایا تھا کہ غیر ملکی سیاح یہاں جوا کھیلیں گے اور خوب غیر ملکی زر مبادلہ ان سے حاصل ہو گا۔ مگر پچھلے انتخابات میں بے ایمانی کے خلاف جب پی این اے کی سرگردگی میں مولویوں کی بالادستی ہوئی اور نظام مصطفےٰ قائم کرنے کے مطالبے نے زور پکڑا تو بھٹو نے ملک بھر میں شراب بندی کا اعلان کیا اور کسینو بھی مسجد بنا دیا گیا۔ ؎

خراب رہتے تھے مسجد کے آگے میخانے — نگاہ مست نے ساقی کی انتقام لیا

کراچی میں ڈیفنس کالونی میں ایک نئے طرز کی مسجد تعمیر ہوئی ہے جو لندن کی سیارہ گاہ کے طرز پر ہے اور غالباً ایر کنڈیشنڈ ہے۔ اسی طرح لاہور میں مسجد شہدا بنائی گئی جس میں گرجا کے طرز پر صرف ایک مینار ہے۔ اس مسجد کی بنا ۱۹۶۵ء کی جنگ کے شہیدوں کی یاد میں رکھی گئی ہے اور سنا ہے کہ اس کی بنیاد میں "نقوش" کا لاہور نمبر رکھا گیا ہے۔ ہند و پاک میں یہ اعزاز شاید ہی کسی دوسری زبان کے رسالے کے حصے میں آیا ہو۔

مسجدوں کی یہ بہتات مذہبیت اور رواداری کے بجائے تنگ نظری، سفاکی اور توہم پرستی کی شکل میں ظاہر ہوئی ہے۔ مذہب کا ادعا تنا ہے کہ ہر قسم کی آزاد خیالی ممنوع ٹھہری ہے۔ موسیقی کے علاوہ جو پاکستان کے نہایت اعلیٰ درجے کے ٹیلی ویژن اور ریڈیو پروگراموں کی پناہ میں ہے۔ ہر قسم کے فنون لطیفہ پر غیر محسوس قدغن ہے اور تمام فنون لطیفہ مرجھا رہے ہیں۔ یوں تو لاہور میں کالج آف آرٹ بھی ہے ڈرامے کا تھوڑا بہت چرچا بھی ہے لیکن ان سب کی جڑیں پاکستانی معاشرے میں نہیں ہیں نتیجہ یہ ہے کہ پاکستان کے بڑے مصور یا تو ٹائٹل کور بنا رہے ہیں یا اردو کے بڑے شاعروں کے کلام کو مصور کر رہے ہیں یا پھر صادقین کی طرح خطاطی میں مختلف فنی طرزیں پیدا کر کے قرآن مجید کی آیات لکھ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ رہے ہیں۔ رقص ناپید ہو چکا ہے اور موسیقی کا ارتقا نزاکت حسین لطافت حسین کے گھرانے اور مہدی حسن کی غزلوں پر آ کر ٹھہر گیا ہے۔ سنگ تراشی کا حال یہ ہے کہ چند سال پہلے سنگ تراشی کے اعلیٰ ترین مجسمے کو کسی تنگ نظر ملا نے نقصان پہنچایا تھا۔

ایک طرف تو جھاڑ پھونک والے عاملوں کا بازار گرم ہے۔ کراچی اور لاہور کی دیواروں پر عاملوں کے اشتہار جا بجا نظر آتے ہیں دوسری طرف مذہبی

تنگ نظری نے مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے درمیان نفرت کی دیوار کھڑی کر دی ہے قادیانی غیر مسلم قرار دیئے جا چکے ہیں اور اس پر اچھے خاصے پڑھے لکھے حلقوں میں بھی کسی قسم کا پچھتاوا نظر نہیں آتا۔ پاکستان سے میری واپسی کے چند ماہ بعد ہی شیعہ سنّی فسادات کی خبر آئی۔ کراچی کا مشہور امام باڑہ جلا دیا گیا۔ کراچی میں شیعوں کی الگ کالونی کا قیام بھی اس قسم کی منافرت کا ثبوت ہے اور ابھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ غلط مذہبیت کے غلبے کا ایک دردناک پہلو یہ ہے کہ ہر قسم کی آزاد خیالی خطرے میں ہے۔ کٹھ ملّاؤں کو مذہبی غلو کا اظہار کرنے کی پوری آزادی ہے۔ ایک پڑھے لکھے مبلغ مولوی صاحب سے ملاقات ہوئی جو کراچی میں صبح سے شام تک کے لئے ٹیکسی لیتے ہیں اور صرف شہر کی مذہبی صحت کی فکر میں سرگرداں رہتے ہیں۔ لاہور میں مجھے بتایا گیا کہ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے پروفیسر محمد عمرالدین صاحب کے بڑے نستعلیق صاحبزادے صلاح الدین محمود مدیر 'سویرا' لاہور ایک مسجد میں نماز پڑھ رہے تھے کہ ایک مولوی صاحب نے آکر ان کے پاجامے کو صرف اس لئے اوپر کھینچ دیا کہ پائنچے ان کے ٹخنوں پر آرہے تھے سنا ہے اس دن سے انھوں نے مسجد میں نماز پڑھنا ترک کر دیا۔ محمد حسن عسکری (جو اب مرحوم ہو چکے ہیں) ترقی پسندی کی مخالفت میں 'انحطاط پسندی' کے علم بردار ہوئے تھے مگر اب تصوف کے عملیات تک جا پہنچے تھے اور مولانا اشرف علی صاحب تھانوی مرحوم کے بہشتی زیور کو اردو کے اعلیٰ ترین ادبی اسلوب کا نمونہ سمجھنے اور سمجھانے میں مصروف تھے۔ یہ بھی سنا کہ وہ اس کتاب کا انگریزی ترجمہ بھی کر رہے تھے سنا ہے کہ 'پوری نظم آدھا آدمی' کے مصنف سلیم احمد کے ذہن پر حسن عسکری صاحب کے زیر اثر تصوف اور عملیات مستولی ہوئیں اور وہ مدتوں حالت جذب میں رہے۔ انتظار حسین بھی مذہب کے کوچے کی طرف گئے اور امام باڑوں کے علَم اور منتول مرادوں سے ہوتے ہوئے ان دنوں بدعت کے کوچے سے گزر رہے ہیں۔ غرض پاکستان کے دانش ور پر مذہبیت کی ایسی گرفت ہے کہ وہ 'آزاد خیالی' کو بھی مذہبی پیرائے میں اختیار کرنے کے لئے مجبور ہے البتہ پنجاب میں فیض صاحب نے اور کراچی میں سبطِ حسن اور شوکت صدیقی نے اس طوفان میں بھی آزاد خیالی کی روایت کی آبرو رکھی ہے مگر یہ لوگ استثنا ہیں۔ ممتاز حسین خاموش ہیں 'امیر خسرو' پر تحقیقی کارنامہ ان کے قلم سے وجود میں آیا مگر وہ مارکسی نقاد اب بجھ چکا ہے جو پاکستان میں علم و دانش کی نئی راہیں

روشن کر سکتا تھا۔

ـــــ کراچی کے ایک کنارے پر ڈرامے سے متعلق سرگرمیوں کا ایک مرکز البتہ انڈین پیپلز تھیٹر کے پرانے کارکن سنبھالے ہوئے ہیں۔ میرے لئے ڈراما گروپ کا ایک جلسہ بھی ہوا جس میں مشہور فلمی اداکارہ اور علی گڑھ میں تعلیم نسواں کے مشہور کارکن شیخ عبداللہ مرحوم کی صاحبزادی رینوکا دیوی سے پہلی اور ابراہیم جلیس مرحوم سے آخری ملاقات ہوئی۔ ہندوستان میں ڈراما اور اسٹیج کے ارتقا پر گفتگو ہوئی اور ڈراما گروپ نے اپنے ڈرامے "کاٹھ کی گڑیا" کا ریہرسل پیش کیا۔ ڈراما کیا تھا پاکستان میں علاقائی وفاداریوں کی کش مکش کی داستان تھا۔

ـــــ چار دوست روزگار کی تلاش میں روانہ ہوتے ہیں۔ رات ایک جنگل میں کاٹتے ہیں۔ ایک بڑھئی، دوسرا درزی، تیسرا سنار اور چوتھا پرہیزگار۔ چاروں پاکستان کے چاروں صوبوں کے رہنے والے ہیں۔ جنگل میں سب باری باری سے پہرا دیتے ہیں۔ بڑھئی وقت کاٹنے کے لئے لکڑی کی ایک گڑیا بناتا ہے درزی کے پہرہ دینے کی باری آتی ہے تو وہ اس گڑیا کو کپڑے پہناتا ہے سنار اسے زیوروں سے سجاتا ہے اور آخر میں سرحدی مولوی خدا سے دعا مانگ کر اس کاٹھ کی گڑیا میں جان ڈلوا دیتا ہے۔ صبح کو چاروں دوست اس عورت پر اپنا حق جتانے لگتے ہیں۔ جھگڑا نبٹانے کے لئے ایک مسافر کی مدد لی جاتی ہے وہ مسافر کہتا ہے کہ یہ تو دراصل اس کی کھوئی ہوئی بیوی ہے جس کی تلاش میں وہ مدت سے سرگرداں ہے اور جس کی خاطر اس نے اپنے گھربار، رفیق عزیز سب چھوڑ دیئے ہیں۔ آخر پانچوں بادشاہ کے پاس پہنچتے ہیں۔ بادشاہ فیصلہ دیتا ہے کہ یہ دوشیزہ دراصل اس کی کنیز ہے جسے ان پانچوں نے اغوا کر لیا ہے اغوا کے جرم میں پانچوں کو جیل بھیجدیا جاتا ہے اور عورت محل سرا میں داخل کر لی جاتی ہے۔ لیکن جیل میں پانچوں کو خیال آتا ہے کہ ان کے باہمی نفاق نے انھیں اس حال تک پہنچایا ہے وہ متحد ہو کر جیل کے دروازے کو توڑ ڈالتے ہیں اور ایک خوبصورت کورس پر ڈراما ختم ہوتا ہے۔ قدیم روایتی عوامی قصوں کا بڑا خلاقانہ اور فن کارانہ استعمال ہے اداکاری اور ڈرامائی پیش کش بھی جاندار تھی۔

میرے اعزاز میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا جلسہ تھا غالب لائبریری ناظم آباد کا بال بھرا ہوا تھا۔ معلوم

کہ ترقی پسند مصنفین کا یہ جلسہ کافی عرصہ بعد ہو رہا ہے۔ یوں بھی کراچی میں کرفیو چند روز پہلے ہی اٹھا تھا۔ سنا کہ میرے کراچی پہنچنے سے چند ماہ قبل ہی عصمت چغتائی صاحبہ آئی تھیں اور ان کا تاریخی خیر مقدم کیا گیا۔ جہاں گئیں لوگوں نے سر آنکھوں پر بٹھایا۔ انھوں نے کراچی کے جلسوں میں ایمرجنسی کی مدافعت کی اور اس وقت کی حکومت کو بہت کچھ سراہا۔ میں نے اپنی تقریر میں تصویر کا دوسرا رخ پیش کرنے کی کوشش کی۔ کراچی میں مہاجر آبادی بھٹو کی نادر شاہی سے سخت متنفر اور بیزار تھی اور ترقی پسند حلقوں میں بھٹو کے بارے میں کچھ اسی قسم کا الجھاؤ تھا جو ہندوستان میں ایمرجنسی تک اندرا جی کے بارے میں تھا۔ بھٹو نے سوشلزم کا نعرہ دیا اپنے کو اپنی پارٹی کا صدر نہیں ماؤ کی طرح چیرمین کہا، ماؤ کی طرح کوٹ پہنا، کسانوں اور مزدوروں کی بات کی اور سندھیوں کے علاقائی وفاداریوں سے اپیل کی مگر یہ بھی درست تھا کہ بھٹو نے سوشلزم کے نام پر پچھلا الیکشن جیت کر اپنے تمام سوشلسٹ ساتھیوں کو ایک ایک کر کے جیل میں ڈال دیا۔ ڈاکٹر مبشر حسین نے "پاکستان کی شاہ راہ" لکھی انھیں کابینہ سے نکال دیا گیا۔ معراج محمد خاں نے بھٹو کے دست راست کا کام دیا انھیں جیل میں ڈال دیا گیا۔ ٹریڈ یونین کی آزادی چھن گئی۔ ہڑتالیں ممنوع ہو گئیں۔ ٹریڈ یونین لیڈروں کو غبن وغیرہ الزامات میں گرفتار کر لیا گیا اور ہر مخالف جماعت پر عرصۂ حیات تنگ ہو گیا۔ کٹھ ملاؤں نے اس صورت حال کا فائدہ اٹھایا۔ سی آئی اے کا نام بھی لیا جاتا تھا کہ امریکی ڈالر کھلے عام فراہم کئے گئے۔ انتخابات میں بے ایمانی ہوئی تو لانڈھی کے مہاجر جن میں زیادہ تر مزدور ہیں پھر سر بکف ہوئے اور فوج سے ٹکرانے لگے۔ ہندوستان کے انتخابات کے نتائج نے اور بھی گہرا اثر چھوڑا اور بھٹو کے خلاف ہنگامہ زور پکڑنے لگا۔

اس سلسلے کا ایک لطیفہ یہ ہے کہ پریس کلب کراچی نے مجھے مدعو کیا۔ پریس کلب کے صدر برنا جو برلنے ترقی پسند صحافی ہیں صدارت کر رہے تھے۔ مجھے ایمرجنسی کے دوران ہندوستانی پریس کی صورت حال پر تقریر کرنی تھی۔ میں کوئی گھنٹہ بھر ایمرجنسی کے دوران تحریر و تقریر کی پابندیوں کا ذکر کرتا رہا۔ کس طرح ہر اخبار اندرا گاندھی اور سنجے گاندھی کی مدح سرائی پر مجبور تھا۔ کس طرح فیملی پلاننگ اور ایمرجنسی کی قصیدہ خوانی لازمی ہو گئی تھی، کس طرح اخبارات کے سرکاری اشتہار بند کئے جاتے تھے۔ کلدیپ نائر جیسے ایڈیٹروں کو جھکنے سے اختلاف رائے پر

گرفتار کیا جاتا تھا کس طرح مصنفوں اور دانش وروں کو جھوٹے مقدمات میں پھنسایا جاتا تھا۔ غرض ایک گھنٹے کی تقریر کے بعد پچھلی صف سے ایک صحافی کھڑے ہوئے انھوں نے کہا "ہم نے تو آپ سے ہندوستان کی صورت حال پر تقریر کرنے کی درخواست کی تھی۔ آپ تو ہمارے ہاں کا حال بیان کر رہے ہیں؟"

—— ہاں تو، ترقی پسند مصنفین کا جلسہ تھا۔ کراچی کے ادیبوں نے ابھی تک عصمت چغتائی۔۔۔ کی زبانی ایمرجنسی کی خیر و برکت ہی کا حال سنا تھا میں نے تصویر کا دوسرا رخ پیش کیا اور اس دوران ہندوستان میں ترقی پسند مصنفین کی کوتاہیوں کا بھی ذکر کیا۔ جلسہ ختم ہونے پر ایک اجنبی میرے پاس آئے اور مجھے ایک مخصوص نشست کے لئے مدعو کیا میں نے حامی بھر لی۔ چند روز بعد میں ان کے ساتھ چند ایسے لوگوں کے درمیان تھا جو پاکستان میں بائیں بازو کی سیاست سے عملی دل چسپی رکھتے تھے اور قید و بند کی شدید صعوبتوں کے باوجود 'زیر زمین' رہ کر کام کر رہے تھے۔ ان لوگوں میں ہندوستان کی نکسلی تحریک اور مارکسی پارٹی کی سرگرمیوں سے دل چسپی پائی جاتی تھی اور خود ان کی مزدور کسان پارٹی انہی خطوط پر کام کر رہی تھی۔ ان لوگوں سے مجھے ان کی پارٹی کا بلیٹن اور حسن ناصر کی شہادت' نامی کتاب بھی ملی جو پاکستان کے بارے میں بالکل نئی معلومات فراہم کرتی تھی۔

—— پنجاب مزدور کسان پارٹی کل پاکستان پارٹی ہے۔ اس کے سکریٹری امتیاز عالم نے ۱۳ اور ۱۴ ر نومبر ۱۹۷۶ء کی تیسری کانگریس منعقدہ دیوان صاحب ضلع دھاڑی میں جو رپورٹ پیش کی اس میں پاکستان کی معیشت کو گماشتہ سرمایہ داری کی معیشت قرار دیا گیا ہے اور پیپلز پارٹی کی قومیانے کی پالیسی کو سرمایہ دار طبقے کی حیثیت کمزور کر کے جاگیردار طبقے کی پوزیشن مضبوط کرنے کا وسیلہ بتایا گیا ہے اور پاکستان کے بڑھتے ہوئے فوجی اخراجات اور روز افزوں بیرونی قرضوں پر انحصار پر تشویش کا اظہار کیا گیا ہے۔

—— "پاکستان میں سامراجی، سوشل سامراجی اور ایرانی اور سعودی عرب کے مالیاتی سرمایہ کا عمل دخل بڑھ رہا ہے ملک میں بیرونی سرمایہ کاری کو اس حد تک تحفظ حاصل ہے کہ پاکستان کے سرمایہ دار بیرونی سامراجی سرمایہ داروں کے ساتھ ملے بغیر سرمایہ کاری نہیں کر سکتے۔"

"جن پسماندہ ممالک میں گماشتہ ریاستی سرمایہ کاری وجود میں آئی ہے وہاں سیاسی اقتدار پر ایک پارٹی کے اقتدار نے نوکر شاہی آمریت کی شکل اختیار کی ہے جس پر فوج و نوکر شاہی کے ارکان کو غلبہ حاصل ہے"

—— پاکستان کے بحران کے بارے میں رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ :

مشینری، مصنوعی کھاد، کرم کش ادویات کی بہت بڑی منڈی بن گیا ہے۔ زراعت میں سرمایہ کاری کے فروغ سے دیہی بورژوازی پیدا ہوئی ہے اور صنعتی اشیا، عیاشی کے سامان کاروں، ریفریجریٹروں، ایرکنڈیشنروں، ٹیلیویژن ریڈیو، موٹر سائیکلوں، اسلحہ، شراب، سرخی پاؤڈر، اعلیٰ کپڑے اور دوسرے سامان کی بڑی منڈی پیدا ہو گئی ہے۔ بین الاقوامی مالیاتی بحرانوں، صنعتی ملکوں کی اشیا اور تیل پیدا کرنے والے ملکوں کی قیمتوں میں اضافے کا بھرپور اثر براہ راست زراعت پر ہونے لگا ہے۔ زراعت میں سامراجی سرمایہ کاری کا جائزہ لینے کے لئے امریکہ کے سینیٹر بیل گورن نے گزشتہ سال پاکستان کا دورہ کیا تھا اور خوراک کی بین الاقوامی ضروریات کے پیش نظر اس خطے کو اہم گردانا تھا۔ موجودہ حکومت کو سعودی عرب، ایران، کویت اور متحدہ عرب امارت کی حکومت سے بھی زراعت میں بڑے پیمانے کی سرمایہ کاری کی امید تھی۔ ایران اور متحدہ عرب امارت نے کچھ علاقوں میں تھوڑی بہت سرمایہ کاری کی اسکیمیں بنائی بھی ہیں۔ لیکن ایسا بڑے پیمانے پر نہ ہو سکا کیونکہ اس سرمایہ کاری کے لئے سوڈان کو چن لیا گیا ہے۔

پیداواری قوتوں میں تبدیلی کے اس عمل سے پیداواری رشتے بھی بدل رہے ہیں۔ زراعت میں جہاں ابھی جاگیردار اور کسان طبقے کے درمیان تضاد کلیدی ہے، محنت اور سرمائے کے درمیان تضاد بھی بڑھ رہا ہے کھیت مزدور طبقہ بھی پیدا ہو رہا ہے لیکن زراعت میں چونکہ ابھی جاگیردارانہ طرز پیداوار بھی باقی ہے اور جاگیردارانہ طرز پیداوار کی جگہ زیادہ تر چھوٹے

پیمانے کی سرمایہ داری پیداوار ہے رہی ہے اس لئے محنت اور سرمائے کا تضاد واضح شکل اختیار کر نہیں پایا۔ کھیت مزدور طبقہ ہنوز نیم کسان اور نیم مزدور ہے۔ اسے زراعت میں مستقل پیداواری کام ابھی پورے طور پر میسر نہیں۔ لہذا یہ سیمی ٹل مزدور ہے جو شہر اور دیہات، اجرتی مزدوری اور مزارعت کے درمیان لٹک رہا ہے۔ دیہی دستکاری کے زوال سے دیہی دستکار طبقہ بھی ختم ہو رہا ہے۔ اس کی جگہ شہروں کے ورکشاپ اور زرعی مشینری کے میکینک لے رہے ہیں۔ بے دخل کسانوں اور دیوالیہ دستکاروں کی بڑی تعداد یا تو کھیت مزدور بن رہی ہے یا شہروں کا رخ کر رہی ہے جہاں ترقیاتی پروگراموں کے تعمیراتی کاموں اور کارخانے اور عام خدمت گزاری کے کاموں کے لئے سستی محنت مہیا ہو رہی ہے۔ اجرتی مزدوروں کے اژدہام میں اضافہ ہر سال چار لاکھ تیس ہزار کی تعداد میں ہو رہا ہے۔ بیرونی ملکوں میں ان کی خاصی تعداد کی برآمد کے باوجود بے روزگاروں کی فوج میں بڑے پیمانے پر اضافہ ہو رہا ہے کیونکہ صنعتی ترقی کی موجودہ رفتار اس بڑے اژدہام کو کسی صورت میں کھپانے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔

بڑے زرعی فارموں کے بڑھنے کے علاوہ زمین کی فروخت سے امیر کسان معیشت میں بہت پھیلاؤ آیا ہے۔ لیکن امیر کسان معیشت اب بحران کا شکار ہو رہی ہے کیونکہ اخراجات پیداوار تیزی سے بڑھ رہے ہیں جبکہ آمدنی میں اضافہ بہت کم ہو رہا ہے۔ زراعت میں چھوٹے پیمانے کی سرمایہ کاری رفتہ رفتہ گھاٹے کا سودا بن رہی ہے اور چھوٹے پیمانے کی زراعت بڑے پیمانے کی زراعت کے لئے جلد یا بدیر راستہ چھوڑنے پر مجبور ہوگی۔

—— زرعی پیداواری قوتوں اور پیداواری رشتوں میں اس کشمکش نے دیہی طبقاتی جدوجہد کو ایک نئے دور میں داخل کر دیا ہے .... اس سے یہ ضرور عیاں ہو گیا ہے کہ موجودہ حکومت کی زرعی اصلاحات کا مقصد کسان طبقہ کی فلاح و بہبود نہ تھا بلکہ جاگیردار طبقہ کو

نئے حالات کے مطابق دیہی بورژوازی میں بدلنا تھا۔ پیٹی بورژوازی کے جو لوگ زرعی اصلاحات کی دھنیں ہر جگہ الاپتے پھرتے تھے ان کا اپنا طبقاتی مفاد اسی میں تھا کہ زراعت میں جاگیردارانہ طرزِ پیداوار کی جگہ سرمایہ دارانہ طرزِ پیداوار لے اس کے لئے وہ کسان طبقہ کا جاگیرداری سے تضاد استعمال کرتے تھے تاکہ سرمایہ داری کو فروغ ملے اور اس کے باعث ان کے لئے ترقی کے مواقع بڑھیں آج ان عناصر کی بڑی تعداد سبز انقلاب کے سرمایہ دارانہ ثمرات سے بڑے پیمانے پر فیض یاب ہو رہی ہے۔ ان کے پیٹی بورژوا سوشلزم کا بھانڈا پھوٹ چکا ہے۔"

——— اور اس بحران سے نپٹنے کے لئے حکمران ٹولے نے جو ہتھکنڈے استعمال کئے ان کے بارے میں رپورٹ میں کہا گیا ہے :

——— حکمران ٹولے نے اصل بحران اور معاملات سے عوام کی توجہ ہٹانے اور طبقاتی جدوجہد کو کند کرنے کے لئے کسی طرح کے فروعی مسایل کو ہوا دی ہے پہلے "بنگلہ دیش کا مسئلہ کھڑا کیا گیا" دائیں بازو کی جماعتوں اور اسلامی جمعیت طلبہ نے بنگلہ دیش کو سفارتی سطح پر تسلیم کئے جانے کو نظریہ پاکستان کی اساس کے خلاف قرار دیا اور "بچہ بچہ کٹ مرے گا بنگلہ دیش نہیں بنے گا" جیسے نعروں سے پنجاب کے متوسط طبقے اور بالخصوص طلبہ کو اس تحریک میں متحرک کیا۔ بائیں بازو کی بعض پیٹی بورژوا تنظیمیں بھی اس میں شامل ہو گئیں۔ دائیں بازو والے ہوں یا نعرے باز بائیں بازو کے چند پیٹی بورژوا گروہ اس تحریک کے پیچھے پنجاب کے متوسط طبقے کا رجعت پسندانہ عمل تھا، جو مشرقی پاکستان کی مارکیٹ کے چھن جانے سے پیدا ہوا تھا۔ لیکن جب اسلامی کانفرنس کے وقت تیل کی دولت سے مالا مال شاہوں کے مشورے سے بنگلہ دیش کو سفارتی طور پر تسلیم کرنے کا فیصلہ ہوا تو انھیں سانپ سونگھ گیا کیونکہ انھیں مشرق وسطیٰ سے تجارتی تعلقات، نوکریوں اور سرمایہ کاری درآمد کے سبز باغ نظر آنے لگے

——— "اسلامی کانفرنس کے کچھ عرصے بعد مسئلہ قادیانیت اٹھ کھڑا ہوا۔ فرقہ پرست جماعتوں نے مجلس تحفظ ختم نبوت تشکیل دی جس نے چار نکاتی پروگرام پیش کیا جس میں قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینا، انھیں اہم اسامیوں سے ہٹانا اور ربوہ کو کھلا شہر قرار دینا شامل تھا۔ اس تحریک کے پیچھے پنجاب کے تاجر طبقے اور نوکر شاہی کے مفادات چھپے ہوئے تھے۔ حکومت نے نہایت چالاکی سے اس تحریک کو طول دیا تاکہ بلوچی عوام کی قومی جدوجہد محنت کشوں کی طبقاتی جدوجہدوں اور

اصل مسائل سے لوگوں کی توجہ ہٹائی جا سکے۔ اور شاونزم کو بھی عوام دشمن سیاست کے لئے استعمال کر سکے۔ ذخیرہ اندوزوں نے اس کی آڑ میں خوب دام بڑھائے اور حکومت نے بلوچستان میں فوج کشی کو تیز کیا اور محنت کشوں کی جدوجہد کے خلاف بہت سے اقدامات کئے۔ دائیں بازو کی تمام جماعتوں بشمول نیپ نے اس مجلس ختم نبوت کا ساتھ دیا۔

—— قومیتوں کے سوال پر بھی حکومت نے مسلسل پنجاب میں شاونسٹ خیالات کو ہوا دی اور بار بار بلوچستان اور سرحد میں بغاوت، علیحدگی پسندوں اور بیرونی ایجنٹوں کے شوشے استعمال کئے ہیں تاکہ حکومت بلوچ قومیت اور دوسری قومیتوں کے خلاف جبر و تشدد اور موت و بربادی کی عوام دشمن کارروائیوں میں یہاں کے عوام کو گمراہ کرے اور اندھی فوج کشی کا جواز پیدا کر سکے۔

—— اس صورت حال سے نبٹنے کے لئے کسان مزدور پارٹی نے عوام کو بیدار کرنے کا پروگرام بھی بنایا اور انقلابی جدوجہد میں قربانیاں بھی دیں جس کا ذکر ان صفحات میں بار بار ملتا ہے۔ پنجاب میں چشتیاں، بہاولپور، میاں والی، صادق آباد، رحیم یار خاں اور لودھراں میں زبردست جدوجہد ہوئی۔ کسان رہنما شہید کئے گئے پھر جمال دین والی اور صادق آباد میں یہی جدوجہد جاری رہی۔ مزدور بھی اس سخت جدوجہد سے گزرے اور ان کی صفوں میں بھی قربانیوں کا یہی سلسلہ جاری ہے۔ متعدد جاگیرداروں نے اپنے نجی قید خانے اور سخت صعوبتیں اور اذیتیں پہنچانے کے بلاخانے بنا رکھے ہیں ایک بار ان کے ہاتھ پڑ جانے کے بعد زندہ واپس آنا مشکل ہے یہی حال پولیس اور فوج کے ظلم و ستم کا ہے جس کی ایک مثال حسن ناصر کی شہادت ہے اس شہادت پر جو کتاب شائع ہوئی ہے اس کا ایک حصہ اس رسالے میں نظر سے گزرے گا۔

—— اسی لئے اس تحریک کے ذمہ داروں نے اپنے کو شہروں سے دور رکھا ہے اور جہاں تک ہو سکا ہے اسے دور افتادہ علاقوں میں پھیلایا ہے تاکہ وہ غیر ضروری پبلسٹی سے محفوظ رہیں اور درمیانہ طبقے کی جذباتیت اور آئینی اصلاحات کے فریب سے دور رہ سکیں اور صحیح انقلابی جذبے کے ساتھ کسانوں اور مزدوروں میں کام کر سکیں۔ زیادہ تر ان کا یہ کام قانون کی نظروں سے دور رہ کر ہوتا ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ سرحد اور بلوچستان میں مساجد اس تحریک کا مرکز بن گئی ہیں۔

—— بہرحال اس مختصر سی جھلک سے اندازہ ہوگا کہ پاکستان نے اپنے لئے مغربی ایشیا کے

سلم ممالک کا راستہ ہی چنا ہے ایک طرف دولت کی افراط ہے غیر ملکی زر مبادلے کی بہتات ہے آرام دہ زندگی کی چمک دمک ہے اور دوسری طرف پیوند لگے عوام ہیں جو مفلسی اور بھوک سے نڈھال ہیں جن کے لئے آئینی راستے ایک ایک کرکے مسدود ہوتے جا رہے ہیں۔

—— اسی پس منظر[لے] میں پاکستان کے ان مرفہ الحال گھرانوں پر نظر کرنی چاہیئے جہاں بیرونی ممالک سے درآمد کیا ہوا سامان پٹا پڑا ہے ہر چیز چمکدار ہے ہر شے پر دولت کا نور اور نمایش کا نشہ ہے۔ وی سی آر گھر گھر ہیں اور محلے کا محلے رات گئے عرب ممالک کے ذریعے خریدے ہوئے رنگین ٹیلی ویژن اور وی سی آر پر ہندوستان سے چوری چھپے خریدے ہوئے فلم دیکھتا ہے ہر تماشائی کبھی کبھی دس دس روپے ٹکٹ دے کر دو دو تین تین فلم دیکھتا ہے اور پولیس کے چھاپے کا خطرہ مول لے کر بھی اس تفریحی مشغلے سے لطف اندوز ہونا پسند کرتا ہے اور دور سڑکوں، گلیوں چوراہوں کھیت کی مینڈھوں اور گندی بستیوں میں تبدیلی کی بے پناہ خواہش انگڑائیاں لیتی ہے یہی وہ خواہش ہے کہ ادب میں بھی کبھی بیگانگی کے احساس میں ڈھل کر سامنے آتی ہے تو کبھی سماجی احتجاج کی آواز بن جاتی ہے۔ مگر اتنا ضرور ہے کہ پاکستان کی اس زیریں لہر کی موجودگی کی شہادت واضح طور پر ملتی ہے جس کی خبر باہر کی دنیا کو نہیں ہے۔

لے اس موقع پر شاید پنجاب مزدور کسان پارٹی کی رپورٹ کے اس حصے کا مطالعہ مفید ہوگا جو ثقافتی امور سے متعلق ہے:

" اس عرصے میں پنجاب میں پنجابی ادبی ثقافتی تحریکوں اور انجمنوں میں خاصا اضافہ ہوا ہے پنجابی ادبی لٹریچر، لوک جدوجہد کی تاریخ سے آگاہی اور عظیم ثقافتی ورثہ کے احیا کے لئے دانشوروں کی کاوشوں میں گوناگوں اضافہ ہوا ہے جس سے قومی ثقافتی دوئی میں کمی واقع ہوئی ہے۔ اس ثقافتی تحریک میں دو طرح کے رجحانات پیدا ہوتے ہیں۔ اول ماضی پرستی کا رجحان ہے۔ اس رجحان کے شکار دانش ور ماضی کو حال کی ٹھوس حقیقتوں اور مستقبل کے تقاضوں سے جوڑنے کی بجائے ماضی کو خود پر مسلط کر لیتے ہیں۔ "جڑوں کی بازیافت" کا مقصد تاریخی عمل کے تسلسل کو جوڑنا اور قائم رکھنا ہے جو نوآبادیاتی اور جدید نوآبادیاتی غلبے کے باعث جاری نہ رہ سکا اور نگاہشت و خاخت ہی ثقافت تلے دب گیا۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

—— کراچی کی یادیں ہی تو نہیں تھیں ایک ایسے ملک کی یادیں تھیں جہاں شناسا چہرے بستے ہیں جہاں دوست، احباب، عزیز اقربا ہیں جہاں اردو دوست اور اردو نواز رہتے ہیں گو اردو کو پاکستان میں وہ سرکاری مرتبہ نہیں ملا جس کا دعویٰ کیا گیا تھا اور انگریزی سرکاری دربار میں ہر جگہ جاری وساری ہے مگر اردو کو کوئی فوری خطرہ لاحق نہیں ہے۔ یہ بات وجہ تسکین ہے کہ عام پڑھا لکھا آدمی خواہ مقتدر ہو یا اتنا مقتدر نہ ہو اردو اخبار پڑھتا ہے انگریزی کے اخبارات محض کبھی کبھار کی تفریح ہیں ان میں نہ وہ خبروں کا معیار ہوتا ہے دان کی وہ رسائی اور پہنچ ہے جو 'نوائے وقت' اور 'جنگ' کی ہے۔ کالم نویسی عام ہے بلکہ ادب پر چھائی ہوئی ہے۔ ہر اچھا ادیب کالم نویس ہے اور اس میں انوکھے رنگ ڈھنگ پیدا کرتا ہے۔

حاشیہ گزشتہ سے آگے میڈشاونسٹ رجحان ہے۔ اس رجحان کا شکار حلقے لسانی و ثقافتی سوال کو طبقاتی نقطہ نظر یعنی جدلیاتی نقطہ نظر سے دیکھنے کی بجائے سمجھتے ہیں کہ ثقافت طبقاتی سیاسی ومعاشی ڈھانچے سے علیحدہ کوئی غیر طبقاتی چیز ہے۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ ہر طبقاتی سماج میں ثقافت اور رسم ورواج پر حکمران طبقوں کی چھاپ لگی ہوتی ہے لیکن اس کے علاوہ مظلوم طبقوں کی اپنی لوک ثقافت بھی علیحدہ پنپ رہی ہوتی ہے۔ اور جس کی ترقی کو طرح طرح سے کچلا اور پامال کیا جاتا ہے۔ ظالم طبقوں کی ثقافت اور مظلوم طبقوں کی جمہوری ثقافت میں فرق نہ کرنا ہی شاونیزم ہے۔ ثقافت کے بارے میں صحیح نقطہ نظر عوامی، جمہوری ثقافتی نقطہ نظر ہے۔ یہ ثقافت لازمی طور پر سامراج دشمن اور جاگیردار دشمن ہوگی۔ ایک طرف نئی ثقافتی تحریک کو گماشتہ ثقافت اور دوسری طرف جاگیردارانہ خانقاہی ثقافت کے خلاف نبرد آزما ہونا ہوگا اور پرانی ثقافتی ریت کو نئے عوامی جمہوری معنی پہنانے ہوں گے۔ ایک بالادست قوم کی ثقافتی تحریک ہونے کے ناطے سے اسے لازماً دوسری قومیتوں کی ثقافت وزبان کا احترام کرنا ہوگا اور ان کے فروغ کے لئے معاون قوت کے طور پر کام کرنا ہوگا۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم دوسری قومیتوں کے ثقافتی ورثہ، قومی ہیروؤں اور ادبی وثقافتی نمایندوں کا احترام کریں اور پنجابی عوام کو ان سے آگاہ کریں۔

حکمران جماعت پنجاب کے جاگیردار اور ادنیٰ متوسط طبقے کے رجعت پسند حلقے بھی آج کل پنجابی ثقافتی تحریک کو فرسودہ طریقے سے سبوتاژ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

—— اردو پریس بڑا موثر بھی ہے اور باقاعدہ بھی۔ گو اب بھی اس کی طباعت میں بہتر کی گنجائشیں ہیں مگر جنگ، مساوات، حریت، نصرت کے علاوہ سیارہ، اخبار خواتین، فانوس، اور نہ جانے کتنے اور کیسے کیسے اخبارات اور ہفتہ وار شائع ہوتے ہیں اور تین تین روپے فی شمارہ قیمت ہونے

حاشیہ گزشتہ سے آگے:۔ ایک طرف تو دانش وروں کی بڑی کھیپ ہے جنھیں ریڈیو، ٹی وی اور دوسرے ثقافتی اداروں کے ذریعہ بدراہ کیا گیا ہے اور دوسری طرف فروعی مسئلوں کو ہوا دی گئی ہے۔ اس کی ایک واضح مثال سرائیکی کا مسئلہ ہے۔ پنجاب کے مغربی حصہ میں دریاؤں کے ساتھ ساتھ سرائیکی یا لہندی جو پنجابی کی حقیقی اور قدیم شکل ہے بولی جاتی ہے۔ اسے کو بنیاد بنا کر بعض موقعہ پرستوں نے جاگیرداروں کے ایما پر اس مسئلہ کو قومی مسئلہ بنانے کی کوشش کی ہے۔ حالانکہ مغربی پنجاب کے لوگ نہ تو علیحدہ زبان و ثقافت، تاریخی ورثہ و مشترکہ نفسیات نہ علیحدہ علاقہ اور نہ منڈی رکھتے ہیں۔ اگر قومیت کی اسی طرح سے تعریف کی گئی تو پاکستان میں قومی سوال کو ختم کرنے کا اس سے بہترین راستہ حکمراں طبقہ کے پاس اور کوئی نہ ہوگا۔ حکومت کا مقصد بھی دراصل یہی ہے کہ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ سرائیکی بھی قومیت ہیں تو پھر سندھیوں، بلوچوں اور پشتونوں کو کئی کئی قومیتوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اور اگر یہ بنیاد بن جائے تو پھر مظلوم قومیتوں کی قومی ایکتا کو تباہ کیا جا سکے گا۔ اردو لسانی گروہ کے خواص اور سندھی وڈیروں کے ایک حصہ نے بھی سرائیکی مسئلہ کو ہوا دی ہے۔ اردو لسانی گروہ کا مقصد خود سندھیوں کو سندھ میں اقلیت میں بدلنا ہے اور سندھی وڈیروں کا مقصد پنجاب کے مقابلے میں اپنی پوزیشن کو مستحکم کرنا ہے۔ بعض مظلوم قومیتوں کے حلقے بھی سرائیکی مسئلہ پر غلط پوزیشن اختیار کر لیتے ہیں۔ اس سے بظاہر ان کا مقصد پنجاب کی بالادستی کو کمزور کرنا ہوتا ہے لیکن اس سے الٹا پنجاب کے بالادست شاونسٹ مفادات کو تقویت ملتی ہے۔ پنجاب کی بڑی قومی بالادست حیثیت یہاں کے عوامی جمہوری طبقوں کی طبقاتی جدوجہد کے ساتھ متحد ہو کر ختم کی جا سکتی ہے۔ لیکن اس مسئلہ کو ایک اور طریقے سے بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ وہ ایک ہی قوم کے اندر طبقاتی و علاقائی ناہمواری ہے۔ مغربی پنجاب کے علاقے جاگیردارانہ تسلط میں ہیں اور وسطی پنجاب کی نوکر شاہی اور سرمایہ داری کے ہاتھوں لوٹ کا شکار ہیں۔ اس تضاد کو حل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ مغربی پنجاب کی پس ماندگی و لوٹ کے خلاف لڑا جائے اور اس کی ترقی و تبدیلی کے لئے جدوجہد کی جائے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ وسطی پنجاب کے محنت کش طبقوں اور پیٹی بورژوازی کی طبقاتی و قومی جدوجہد کو مغربی پنجاب کے مزدوروں، کسانوں اور متوسط طبقوں کی جمہوری جدوجہد سے جوڑا جائے۔ ثقافتی اور لسانی طور پر مغربی پنجاب کی لوک ثقافت اور لہندی کو اختیار کیا جائے۔

پارٹی کو پنجاب میں عوامی جمہوری ثقافت، پنجاب کی لوک تاریخ، پنجابی زبان و ادب کی ترقی پسند جدوجہد میں بھرپور شرکت کرنی چاہیئے۔ اس عرصہ میں پارٹی نے عوامی جمہوری ثقافت کو جو بنیادی طور پر کسان ثقافت ہے، فروغ دینے کے لئے ثقافتی و ادبی کام کا جگہ جگہ آغاز کیا ہے۔ (باقی اگلے صفحے پر)

کے باوجود ہزاروں کی تعداد میں فروخت ہوتے ہیں۔ پھر رسالہ سب رنگ ہے جس کی قیمت چھ روپے فی شمارہ ہے اور خود اس کے اپنے دعوے کے مطابق ڈیڑھ لاکھ چھپتا ہے۔ اس کے افسانے شوق سے پڑھے جاتے ہیں اور شکیل عادل زادہ کے چٹخارے دار اسلوب میں اداریہ، بازی گر اور دیگر مستقل عنوانات ہاتھوں ہاتھ لئے جاتے ہیں۔ یہ صادقین جیسے مصوروں، لطف اللہ خاں جیسے ادب نوازوں و جمیل جالبی ذوالفقار مصطفےٰ، مشفق خواجہ، محمد علی صدیقی، شبنم رومانی، سبطِ اختر اور حسن عابد جیسے دوستوں کا شہرہے حسن کی آنکھوں میں عظیم آدرشوں کی جھلکیاں اب بھی رقص کرتی ہیں ان محبتوں کا ذکر کیوں کر ہو جو ان سے اور دوسرے ان گنت احباب سے ملیں شاید کوئی وقت ایسا ہو کہ جب پذیرائی کرنے والے احباب کا مجمع نہ ہو۔ کوئی شام اور کوئی صبح ایسی نہیں گزری جب کہیں نہ کہیں مدعو نہ کیا گیا ہو۔ میرے وطن مرادآباد کے دوست، بچھڑے ہوئے ساتھی، سبھی نے خلوص کے خزانے لٹا دئے۔

—— کراچی سے لاہور پہنچا زمانہ وہ تھا جب جنرل ضیاء الحق بھٹو کو معزول کر کے نظم و نسق سنبھال چکے تھے مارشل لاء لگ چکا تھا اور جلسوں اور ادبی اجتماعات تک پر پابندی تھی لہٰذا کراچی کی طرح استقبالیہ جلسوں کا وہ سلسلہ یہاں نہیں تھا البتہ پاک ٹی ہاؤس میں کہ نوجوان ادیبوں کا اڈہ ہے انور سجاد، انتظار حسین، شہرت بخاری، طارق زیدی اور بعض دوسرے ادیب مل بیٹھے اور دیر تک تبادلۂ خیالات ہوتا رہا۔ زیادہ تر میں ہی بولتا رہا۔ ٹی ہاؤس ایک مدت تک حلقۂ ارباب ذوق کی جولاں گہہ رہا ہے اور 'حلقے' میں ایک عنصر کمیونسٹ دشمنی کا بھی رہا ہے۔ وہ گفتگو میں زیریں لہر کے طور پر ہے، جو ادیب حلقے سے 'نیو لفٹ' تک پہنچے ہیں یا کسی قسم کے پروٹسٹ کے قایل ہوئے ہیں ان میں بھی یہ عنصر کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے۔

حاشیہ گزشتہ سے آگے ہے۔ ہماری ثقافتی و ادبی تحریک شکل میں لوک ہوگی اور جوہر میں انقلابی ہوگی۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم پنجاب بھر میں عوامی ثقافتی و ادبی انجمنوں کو فروغ دیں۔ پنجابی انقلابی ادب، شاعری، گیتوں، ڈراموں اور فنون لطیفہ کو فروغ دیں۔ پنجاب کی قدیم ثقافتی روایات، لوک تاریخ اور رسم و رواج کو نئے عوامی جمہوری قالب میں ڈھالیں تاکہ پرانی ثقافت کے بطن سے نئی جمہوری ثقافت جنم لے سکے جو گماشتہ اور خانقاہی اثرات سے آزاد ہو۔ اس تحریک میں یہ سوال بنیادی سوال ہے کہ ادب و ثقافت کس کے لئے؟ ہمارا جواب ہے عوامی جمہوری طبقوں کے لئے۔

—— لاہور کراچی سے کہیں زیادہ پاکستان کا ثقافتی، خاص طور پر ادبی مرکز ہے۔ وجہ یہ ہے کہ لاہور جاتا ہوا شہر تھا اور اس کی تہذیبی اور ادبی انفرادیت تقسیم سے اور زیادہ ابھری، نکھری ضرور کراچی کی طرح پھیلی اور بکھری نہیں۔ مہاجر یہاں کم ہیں جو ہیں وہ یہیں کے رنگ میں رنگ گئے ہیں۔ اردو ادیبوں، رسالوں اور ادبی حلقوں کی پرانی روایت رہی ہے اور اب بھی قائم ہے۔

—— لاہور کا ادب اپنی پہچان کی تلاش میں ہے۔ وہ پہچان پاکستانی ہو یا پنجابی ہو یا جدید یورپی فکر سے مطابقت پیدا کی جائے۔ ایک پرانی ٹولی ایسی بھی ہے جو اس پہچان کے انقلابی ہونے ہی پر اصرار کرتی ہے گو بظاہر انقلاب کے کہیں آثار نہیں ہیں۔ فیض کا رجزیہ آہنگ اس کی مثال ہے۔ ؎

مقابل صف اعدا ہوئی تھی جو آغاز — وہ جنگ اپنے ہی دل میں تمام ہوتی رہی

—— ان چاروں قبیلوں کی نمائندگی ادیبوں میں موجود ہے۔ پاکستان کو اپنی پہچان بنانے والے کبھی پاکستانیت پر بہت زور دیتے ہیں جس سے ان کی مراد کبھی اسلامی کلچر ہوتا ہے کبھی ہندوستان میں پلنے بڑھنے والے مشترکہ ہند ایرانی معاشرت۔ اس کی نمائندگی انتظار حسین کے افسانوں میں ہوتی ہے جو ان 'روحانی' جڑوں کی تلاش میں اجمل خاں کی دلّی سے ہوتے ہوئے مہاتما بدھ کے دور تک چلے آئے ہیں (اجمل خاں کی دلّی پر ان کی کتاب بالاقساط 'سویرا' میں شائع ہو رہی ہے) پنجابی کلچر میں اپنی پہچان ظفر اقبال اور شیر محمد افضل اور اشفاق احمد ڈھونڈھ رہے ہیں۔ احمد ندیم قاسمی میں بھی یہ رجحان ہے گو اتنا واضح نہیں۔ تیسرے مغربی فکر میں اپنی شناخت ڈھونڈھنے والے ہیں جو وزیر آغا اور ان کے گروہ سے پہچانے جا سکتے ہیں۔

ان رجحانات سے پاکستان کے اردو ادب سے رنگ و آہنگ اور سمت و رفتار کا اندازہ ضرور لگایا جا سکتا ہے۔

—— 'سویرا' کا تازہ ترین شمارہ صلاح الدین محمود نے ازراہ عنایت جائے قیام پر آکر عنایت کیا۔ صلاح الدین محمود بڑے نستعلیق اور مہذب انسان ہیں۔ وہ سلیقہ جو 'سویرا' سے ٹپکتا ہے ان کی ذات کا حصہ بھی ہے۔ میں نے اسے پڑھا تو اسلامی تصوف اور ماؤ کی اشتراکی وابستگیوں میں بٹا ہوا پایا۔ آیات قرآنی کے اردو ترجمے سے شروع ہونے والے اس شمارے کا پہلا مضمون

ہی ماؤ بوسے اور لکھنے والے ہیں اشفاق حسین، جنھیں مضمون کے خاتمے پر ماؤ کی تعلیمات میں اپنے مرشد ولادہ تصوف کے فرمودات کی جھلک نظر آنے لگتی ہے۔ (مجھے بتایا گیا کہ پاکستان میں کٹر سے کٹر مولوی یا جماعت اسلامی کے انتہائی تنگ نظر کارکن کی بھی یہ مجال نہیں ہے کہ وہ کھلے عام ماؤ پر تنقید کر سکے یا چینی کمیونسٹوں کی مذمت کرے۔ روس کا معاملہ البتہ جدا گانہ ہے۔ روسی سفارت خانے کے استقبالیوں میں اہل ادب اور دانش ور بھی جاتے ہوئے گھبراتے ہیں کہ پاکستانی سی آئی ڈی ان کا پیچھا کر رہی ہو۔ اس ضمن میں فیض صاحب کا استثنا ہے کہ ان کے تعلقات روس سے بھی شگفتہ ہیں ایک لطیفہ مشہور ہے کہ ایک بار افواہ گرم ہوئی کہ فیض صاحب کو روس میں پاکستان کا سفیر مقرر کیا جانے والا ہے۔ اس پر کسی نے تبصرہ کیا کہ روس والوں نے پاکستانی حکومت کو لکھا ہے کہ ہم تو انھیں پاکستان میں روس کا سفیر پہلے ہی سے مقرر کر چکے ہیں۔)

—— 'سویرا' کا دوسرا طویل مقالہ جیلانی کامران کا مقالہ اسلامی تصوف سے متعلق ہے۔ یہی ماؤ اسلامی تصوف۔ اور مسلم کلچر۔ والی تکون 'سویرا' ہی میں نہیں پاکستان کے اردو ادب میں بہت واضح ہے۔

—— لاہور میں فیض صاحب سے دو یادگار ملاقاتیں ہوئیں۔ یوں تو باتیں ادبی، تہذیبی سبھی قسم کی تھی لیکن راول پنڈی سازش کیس کے بارے میں ان سے براہ راست گفتگو بہت دل چسپ تھی میں نے پوچھا "کیا آپ لوگ واقعی حکومت کی تبدیلی کا کوئی منصوبہ بنا رہے تھے ؟"

—— فیض صاحب نے حسب معمول بڑی آہستگی اور نرمی سے کہا "نہیں بھئی! قصہ یہ تھا کہ بیگم ممتاز بھٹو کی معرفت میری ملاقات جنرل اکبر خاں سے تھی میں ان کے ساتھ فوج میں بھی رہ چکا تھا۔ جب یہ انگلستان سے اپنی تازہ فوجی تربیت مکمل کر کے لوٹے تو فیض سے ملے اور انھوں نے ذکر کیا کہ ملک کے سیاسی حالات بہت خراب ہو چکے ہیں اور ضرورت ہے کہ حالات کے بہت زیادہ بگڑنے سے پہلے ملک میں باقاعدہ انتخابات ہوں اور وسیع بنیادوں پر ایک جمہوری مخلوط حکومت قایم ہو اس کے لئے فوجی کارروائی کرنا اور فوجی کارروائی کے لئے بعض اہم فوجی افسروں کو ہموار کرنا ضروری ہے۔" فیض نے ان کے اس منصوبے میں شرکت سے معذوری ظاہر کی لیکن اکبر خاں نے دوسری ملاقات کی اور دوسری ملاقات میں بھی اس کا ذکر کیا۔ فیض نے اس دوسری ملاقات کا تذکرہ سجاد ظہیر سے کیا جو اس زمانے میں پاکستان کی کمیونسٹ پارٹی کے سکریٹری تھے

یہ دونوں جاکر راولپنڈی میں اکبر خاں اور ان کے ساتھیوں سے ملے۔ اور تفصیلی گفتگو کے بعد یہ طے پایا کہ اس قسم کی فوجی کارروائی مناسب نہیں۔ یہی متفقہ فیصلہ ہوا مگر حاشیہ نشینوں نے اس ملاقات کی خبر نمک مرچ لگا کر وزیر اعظم تک پہنچادی اور یہ لوگ گرفتار کر لئے گئے۔ راولپنڈی سازش مقدمہ چلایا گیا جس میں پرانے قانون کے مطابق صرف اتنا ہی ثابت کرنا ضروری تھا کہ حکومت کے خلاف بعض لوگوں نے آپس میں باتیں کیں ان باتوں پر عملدرآمد یا کسی قسم کی کارروائی ضروری نہیں تھی لہٰذا سزا ہو گئی۔" فیض کے اس شعر کا یہی پس منظر ہے۔ ؎

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہیں　　　وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے

—— فیض نے اس ملاقات میں اپنی ایک غزل

کبھی حیات کبھی مے حرام ہوتی رہی

—— اور ایک نظم "اب پاؤں کے دھبے دھو ڈالو" سنائی۔

—— یہ دونوں ملاقاتیں فیض کے مکان واقع ماڈل ٹاؤن لاہور کے ڈرائنگ روم میں ہوئی فیض کا چہرہ سرخ تھا آنکھیں اُبلی ہوئی تھیں۔ گہرا گلابی رنگ کا بش شرٹ پہنے ہوئے تھے۔ ڈرائنگ روم کسی میوزیم کا ڈرائنگ روم لگتا تھا جس میں ملک ملک کی تہذیبوں کے نمونے، ڈرامے کے نقاب اور سنگیت اور آرٹ کے مختلف یادگار سوغاتیں یکجا تھیں۔ باہر چھوٹا سا ہرا بھرا لان مسز ایلس فیض کی خوش وقتی کا اظہار کر رہا تھا۔ دونوں بار مسز ایلس فیض سے بھی ملاقات ہوئی۔ وہ دہلی کے قیام کے دن ذکر کرتی رہیں جب فیض فوج میں تھے اور سول لائنز کے قریب کہیں رہتے تھے۔

—— اردو صاف بولتی ہیں۔ لباس میں شلوار اور کُرتا زیب تن تھا اپنی شادی کا ذکر کرتی رہیں ان کا نکاح شیخ محمد عبداللہ وزیر اعلیٰ جموں و کشمیر نے سری نگر میں پڑھایا تھا اور جس بس کو کرایے پہ لے کر یہ لوگ سری نگر سے لاہور آئے اس میں جوش ملیح آبادی اور اسرار الحق مجاز بھی شامل تھے۔ لاہور میں دعوت ولیمہ کا انتظام ڈاکٹر محمد دین تاثیر نے کیا جو فیض کے ہم زلف بھی تھے۔

—— لاہور میں جن اور احباب سے ملاقات ہوئی، وہ تھے احمد ندیم قاسمی، عبادت بریلوی، راؤ حمید قریشی اور صفدر حسین۔

—— سبا میں لطیفے بیان کے جا[illegible] شادی کی محفلوں میں اکثر بڑے ملیح انداز میں تعنیف کرتے ہیں مثلاً

—— ایوب خاں کے زمانے کے لطیفے یہ تھے کہ کشمیر کے قضیئے کا تصفیہ ہو گیا ہے کہ کشمیر کا علاقہ ہند کو دے دیا گیا ہے کشمیری پاکستان کو۔

لوح پر لفظ تھا کہ ڈھاکے کی گرمی لاہور میں آکر کم ہو گئی ہے یا بنگلہ دیش کے بعد کا یہ جملہ۔

قائداعظم کا آدھا احسان اُتار دیا ہے باقی آدھا بھی اُتار دیں گے۔

—— ایوب خاں ایک بار فلم دیکھنے گئے کمبل اوڑھ کر آگے والی صف میں جا بیٹھے پہلے قائداعظم کی تصویر دکھائی گئی۔ چند لوگوں نے تالی بجائی، پھر اقبال کی تصویر دکھائی گئی کچھ لوگوں نے تالیاں بجائیں پھر ایوب خاں کی تصویر دکھائی گئی سب لوگوں نے دیر تک تالیاں بجائیں۔ یہ بہت خوش ہوئے برابر بیٹھے ہوئے تماشائی نے کہا حضرات مزادے، تالی بجاتے نہیں تو فوجی پکڑ لے جائیں گے۔

—— ایک صاحب کا جملہ سنا کہ پاکستانی قوم اصحاب کہف کی طرح ہے جس کی جب بھی آنکھ کھلتی ہے نئے مارشل لا میں کھلتی ہے (بیج ایم آر کیانی)

—— بھٹو پر لطیفہ تھا کہ اندرا گاندھی نے کشمیر کا علاقہ اس شرط پر پاکستان کے حوالے کر دینا مان لیا ہے کہ بھٹو اپنا الیکشن کمیشن ہندوستان کو دے دیں۔

—— ایوب خاں کے دور کا لطیفہ یہ تھا کہ مرنے کے بعد کسی پاکستانی سے منکر نکیر نے سوال کیا کہ تمہارا پیغمبر کون؟ جواب ملا "ایوب خاں"۔ کتاب کونسی ہے؟ جواب ملا FRIENDS, NOT MASTERS فرشتے اسے جستہ جستہ خدا کے حضور لے گئے کہ یہ نئے پیغمبر کا نام لیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو تخت نشین دیکھا تو مردہ بولا "ہم تو سمجھے تھے کہیں یہ فرشتے ایوب خاں کے جاسوس نہ ہوں۔"

—— قدرت اللہ شہاب کی داستان یہ تھی کہ یحییٰ خاں نے مارشل لا کے نفاذ کے بعد ایک مشاورتی جلسہ بلایا۔ اس میں سب لوگوں سے نئے مسائل پر اظہار خیال کے لئے کہا گیا۔ انھوں نے کہا کہ صرف مارشل لا کا نفاذ کافی نہیں ہے لوگوں کی ذہنی تربیت ضروری ہے اور ان میں اندرونی طور پر ضبط و نظم کا احساس پیدا کرنا ہوگا۔ باتیں یحییٰ خاں کو ناگوار گزریں اور انھوں نے اپنے ساتھی سے کہا کہ "یہ کون بندہ ہے اس سے کہو چپ کرے"۔ اس کے بعد ناگواری سے کہا چلو اب کھانا کھاؤ۔ سب لوگ اٹھ کھڑے ہوئے۔ بات رفت گزشت نہیں ہوئی شہاب نے ملک سے نکل بھاگنے کی کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوئی۔ یہ U.N.E.S.C.O. یا یونسکو کی کسی کمیٹی کے ممبر

تھے اس کا جلسہ ہونے والا ہوا تو دعوت نامہ آیا۔ حکومت نے جانے کی اجازت نہیں دی۔ انھوں نے یحییٰ خاں کے کسی دوست کے ذریعے کہلوایا کہ میں نہ گیا تو کوئی دوسرا تو میری جگہ پاکستان سے نہیں جا سکے گا کیونکہ میں ہی اس کمیٹی کا منتخب شدہ صدر ہوں نتیجہ یہ ہوگا کہ کمیٹی میں پاکستان بے آواز رہ جائے گا مجھے جانے دیں۔ یحییٰ خاں کو دوست نے سمجھایا تو بولے "ہاں جی ایسے بندے کا ملک سے باہر رہنا ہی ٹھیک ہے"۔ انھیں پیرس جانے کی اجازت مل گئی۔ یہ پیرس سے لندن آئے یہاں سے ان کی طلبی ہوئی۔ انھوں نے واپس جانے سے انکار کر دیا۔ کئی بار اصرار ہوا۔ انھوں نے کہا قانون کی جس دفعہ کے ماتحت واپس بلایا جا رہا ہے اس کا حوالہ دیجئے۔ یہاں ایسا کوئی قانون ہی نہیں تھا اسی لیت و لعل میں شہاب کسی تدبیر سے پاسپورٹ میں اندراج نہ ہونے کے باوجود اسرائیل جا پہنچے۔ وہاں عربوں پر ہونے والے مظالم کو انھوں نے بڑی ترکیبوں سے فلم کر لیا پھر اُن فلموں کو بڑے جتن سے عرب علاقوں میں پہنچا یا گیا جب یونسکو میں انسداد مظالم کمیٹی میں عربوں پر مظالم کا مسئلہ درپیش ہوا اور اسرائیل نے ان سے انکار کیا تو قدرت اللہ شہاب نے وہ فلمیں دکھائیں اور ان کی بنیاد پر فلسطینی وفد کو حمایت اور کامیابی حاصل ہوئی۔ یاسر عرفات نے ان کو اپنا سب سے بڑا اعزاز دیا۔ کچھ عرصے بعد یاسر عرفات پاکستان آئے۔ یحییٰ خاں سے ملے اور اس گفتگو میں انھوں نے پاکستان کا شکریہ ادا کیا کہ ایک پاکستانی نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر فلم لی اور اس طرح فلسطینی مجاہدین پر بڑا احسان کیا۔ یحییٰ خاں نے اس پاکستانی کا نام پوچھا اور شہاب کا نام سن کر بڑی ناراضگی اور خفگی کا اظہار کیا۔ یاسر عرفات نے غصے میں کہا کہ تعجب ہے کہ آپ ہمارے اس عظیم دوست کے بارے میں ایسے الفاظ کہتے ہیں جو اس کا دوست نہیں وہ ہمارا بھی دوست نہیں۔ غرض عرفات کے کہنے سے شہاب کو پاکستان دوبارہ واپس آنے کی اجازت ملی۔

—— لاہور میں مینار پاکستان بھی دیکھنے گیا۔ یہیں ۱۹۴۰ء میں مسلم لیگ کے اجلاس میں قرارداد پاکستان منظور ہوئی تھی۔ یہاں چاند تارے کے ڈیزائن میں ایک حوض اور ایک ہلالی دائرے میں مینار کے لئے زمین نکالی گئی ہے۔ چاروں طرف فرحت بخش لان میں مینار کے لئے جہاں سے راستہ جاتا ہے وہاں ایک طرف قرارداد پاکستان کے اقتباسات اور دوسری طرف اقبال کی لاالہ الااللہ

والی غزل پتھر پر کندہ کر کے لگائی گئی ہے اس پر سید محمد جعفری کی پیروڈی بھی سننے کو ملی۔ ایک ایسی غزل پر جس کی ردیف لا الہ الا اللہ ہو پیروڈی لکھنا سید محمد جعفری ہی کا کمال ہے۔ دو شعر یاد رہ گئے ہیں۔

خودی کو پال کے دنیا بنا دیا ہم نے
چھری ہو اس پہ رواں لا الہ الا اللہ
ہے مولوی کے لئے مرغ کی طلب ہر دم
بہار ہو کہ خزاں لا الہ الا اللہ

(پہلا مصرعے کا آخری ٹکڑا بھول گیا ہوں)

—— پھر اسلامی چوٹی کانفرنس کے اجلاس کی جگہ دیکھی جہاں اب خوبصورت میموریل بن گیا ہے۔

—— پاکستان کا سفر صرف یادوں کے چراغوں سے عبارت نہ تھا نئی بشارتوں اور نئی آگاہیوں کا سفر تھا۔ وہ چہرے جو محبت اور خلوص بکھیرتے ہیں اور ابھی تک مستقبل کی ایک تابناک جھلک کے لئے مضطرب ہیں نظروں کے سامنے بکھرے ہیں۔

آب رواں کبیر تیرے کنارے کوئی
دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب

—— کراچی یونی ورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر احسان رشید کی دعوت پر یونی ورسٹی گیا۔ گو یونی ورسٹی بند تھی مگر چہل پہل کافی تھی۔ طلبا برآمدوں اور باہر میدان میں چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں جمع تھے۔ ایک طرف الگ الگ میزوں پر مختلف BANNERS لگائے کچھ طلبا بھی بیٹھے تھے پتہ چلا کہ اگلے داخلے کی تیاریاں ہیں اور طلبا کی ہر جماعت کی طرف سے یہ اہتمام ہے کہ اس جماعت کے ہمدرد طلبا متعلقہ پارٹی کی میز سے داخلے کا فارم لیں اور اعانت حاصل کریں۔ ایک طرف جماعت اسلامی کی ٹولی تھی تو دوسری طرف پروگریسو اسٹوڈنٹس گروپ کا۔ ایک طرف "جے سندھ" پارٹی کا BANNER بھی دکھائی پڑا۔

—— یونی ورسٹی کا کیمپس بہت بڑا ہے اور بعض عمارتیں خوبصورت اور کشادہ ہیں خصوصاً وائس چانسلر کا دفتر بڑا ہی طویل و عریض تھا۔ احسان رشید پرانے دوست اور رفیق کار تھے

بڑی محبت سے پیش آئے دو چار روز میں چین کے دورے پر روانہ ہونے والے ہیں۔ چند روز پہلے یونی ورسٹی کھولنے کے مطالبے کے سلسلے میں طلبا کے گھیراؤ سے جانبر ہوئے تھے مکلف عصرانہ تھا جس میں پہلی بار شعبۂ اردو کے سبھی اساتذہ اور فلسفے اور سوشیالوجی کے دو نامی استادوں سے ملا۔

—— معلوم ہوا کہ کراچی یونی ورسٹی کا شعبۂ تصنیف و تالیف مختلف علوم پر اردو میں درجنوں کتابیں شائع کر چکا ہے ان میں بین الاقوامی تعلقات، فلسفہ، اخلاقیات اور سائنس کے تقریباً سبھی شعبے شامل ہیں۔ وائس چانسلر کی طرف سے ان مطبوعات کا ایک ذخیرہ مجھے پیش کیا گیا۔ ان میں شاید سب سے بیش قیمت فرہنگ اصلاحات کے سلسلے کی وہ کتابیں ہیں جو مختلف علوم سے متعلق ہیں۔ اس کے علاوہ ایک علمی رسالہ بھی یونی ورسٹی کی طرف سے شائع ہوتا ہے۔ یہ واقعی اہم علمی کارنامہ ہے۔

—— یہیں ڈاکٹر حامد محمود سے ملاقات ہوئی جنھوں نے چند روز بعد سائنٹفک سوسائٹی کی طرف سے یونی ورسٹی کے اسٹاف کو اپنے بنگلے کے سبزہ زار پر خاص طور پر استقبالیہ منعقد کیا۔ صدارت مشہور سائنس داں پروفیسر سلیم الزماں نے فرمائی۔ ڈاکٹر حامد محمود کی سربراہی میں یہ سوسائٹی اردو میں سائنس پر کام کر رہی ہے، کتابیں شائع کر رہی ہے اور بچوں کے لئے 'سائنس' نامی ایک رسالہ نکالتی ہے۔ کتابوں کا معیار اچھا ہے رسالہ بھی صاف ستھرا چھپا ہے اور سائنس کانگریس کی طرح سوسائٹی کے سالانہ اجلاس بھی ہوتے ہیں جن میں سائنسی موضوعات پر ماہرین اردو میں مقالے پڑھتے ہیں۔ سوسائٹی اپنا شجرۂ نسب سر سید احمد خاں کی سوسائٹی سے جوڑتی ہے اور سائنس اور اردو دونوں کی نہایت قابلِ قدر خدمات انجام دے رہی ہے۔

—— شعبۂ اردو کراچی یونی ورسٹی نے باقاعدہ لنچ کا اہتمام کیا اس سے قبل استقبالیہ جلسے کی صدارت پرو وائس چانسلر پروفیسر منظور احمد نے کی۔ جلسے میں میرے محترم جناب مجنوں گورکھپوری اور شعبۂ اردو کے سبھی اساتذہ اور طلبا موجود تھے۔ ہر چند کہ یونیورسٹی بند تھی مگر کمرہ بھرا ہوا تھا جمیل اختر ملیگ رامپوری لباس میں بج رہے تھے (چوڑی دار پاجامہ اور سفید ٹوپی) اور علیگڑھ علی گڑھ انداز سے تقریر کر رہے تھے تعارف کیا تھا پورا نثری قصیدہ تھا اعظم فرخی سے پہلی بار

اسی محفل میں ملاقات ہوئی۔

—— دوسرے دن ڈاکٹر سید شاہ علی نے اپنے ہاں مدعو کیا وہاں صمد شاہین سے ملاقات ہوئی اپنی یونسکو کی فتوحات کا تذکرہ کرتے رہے۔ ممتاز شیریں کا ذکر رہا انھوں نے "نیا دور" بنگلور کے پرانے پرچے اور ممتاز شیریں کا میگھ ملہار اور ان کی بعض تحریروں کے انگریزی ترجموں پر مشتمل ایک فائل عنایت فرمایا۔

—— تیسری شام جناب مجنوں گورکھپوری کے ہاں عصرانہ تھا۔ مجنوں صاحب اپنے پوتے سہراب جی کے سہارے آنے جانے چلتے پھرتے ہیں چند ماہ پہلے ایک حادثے کا شکار ہو گئے تھے مگر اسی طرح چونچال ہیں چھڑی اور ٹارچ اسی طرح ساتھ رہتی ہیں۔ اکرام بریلوی کے ہاں رات کو مشاعرے میں بھی میری خاطر تشریف لائے اور بارہ بجے رات تک بیٹھے رہے اور غزل سنا کر مزید کرم کیا۔ علی گڑھ کے ایک ایک دوست کی خیریت پوچھتے رہے۔

—— ذوالفقار مصطفےٰ نے جس طرح پذیرائی کی اس کا شکریہ ممکن نہیں۔ ذوالفقار مصطفےٰ میرے ہم وطن ہیں ان سے مرادآباد، لکھنؤ اور نینی تال میں ملاقاتیں رہیں اور ہر بار ان کے خلوص اور محبت نے متاثر کیا۔ اہل مرادآباد کے جلسے میں ان کا دل دوز مقالہ گویا اس خلوص کا مظہر تھا جس طرح عرب قصیدہ نگار اُن وادیوں کے ذرے ذرے کو یاد کرتے تھے جن سے ان کا کارواں گزرا تھا۔ اس طرح مرادآباد شہر کی ایک ایک شام اور دریائے رام گنگا کی ایک ایک لہر کو ان کے قصیدے نے مقدس بنا دیا۔ ابوالحسن نے صدارت کی اور میرے کتنے ہی پچھلے ہم وطن غالب لائبریری کی اس شام پھر سے آملے۔

—— کراچی میں شہروں اور صوبوں کی ان برادریوں کی بڑی دھوم دھام ہے۔ اہل مرادآباد میں "سب رنگ" ڈائجسٹ کے مدیر شکیل عادل زادہ اور اکرام بھائی بھی شامل ہیں اور اہل مرادآباد کی یہ انجمن رسالہ بھی نکالتی ہے جس کا جگر نمبر مجھے دیا گیا۔ اس کے علاوہ بیوٹ مسلم اسکول مرادآباد کے اولڈ بوائے بھی اکثر جمع ہوا کرتے ہیں۔ اسی طرح مرزا ظفر الحسن نے غالب لائبریری اور حمید الدین شاہد نے حیدرآباد کا ادارۂ ادبیات اردو کراچی میں قائم کر کے حیدرآباد (دکن) کا ثقافتی ماحول پیدا کر رکھا ہے۔

—— مرزا ظفر الحسن غالب رسالہ نکالتے ہیں، غالب لائبریری چلاتے ہیں۔ مخدوم کے ہم جماعت رہ چکے ہیں۔ فیض صاحب کے پروانے ہیں اور بڑے سرگرم اور مستعد ہیں۔ غالب لائبریری کراچی کا ادبی مرکز بن گئی ہے۔ وہاں جائیے تو غالب پنسل اور غالب کیلنڈر ملے گا جسے نیلام کر کے بڑی رقمیں وصول کی گئی تھیں۔ مرزا ظفر الحسن نے اپنی دو تین کتابیں بھی دیں جو مخدوم، فیض اور حیدرآباد سے رچی بسی تھیں۔ لوگوں نے کہا کہ جو کام کی اور کتابیں غالب لائبریری نے شائع کی ہیں وہ مرزا صاحب چھاپ گئے۔ اس لائبریری کی خصوصیت یہ ہے کہ یہاں کامیاب ٹی وی اور ریڈیو ڈراموں کے اسکرپٹ جلد باندھ کر محفوظ کر لئے گئے ہیں ان کا اتنا بڑا ذخیرہ شاید ہی کہیں اور ملے۔

—— حمید الدین شاہد دل کے مریض مگر بڑے باغ و بہار۔ بیوی ڈاکٹری کرتی ہیں اور نرسنگ ہوم چلاتی ہیں، بیٹا کسی ہوائی جہاز کمپنی میں پائلٹ ہے، نہایت آرام دہ مکان اور کشادہ۔ شاہد صاحب دن بھر ادب پرستی اور حیدرآباد نوازی کرتے ہیں۔ ایک پورا کمرہ نادر رسالوں اور اخباروں کے لئے وقف ہے ادبی یادگاریں ادارۂ ادبیات اردو کے میوزیم کی طرح بکھری ہیں "ایوانِ اردو" انجمن کا نام ہے اور رسالہ "سب رس" ابھی ابھی جاری کیا ہے۔

—— ایک طرف گوشۂ امروہہ بھی ہے مگر امروہے کا نام سید محمد تقی اور رئیس امروہوی ہے۔ عزیز دوست سبطِ اختر پی آئی اے کی ٹریڈ یونین کے منتظم اور رسالہ منشور کے مدیر مدتوں رہے ان دنوں عتاب شاہی کا شکار ہیں بھٹو شاہی دور کی عوامی وردی شلوار قمیص میں ملبوس اسی شان سے پرانی 'کھٹارا' موٹر چلاتے ہیں۔ آئے تو لکھنؤ کی بہت سی یادیں ہمراہ لائے۔ حسن عابد بھی تھے دونوں سیاسی طور پر بڑے بالغ ہو گئے ہیں۔ سبطِ اختر نے پیچ دیا اس سے قبل رئیس امروہوی اور سید محمد تقی صاحبان کی طرف سے عصرانہ تھا۔ رئیس کو میں مرادآباد سے جانتا ہوں جب وہ ۱۹۴۴ء میں اسلامی مسافر خانے میں مقیم تھے اور رسالہ 'مسافر' نکالتے تھے جس کے منیجر شکیل عادل زادہ مدیر 'سب رنگ' کے والد عادل ادیب تھے۔ اس زمانے میں بھی ان کی بدیہہ گوئی بے مثال تھی۔ حقّے کی نے ہاتھ میں ہے سامنے مونڈھے پر کوئی صاحب بیٹھے سہرے کی فرمائش کر رہے ہیں رام پور کی گاڑی چھٹنے میں پندرہ منٹ ہیں اور ان صاحب

کو شادی میں شرکت کے لیے رام پور جانا ہے رئیس امروہوی نے منہ سے نَے لگائی اور شعر لکھوانے شروع کر دیئے۔ پندرہ منٹ میں کوئی بیس شعر لکھے گئے اور وہ صاحب سلام کرکے رخصت ہوئے۔

——— رئیس امروہوی اردو پردیش اور اتر پردیش کی مہاجر آبادی کے نمایندہ اور علمبردار ہو گئے ہیں۔ ہندوستان سے ایسی ٹوٹ کے محبت تو کسی نے نہ کی ہوگی۔ جون ایلیا اس شیفتگی میں ان سے بھی آگے ہیں ہر غزل میں خاک ہند کا ذرہ ذرہ جگمگاتا ہے جس میں مشترکہ تہذیب سے وابستگی بھی ہے اور احترام آدمیت بھی۔ سید محمد تقی نے اپنے خانہ ساز فلسفے کی دو کتابیں پیش کیں مگر فلسفہ میری سمجھ میں کم آیا اُن کی باتوں میں زیادہ لطف پایا۔

——— پاکستان میں اردو کے نئے نقاد محمد علی صدیقی بھی امروہے کے ہیں۔ روزنامہ "ڈان" میں 'ایریل' کے نام سے ادبی کالم لکھتے ہیں اور "مساوات" کے نائب مدیر ہیں۔ جب تک کراچی رہا ان سے بار بار ملاقاتیں ہوئیں اور میں ان میں بالغ نظری اور عصری آگہی پائی۔ حسن عابد کے ہاں عشائیے پر میرا ڈراما "ضحاک" چند احباب کے سامنے پڑھا گیا اور ایک عجیب ہم آہنگی اور ہم خیالی کے احساس سے فضا جگمگا اٹھی۔

——— پھر نامور محقق مشفق خواجہ کی مشفقی ہے جس کا ہندوستان میں ہر اردو محقق قایل اور معترف ہے۔ یہ کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ مشفق خوش فکر شاعر بھی ہیں اور ان کی حس مزاح خاصی تیز ہے اگر تحقیق نے تہہ دام نہ لے لیا ہوتا تو یا تو شاعر ہوتے یا مزاح نگار۔ چینی ریستوران میں انھوں نے میرے لئے لنچ کا انتظام کیا اور پھر ساحل سمندر پر سفر نامے والے حمزہ، ذوالفقار اور مشفق کے ساتھ دن بھر گزارا۔ اونچی کھردری چٹانوں سے سر ٹکراتا سمندر۔ عجب ازلی مناظر پیش کر رہا تھا مشفق صاحب کی مشفقی کی حد یہ ہوئی کہ ہندوستان لوٹ آنے پر مجھے ایک پیکٹ ملا جس میں دیوان آبرو کے نادر مخطوطے کے عکس تھے۔ یہ تحفہ سرمۂ مفت نظر کے طور پر مشفق خواجہ کی "خواجگی" سے پایا اور دل شکریے کے جذبات سے بھر اُٹھا۔

——— شوکت صدیقی سے پرانی یاری تھی۔ ٹیلی فون پر نام بتایا۔ محمد حسن۔ کہنے لگے وہی امریکی سفارت خانے والے؟ عرض کیا "جی نہیں"۔ کہنے لگے اس نام کے تو میرے صرف ایک دوست

ہیں ڈاکٹر محمد حسن اور وہ ہندوستان میں ہیں؟ عرض کیا "وہی"۔ کوئی بیس برس بعد ہم دونوں ملے اور وقت دبے پاؤں پیچھے ہٹ گیا۔ کل گئے رات تک تو ہم لوگ امین آباد لکھنؤ کے چوراہے پر "تانتیا" افسانے کے پلاٹ پر گفتگو کر رہے تھے کہ اسے شوکت چند روز میں لکھنے والے ہیں اور یہ "تانتیا" اس فوجی کی کہانی تھی جو دوسری جنگ عظیم کے بعد تخفیف میں آگیا تھا۔ مگر اب تو دوسری جنگ عظیم کو ختم ہوئے ۳۲ برس ہوگئے تھے۔

—— شوکت نے ماؤ کی تصانیف کا اردو میں ترجمہ کیا ہے مارکس لینن اسٹالن ماؤ کی خوبصورت تصویریں جو سلک پر چھپی اور کڑھی ہوئی تھیں عطا کیں جو شوکت کے دورۂ چین کی یادگار تھیں اپنے نیم تاریخی ناول کے تین ابواب پڑھوائے جو زیر تصنیف ہے اور جس میں انگریزوں کے دور میں غلام ہندوستان سے ہجرت کرکے افغانستان اور روس جانے والے مہاجرین کی سرگزشت بیان کی جائے گی۔ شوکت کا کہنا تھا کہ اس سلسلے میں انھوں نے تمام اہم خاندانوں کے شجروں کی ورق گردانی کی اور اس نتیجے پر پہنچے کہ آج کے سبھی ناموروں کی چوتھی پیڑھی انگریزوں کی کسی جاسوس یا پٹھو تک ضرور پہنچتی ہے۔ واللہ اعلم!

—— شوکت کا یہ بھی بیان تھا کہ "خدا کی بستی" کی رایلٹی سے اس نے مکان بنوایا ہے اور اس سے زیادہ آمدنی کسی اردو ناول سے کسی کو نہیں ہوئی۔ یہ اوروں سے بھی سنا کہ "خدا کی بستی" پاکستان ٹیلی ویژن پر قسط وار پیش کیا گیا (اور اسے شوکت صدیقی نے ڈائرکٹ کیا تھا) تو اس کے کرداروں کا گھر گھر چرچا تھا اور ان کرداروں کا پارٹ کرنے والے اداکار کرداروں کے ناموں سے مشہور ہوگئے اور کرداروں ہی کے مطابق ان سے لوگ محبت یا نفرت کرنے لگے۔

شوکت کے مکان کے تکونے سبزہ زار پر بہت دل چسپ صحبتیں رہیں اور پرانی یادوں اور نئے مسایل کے بارے میں آزادانہ تبادلۂ خیالات ہوتا رہا۔ یہیں اپنے پرانے دوست ممتاز حسین اور علی مظہر رضوی سے ملاقات ہوئی۔ علی مظہر انفرمیشن آفیسر ہیں اور ان دنوں بھٹو حکومت کی ناک کا بال تھے مگر میں ٹریڈ یونین لیڈر علی مظہر کو جانتا تھا جو لکھنؤ میں رسالہ "منزل" نکالتے تھے۔ میرے اعزاز میں جو شب افسانہ ہوئی اس میں علی مظہر کا نیا افسانہ بھی سنا اور انکے ڈراموں کا مجموعہ بھی پڑھا خوشی ہوئی کہ افسریت کے باوجود علی مظہر نے ڈرامے میں جولانیاں دکھائی ہیں۔

—— ٹیلی وژن کا ذکر آیا ہے تو یہ بھی کہتا چلوں کہ ٹیلی وژن کا شوق پاکستان میں عام ہے اب رنگین ٹیلی وژن کا چرچا ہے۔ ان دنوں اس کی قیمت بارہ ہزار روپے تھی۔ پروگراموں میں عام طور پر "کسوٹی"، "نیلام گھر" اور ڈرامے بے حد مقبول ہیں۔ کسوٹی سوالوں کا پروگرام ہے جس میں آپ اپنے دل میں کوئی نام یا چیز سوچ لیجئے اور بیس سوالات کر کے اس پروگرام کے ذمہ داران آپ کو وہ چیز یا نام بتا دیں گے۔ "نیلام گھر" میں البتہ منتظمین خود سوال کرتے ہیں اور صحیح جواب دینے والے کو کوئی بہت بڑی چیز انعام میں ملتی ہے۔ میرے دورانِ قیام ایک صاحب کو جاپان کی قیمتی مزدا موٹر کار انعام میں ملی تھی اور اس کی بڑی دھوم تھی۔ آخری سوال سے پہلے ان صاحب سے کہا گیا کہ وہ پچیس ہزار روپے لے لیں یا پھر آخری سوال کا صحیح جواب دینے پر موٹر کار لیں۔ بیوی برابر بیٹھی تھی اور برابر ان صاحب کو لالچ میں نہ پڑنے کا مشورہ دے رہی تھی اور اُچک اُچک کر ان سے رقم لے لینے کو کہہ رہی تھی۔ مگر یہ صاحب تھے کہ اعتماد کی تصویر بنے ہوئے تھے آخری سوال کا بھی جواب انھوں نے صحیح دیا اور موٹر کار انعام میں مل گئی۔

—— ٹیلی وژن کے ڈرامے واقعی اچھے ہیں۔ ان کی اور دوسرے پروگراموں کی کامیابی کا ایک راز یہ ہے کہ تقریباً سبھی اچھے پروگرام مختلف تجارتی ادارے اسپانسر کرتے ہیں۔

—— شوکت صدیقی کے ہاں عتیق سے ملاقات ہوئی۔ عتیق جناح کالج میں انگریزی کے استاد ہیں اور کراچی کی ترقی پسند مصنفین کے تین ستونوں میں سے ایک ہیں جو دراصل روحِ رواں بتائے جاتے تھے وہ ملے مگر سنا ہے کہ ان میں جگن ناتھ مرحوم کا سا جوش و خروش پایا جاتا ہے۔ ترقی پسند مصنفین کا جلسہ اب بہت کم ہوتا ہے مگر ترقی پسندوں کے نام سے بدکنے کی وہ "جدیدی" بیماری یہاں اتنی نہیں ہے۔

—— عبید اللہ علیم نے رائٹرز گلڈ کی طرف سے استقبالیے کا انتظام کیا۔ یہاں کئی مستند اور نامور اہلِ قلم حضرات سے ملاقاتیں ہوئیں۔ غلام عباس ملے جن سے آخری ملاقات ۱۹۵۹ء میں ناگپور کے ادیبوں کے کنونشن میں ہوئی تھی۔ انور ملے جن کے صرف افسانے ہی پڑھے تھے مگر کبھی ملنے کا موقعہ نہ ملا تھا۔ عبدالعزیز خالد ملے۔ راغب مرادآبادی ملے جنھوں نے فی البدیہہ چار شعر میری شان میں کہہ ڈالے۔ جاذب قریشی ملے۔ رضیہ فصیح احمد اور ان کے شوہر فصیح احمد

سلے جن کے افسانے پاکستان میں سماجی احتجاج کی سب سے دل کش آواز ہیں۔
'ارباب قلم' کراچی کا جلسہ جناب شبنم رومانی نے بڑی دھوم دھام سے کیا کراچی کا ایک بہت عمدہ ریسٹوران تھا جہاں میری خاطر اس جلسے کی طرح ڈالی گئی تھی۔ شبنم رومانی کی نرم و نازک لطیف نظمیں ایک مدت سے پڑھتا تھا اور اپنے دو ایک مضامین میں ان کا ذکر بھی کر چکا تھا مگر ان سے ملاقات پہلی بار ہوئی۔ مجھے اندازہ نہ تھا کہ میری طرح ڈیڑھ ہڈی کے اس شاعر میں ایسی انتظامی صلاحیت اور ایسی قوت عمل موجود ہے۔ ان کی نغز گوئی کے ساتھ ساتھ ان کے خلوص نے بھی متاثر کیا۔
اسی جلسے میں شہزاد منظر سے ملاقات ہوئی جنھیں ابراہیم ہوش اور سالک لکھنوی کے ہفتہ وار 'آثار' کے زمانے سے جانتا تھا۔ شہزاد نے ادبی شخصیتوں کے بڑے دل نواز خاکے لکھے تھے اور مغربی ادب فکر اور آرٹ سے بڑی واقفیت کا ثبوت دیا تھا۔ اب مساوات سے متعلق تھے اور صحافت میں اپنے ترقی پسندانہ افکار اور شگفتہ اسلوب سے پہچانے جاتے ہیں۔
شان الحق حقی نے کراچی کے سب سے فیشن ایبل ریسٹوران بوٹ کلب میں لنچ پر مدعو کیا۔ حقی صاحب کو نغز گو شاعر اور زباں داں کی حیثیت سے جانتا تھا ان کا مجموعہ 'تار پیرہن' بھی مزے لے لے کر پڑھ چکا تھا لیکن ترقی اردو بورڈ کی اردو لغت کے بانی مبانی کی حیثیت سے ان سے شناسائی نہ تھی۔ دراصل لغت کا سانچہ انھیں کا بنایا ہوا ہے۔ اس کا پورا بلیو پرنٹ جو کبھی 'اردو نامہ' میں چھپی تھی ان سے حاصل کیا۔ حقی صاحب نے بڑی عرق ریزی سے کتابیں پڑھیں اور پڑھوائیں۔ ہر لفظ اور ہر محاورے کی سندیں تلاش کیں اور اس کے بعد پوری لغت ذاتی مناقشوں میں الجھ کر رہ گئی جس سے حقی صاحب بھی بڑے بدمزہ ہوئے۔ ان کی شگفتگی کچھ مدھم تھی لیکن ان کے شعروں کا بانکپن اور لطف سخن وہی تھا۔ اکرام بریلوی کے ہاں مشاعرے میں ان کی پُرکیف غزل اس کا ثبوت تھی۔
اس لنچ کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ حقی صاحب نے دیکھا کہ میری بیوی بھی میرے ہمراہ ہیں تو جلدی سے ٹیلی فون کر کے اپنی بیگم اور میرے چچازاد بھائی نصرت حسن، چیرمین پاکستان کاٹن بورڈ کی بیگم کو لنچ پر گاڑی بھیج کر بلوایا۔ مرد عورتوں کے ملے جلے مجمعوں اور پارٹیوں کا چرچا

پاکستان میں کم نظر آیا جہاں ہوتیں شریک بزم ہوتی بھی تھیں وہاں جلد ہی اپنا الگ حلقہ بنا کر محصور ہو جاتی تھیں۔

—— اس سلسلے میں شاید استثنا ارشاد ثانی (میڈورا آف لندن) کا ڈنر تھا۔ ثانی علی گڑھ یونی ورسٹی میں میرے شاگرد تھے اور وہاں میرے قائم کردہ اردو تھیٹر کے بڑے سرگرم ادا کار بھی تھے۔ اس دعوت میں سب مہمانوں کو میک اپ اور عطریات کے سیٹ بھی پیش کئے گئے اور ثانی نے اپنی اداکاری کے نمونے بھی دکھائے۔

—— یہیں بوٹ کلب میں نصرت حسن بھائی کی طرف سے عشائیہ تھا۔ کراچی میں مکمل نشہ بندی تھی مگر بوٹ کلب میں دنیا کی بہترین شرابیں شیشے کی الماریوں میں جگمگا رہی تھیں۔ یہیں سندھ کے (اس وقت کے) وزیر اعلیٰ غلام مصطفےٰ جتوئی سے ملاقات ہوئی۔ کراچی کے اعلیٰ ترین طبقے کے لوگ اور غیر ملکی سیاح نفیس کٹ گلاس کے جام ٹکرا رہے تھے اور پوری فضا نقرئی قہقہوں سے منور تھی۔

—— اپنے پرانے دوست اور رفیق نصیر حیدر سے ملاقات ہوئی۔ نصیر حیدر ان ہستیوں میں ہیں جو افسانوی ہوتی ہیں۔ نصیر حیدر نے شاعری کی طرح زندگی بسر کی خواب کی طرح کی زندگی جسے صرف تخیل کے شہزادے بسر کر سکتے ہیں کہ ہر درد و کرب ان کے لئے محض ایک رومانی کسک بن کر رہ جاتا ہے۔ نصیر حیدر نہایت ذہین دانش ور اور بڑے تیکھے غزل گو ہیں مگر کم لکھتے ہیں اور اپنے شعر تو چھپاتے ہی نہیں۔ ان سے ملاقات اکیس سال بعد ہو رہی تھی اور اب بھی وہ اسی طرح تنہا اور اسی طرح تابندہ تھے۔ سرمد سے منسوب رباعی کے مصرعے یاد آ گئے۔

القصہ تمام سرد و گرم عالم
بر ما بگذشت و ایں دل زار ہماں

—— شور علیگ صاحب طرز نظم نگار کی حیثیت سے جانے پہچانے تھے۔ شاذ تمکنت جس عزت و احترام سے ان کے فیضان کا اعتراف کرتے تھے اس سے ان کی منزلت کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ ان سے ملا اور ان کا کلام سنا تو ان پر ایمان لے آیا ان کی گداز فکر اور لطافت بیان نے متاثر کیا۔

—— شکیل عادل زادہ کے گھر کے وسیع سبزہ زار پر دوست احباب جمع تھے۔ میرے اعزاز

میں یہ عشائیہ مولانا ابوالکلام آزاد کی مشہور کی ہوئی چینی کی یاسمین چائے پر ختم ہو رہا تھا۔ شکیل کے ہاں آزاد آبادی ملے۔ لکھنؤ یونی ورسٹی کی مسز ثریا جمیل اور ان کے شوہر جمیل صاحب سے بالکل اسی طرح جیسے جمیل جالبی کے ہاں کے عشائیے میں 'ڈان' کے ایڈیٹر اور میرے لکھنؤ یونی ورسٹی کے دور کے دوست احمد علی خاں اور ان کی بیگم ہاجرہ مسرور ملی تھیں۔ شکیل اردو کے سب سے کثیر الاشاعت ڈائجسٹ کے مدیر ہونے کے باوجود ایسے منکسر مزاج اور متواضع کہ ان سے مل کر مراد آباد کے رشتے 'سب رنگ' سے بھی زیادہ رنگین نظر آنے لگے۔

—— پھر کراچی کے ان تمام اخبار نویسوں کا شکریہ بھی اس سفرنامے میں واجب ہے جنھوں نے میرے انٹرویو چھاپے، میری تقریروں کی نہایت تفصیلی رپورٹیں، تصویریں اور خبریں چھاپیں پورے اور بھرپور مقالے میرے بارے میں شائع کئے۔ ان میں اکرام بریلوی کا مقالہ مطبوعہ 'مارننگ نیوز' کراچی اور ایریل کا مقالہ مطبوعہ 'ڈان' کراچی کے لئے خاص طور پر ممنون ہوں پھر نور جہاں بیگم نے 'اخبار خواتین' کے لئے میرے پورے خاندان پر جو تصویری فیچر اور انٹرویو شائع کیا وہ بھی شکریے کا مستحق ہے۔ اس کے علاوہ روزنامہ مساوات، جنگ، نصرت اور دوسرے اخبارات کا بھی شکریہ واجب ہے۔ پھر اپنے عزیزوں سید خادم علی صاحب عم مکرم اور سید اعظم علی اور عزیزی بدر عالم اور صلاح الدین، شہناز بھابی، جہاں آرا کا شکریہ لازم ہے۔

—— لاہور میں قیام بہت کم رہا مگر قابل ذکر ملاقاتوں میں محمد طفیل مدیر 'نقوش' کی محبتوں اور نوازشوں کی یادیں قابل ذکر ہیں۔ طفیل نیا مکان بنوا رہے ہیں (مسلم ٹاؤن میں۔ جو ظاہر ہے ان کی خوش سلیقگی اور ذوق جمال کی جیتی جاگتی تصویر ہوگا) 'نقوش' کے اقبال نمبر تین قسطوں میں نکال رہے ہیں۔ 'نقوش' پریس چلا رہے ہیں اور بڑے سلیقے سے زندگی گزار رہے ہیں۔ سنئے ادب زیادہ تر خفا، یہ ان سے بے نیاز۔ ادیبوں کی سیاست سے بے پرواہ آزادانہ بسر کرتے ہیں۔ پر لطف قصہ سناتے تھے کہ 'نقوش' پہلے کسی دوسرے پریس میں چھپتا تھا اور 'نقوش' اس پریس کے لئے خاصہ بڑا کاروبار فراہم کرتا تھا۔ محمد طفیل نے اصرار کیا کہ اس بار 'نقوش' فلاں تاریخ تک ضرور چھپ جائے۔ مگر پریس والوں نے کچھ آنا کانی اور ٹال مٹال کی۔ محمد طفیل نے رسالے کے مسودات واپس منگوا لئے اور رقم کا انتظام کر کے

اپنا پریس خرید لیا۔ پہلے لیتھو پریس لیا پھر آفسیٹ کی کئی مشینیں لے لیں اور اس کام میں لگ گئے۔ محمد طفیل پورے پاکستان میں وہ تنہا شخص ہیں جس کی زبان سے میں نے ان ہندو مہاجرین کے دکھ درد کا حال سنا جو لاہور اور پنجاب سے ہجرت کر کے گئے ہوں گے اور ان کے لئے دردمندی کے جذبات پائے۔

ـــــ ڈاکٹر سید عبداللہ سے ملا۔ ۸۰ برس کی عمر ہوگی کان میں سماعت کے لئے آلہ لگا ہوا ہے مگر پنجاب یونی ورسٹی کے دائرۃ المعارف میں بیٹھے انسائیکلوپیڈیا والے کام میں مصروف ہیں بڑی محبت سے معانقہ فرمایا اور ایسے کلمات زبان مبارک سے فرمائے جو میرے لئے سرمایۂ افتخار ہیں۔ پنجاب یونی ورسٹی میں پروفیسر عبادت بریلوی، پروفیسر وحید قریشی اور سہیل احمد سے ملاقاتیں ہوئیں۔

ـــــ پھر احمد ندیم قاسمی سے ملے بالکل اسی طرح ہیں جیسے ان کی تصویریں وہی شیریں مسکراہٹ وہی گھنگھریالے بلکہ لہردار بال جو اب کہیں کہیں سیاہ کے بجائے سرخ ہوگئے ہیں۔ ان دنوں صحیفہ کی ادارت اور مجلس ترقیٔ ادب کا کام بھی انھیں کے سپرد ہے۔

ـــــ پھر پاک ٹی ہاؤس کی وہ مختصر مگر یادگار نشست جس میں انتظار حسین، انور سجاد، شہرت بخاری، طارق زیدی شریک تھے۔ انور سجاد نے وعدہ کیا تھا کہ "عصری ادب" کے "پاکستانی اردو ادب نمبر" کے لئے نیا افسانہ بھیجیں گے۔ پھر معلوم ہوا کہ انور سجاد بھی حبیب جالب اور ظہیر کاشمیری کی طرح جیل چلے گئے اور ہم ان کے نئے افسانے سے محروم ہوگئے۔

اور آخر یہ سفرنامہ بھی تو انہی کبھی نہ ختم ہونے والے افسانوں کی مہک ہی سے تو عبارت ہے۔

ابن انشا

واپسی

بستیاں قریے گھوم چکے اب دشت کو لوٹیں بن کو چلیں
شام ہوئی آوارہ غزالو آؤکہ اپنے وطن کو چلیں

"تم اور ہم سے پیار کروگے؛ جھوٹ ہے لوبھی بنجارو
بیچوگے بیوپار کروگے، تم سے دور بھلے پیارو"

بیٹھا ہے وہ جو آگ جلائے، کھوہ کے منہ پر چڑھوا ہا
وہ بھی ہے تیر کمان سجائے، اس سے بھی ہم کو بچنا ہوا

پچھم میں جہاں پیڑ گھنے ہیں، واں سے بھی لوگو دور ہی دور
ان میں وہ اپنی جان کے بَیری چیتے باگھ چھپے ہیں ضرور

ہر کوئی دیکھ کے جال بچھائے، ہر کوئی اُٹھ کے وار کرے
بستیاں قریے گھوم چکے ہیں ہم، کوئی نہ ہم سے پیار کرے

لائے تھے ہم کس کو دکھلانے، یہ چلیں دکھتے من کو چلیں
شام ہوئی آوارہ غزالو! آؤ کہ اپنے وطن کو چلیں

ابنِ انشا

اُفتاد

کون ستارے چھو سکتا ہے راہ میں سانس اُکھڑ جاتی ہے
اخترالایمان

۱

نگاہوں کی دوری کی دشوار منزل سے تم آج سے دور تر ہو گئے ہو
شبِ ہجر کی اولیں منزلوں سے گریزاں مثالِ سحر ہو گئے ہو
تمہیں زیست کے موڑ تک ملنے کے وعدے کی میعاد تو آ چکی ہے
مگر اب تو کچھ پاؤں تھک سے چلے دور کی بات ہے شام دھندلا چکی ہے

وہ اُتر کے ملکوں سے کونجیں رسیلی مسلسل مسلسل چلی آ رہی ہیں
وہ پچھم سے اُٹھے اندھیرے کی پرچھائیاں سُرمئی پنکھ پھیلا رہی ہیں
وہ پورب میں میاتی بھیڑوں کے گلّے کے باڑے کے پہلو میں بکا الاؤ
مگر کالے کوسوں کی دشوار منزل کہے جا رہی ہے ابھی لوٹ جاؤ

شُبک چاند نے سُرمئی شام کی بھاری چلمن کو سرکا کے چہرا دکھایا
اداسی کے گرداب کے دائرے اور گہرے ہوئے جانے کیا یاد آیا
فضاؤں میں کچھ جانی پہچانی شکلیں ہیولوں کی صورت کہیں تیر آئیں
کسی نے سرِ صبح ڈیوڑھی پہ آ کر گئی شب کی ناشاد خبریں سنائیں

بایں چاکِ داماں بھی کنعاں کے یوسف سندیسے گئے ہی کیا کیا نہ لائے
مگر قلعۂ مصر کے اونچے برجوں کو زنہار زنہار جھکنا نہ آئے

یہ بالی کے بیلوں کی جوڑی کے گھنگرو چھنا چھن چھنا چھن بجے جا رہے ہیں
کہ یادوں کی ویران راہوں سے پھر دوستوں کے وہی قافلے آ رہے ہیں

شبِ ماہ میں گھومتے گاتے شعر سنتے سناتے سحر کرنے والے
وہ سرمست و آوارہ احباب اپنے وہ سپنوں کے لوبھی اُمنگوں کے پالے
کسی بحرِ زخار کی سیپیاں چنتے چنتے کہاں کھو گئے ہیں
کہاں کی جبینوں کے روشن چراغوں کی یادوں کے شعلے بھی مدھم ہوئے ہیں
ارے اونچے اونچے حریموں کے اوپر سے پرواز کرتے پرندوں کی ڈارو
سنو تو سہی کوئی دم کو ہمیں ساتھ لے جاؤ ان دوستوں میں اُتارو
مگر گاؤں کے جھونپڑوں کا دھواں جس میں رنگِ شفق تھوڑا سنولا رہا ہے
نگاہوں کی دوری کے پردے کی مانند دیوارِ محکم بنا جا رہا ہے

۲

مرے دل کے روشن جھروکے سے جھانکا ہے پھر ایک معصوم و شاداب چہرا
تصور مجھے تیرے مہجور جلووں کا خاموش پیغام دیتا رہے گا
اسے اپنی وحشت کی افتاد سمجھیں کہ پندارِ مجبور کی بے نیازی
بہت دن بساطِ جہاں پر رہے پر نہ ہر دیس نہ جیتیں کھیلی یہ بازی
رفیقوں نے اپنے مصافِ جہاں میں ولایات جیتی ہیں میدان مارے
مگر ہم تو ان سے بچھڑ کے لڑائی کے پہلے ہی میداں میں اپنے سے ہارے
کوئی آشنا آشناسی خلش پھر بھی مجبور کرتی ہے بولو نہ بولو
کہیں سے ہوئے دوست آنے لگی ہے ذرا من کی ڈیوڑھی کی کنڈی تو کھولو

بہت روز کی بات ہے سرد راتوں میں اندھے چراغوں کے سایوں میں لیٹے
کتابوں کے قصّوں کے حرفوں سے دنیا زمانے کے اسرار پوچھے تھے ہم نے
سنا تھا ہماری ہی رہ تک رہی ہیں پکھیرو کی پریاں سراپے سنوارے
مگر کوئی اپنے بلائے نہ بولا بہت نام لے لے کے ہم تو پکارے
کسی خضر فرخندہ صورت نے ہم کو نہ زنبیل بخشی نہ جادو سکھایا
نہیں تو زمانے کے کوہ ندا سے یہی ایک پیغام سننے میں آیا
نہ سینے سے آہوں کے بادل اٹھاؤ نہ آنکھوں سے اشکوں کے خوشے اگاؤ
جو محنت کرو اس کی اجرت بھی مانگو جو کھیتی کو جوتا ہے روٹی بھی کھاؤ

مگر آنے والے زمانے کے مرلن جو آئے تو باصد کرامات آئے
پرانے صحیفوں کے احکام عشرہ کو منسوخ کر کے نئے حکم لائے
کتابوں کے پیچیدہ لفظوں کا جادو بھی دھرتی کے بیٹوں کے سر چڑھ کے بولا
نئے ہادیوں نے نئے منبروں سے نئے آدمی پر نیا بھید کھولا
'سرِ طاق' چرخِ چہارم کے اوپر، دبیر ازل کے نوشتے دھرے ہیں
کہ جن میں بشر کے مقدر کے اعراب وا اوقاف تک مرقسم ہو چکے ہیں
جو چھوٹا ہے تحقیق چھوٹا رہے گا۔ بڑے ہی کے مقسوم میں ہے بڑائی
یہ کاوہ ہے باغی ابوذر فسادی یہ مزدک ہے کافر یہ لینن قسائی

۳

اُجالے کے خلّاق سورج کی رفتار تاروں سے یا کہکشاں سے چھپی ہے
تو پھر آج کی شام کیوں آنے والے سویرے کے وعدوں کو بھولی ہوئی ہے

ؔ کنگ آرتھر کے دربار کا جادوگر جس کا کردار ولن کا کردار ہے۔

اجلے اندھیرے کے طنّاز تارے طلسمات کیا کیا بُنے جا رہے ہیں
نئے بندی خانوں کی باڑوں کے کانٹوں میں وحشی خیالوں کو اُلجھا رہے ہیں

یونہی شب کے پہلے پہر کے مسافر بہر گام تازہ غزل گانے والے!
سلاسل کے لوہے کی سنگین صلابت کو شمع شبستاں پہ پگھلانے والے!

زمانے نے گیلی¹ غلاموں سے اب تک ہزاروں برس فاصلے طے کیا ہے
ہر اک گام پر یہ مسافر نے دیکھا کوئی بیسٹل² راہ روکے کھڑا ہے

زمیں زادگاں پر زمیں زادگاں نے کبھی تیر چھوڑا کبھی دام پھینکا
کبھی شہر و قریہ کو بلسن³ بنایا کبھی کشت و گلشن پہ نیپام پھینکا

کبھی اپنے طرّار بمبار بھیجے، کبھی اپنی جرّار فوجیں بڑھائیں
کبھی ٹینک در ٹینک بڑھ آئے ظالم مگر ایسے حق بات کہتی ہے سائیں!

کسی نے کہا اب اڑن چھتریوں سے قلم کے جیالے سپاہی اتارو
چلو چل کے مطلب کے میدان دیکھو چلو کچے ذہنوں پہ شب خوں مارو

فسانے بنو یہ نیا آدمی غاصبوں کے ہے کھل کھیلنے کا بہانا
کسی نے بہائم کے باڑے⁴ کا باسی کسی نے خداوند⁵ نا کام جانا

نیا آدمی بوڑھے آدم کا بیٹا کہاں تک بھلا خود کو حیران کرتا
سرِ بامِ چرخِ چہارم بھی پہنچا سرِ بالِ جبریل طیران کرتا

اسیرِ ازل نے دبیرِ ازل کے نوشتوں کی محفوظ تحریر بدلی
یہ بے باک و گستاخ و کافر تو ٹھہرا مگر ارض اسفل کی تقدیر بدلی

۱ GALLEY SLAVES ۲ BASTILLE فرانس کا مشہور قید خانہ جو انقلاب فرانس میں ٹوٹا
۳ نازیوں کا مشہور نظر بندی کیمپ ۴ جارج آرول کی اینمل فارم ۵ کرائین کی مرتبہ "گاڈ دیٹ فیلڈ"

کبھی ہوانگ ہو کے خروشاں بہاؤ کے تسخیر کرنے کو پشتے بنائے
کبھی آمو دریا کی پہنائی چیرے تو دشتوں کو فصلوں کے مژدے سنائے
ملوں کی مشینوں سے جا کے یہ مزدور، دھرتی کے کھیتوں کے بیٹے یہ ہالی
ہوئے تاشقند و بخارا کے سلطاں بنے کینٹن اور مکڈن کے والی

۴

ہمیں بھی ہوس تھی کہ آدرش کے محل ایسے بنائیں کہ ڈھائے نہ جائیں
سرِ عشق میں بے ستوں کوئی کاٹیں جنوں کو کسی نجد میں آزمائیں
کسی بحر میں لے کے نکلیں سفینہ تو پہنائے پاتال تک گھوم آئیں
وہ ہیروں کی وادی وہ مونگوں کے ٹاپو کہاں ہیں چلو ہمتیں آزمائیں
جو کنگال ہیں ان کو دھرتی کی دولت عنایت کریں مسندوں پر بٹھائیں
جو مزدور ہیں ان کو محنت کا حاصل جو دہقان ہیں ان کو کھیتی دلائیں
جو ناکام ہوں تو غزل خواں غزل خواں بڑھیں بہرِ پاداش بے خوف ہو کر
مریں تو مریں مثلِ گبرئیل پیری[1]، جئیں تو جہاں میں دمتروف[2] ہو کر

مگر دوستو دوستو دوستو! ہم جہاں سے چلے تھے ابھی تک وہیں ہیں
وہ آدرش کے محل تو ڈھا چکے، ان کے کھنڈرات میں غول بن کے مکیں ہیں
وہ پہلے سا وحشت کا عالم کہاں ہے ابھی سے یہ محسوس ہونے لگا ہے
افق سے افق تک بڑی منزلیں ہیں کراں سے کراں تک بڑا فاصلہ ہے
بہت جی میں آتی ہے یاروں سے کہہ دیں "ہمیں بھی پکارو ہمیں بھی پکارو"
مگر کالے کوسوں کی دشوار منزل کہے جا رہی ہے ابھی لوٹ جاؤ

[1] فرانس کا ایک انقلابی جو نازیوں کے ہاتھوں شہید ہوا۔ [2] مقدمۂ آتش ریشتاغ کا ہیرو

گرانی میں ہم شہرِ کنعاں کے سنیوں کے محلوں کے دیوار و در چوم آئے
جو سچ پوچھو اس میں بڑی عافیت ہے مگر قافلہ مصر کو کون ڈھائے

ہمیں گرد بن کر پسِ کارواں دھندلے دھندلکے قریوں میں پھرتے رہیں گے
ہمیں راستے کے ہر اک موڑ پر اک دو اک مزار پر یونہی تھمتے رہیں گے

مگر دور کی منزلوں کی یہ راہیں تو ویران اب تک ہوئی ہیں نہ ہوں گی
جری شہسواروں کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے انجان اب تک ہوئی ہیں نہ ہوں گی

سمجھتے ہیں ہم آنے والا زمانا تمہارا ہے لوگو ہمارا نہیں ہے
مگر اپنے پاؤں کرتھک سے گئے ——— آن میں اور آگے بڑھنے کا یارا نہیں ہے

یہی راستہ ہے رُکے تو گئے ——— رات لمبی ہو یا باٹ لمبی ہو جاؤ!
وہ پورب میں میاتی بھیڑوں کے گلّے کے باڑے کے پہلو میں ہے کالا الاؤ

"واقعہ یہ ہے کہ ابن انشا طبعاً ایک ترقی پسند شاعر تھے مگر ان کی ترقی پسندی تحریک، منشور اور پارٹی لائن والی ترقی پسندی سے مختلف تھی... ابن انشا نے اس موضوع کو جو بظاہر وقتی اور ہنگامی ہے اپنے شاعرانہ خلوص اور فن کارانہ ایمانداری کی بدولت جاوداں کر دیا ہے، مضافات، امن کا آخری دن، افتاد، شنگھائی کوریا کی خبریں، کوبے کی لڑائی وغیرہ کی نظمیں آج بھی شعریت سے معمور معلوم ہوتی ہیں۔"

خلیل الرحمٰن اعظمی

ابن انشا کو خراج عقیدت

ابن انشا

ایک ہدایت نامہ پیارے ہموطنوں کیلئے

ہم جب کبھی ملک سے باہر قدم نکالتے ہیں پیچھے کوئی نہ کوئی خرابی ہو جاتی ہے۔ لوگ ہماری غیر حاضری کا فائدہ اٹھانا شروع کر دیتے ہیں۔ ۱۹۶۸ء کے اواخر میں یہ سوچ کر کہ اب یہ ملک نوزائیدہ نہیں رہا، ماشاءاللہ بالغ اور ہوشمند ہو گیا ہے۔ ہم ایک دورے پر نکل گئے۔ سنگاپور بھی نہ پہنچے تھے کہ لڑکوں کے ہڑتالیں کرنے کی اطلاعیں آنے لگیں۔ ہم نے سوچا کوئی بات نہیں، نا سمجھ ہیں، ہم واپس جا کر سمجھا دیں گے لیکن ہانگ کانگ پہنچنے پر معلوم ہوا کہ بڑی عمر کے لوگ بھی بیانات دینے لگے ہیں، جلوس نکل رہے ہیں، لاٹھی چارج ہو رہا ہے، وغیرہ۔ یہ سچ ہے کہ ہم وہاں سے لوٹ آتے تو صورت حال کی اصلاح کر سکتے تھے۔ اس ملک میں کوئی ہمارے کہے سے باہر تھوڑا ہی ہے لیکن یہ ہمارے اصول کے خلاف ہوتا۔ ہم آگے قدم بڑھا کر پیچھے ہٹانے کے قائل نہیں، لہٰذا ہانگ کانگ سے ٹوکیو پہنچے، ٹوکیو سے سیول اور ہونولولو ہوتے ہوئے سان فرانسسکو جا وارد ہوئے۔ امریکہ سے سویڈن اور ترکی کے راستے واپسی تک حالات ہمارے ہاتھ سے نکل چکے تھے۔ گول میز کانفرنس کی بات ہونے لگی تھی۔ گول میز کانفرنس میں شریک ہونا بھی ہم نے پسند نہ کیا۔ یہ بھی ہمیں اپنے اصول کے خلاف نظر آیا۔ ہمارا اصول ہے کہ جہاں ہمیں کوئی نہ بلائے وہاں نہیں جاتے۔

خیر ہماری بات تو چھوڑیئے، تشویشناک خبریں سنتے تھے تو ہر بے عمل محب وطن کی طرح ملک کے حق میں دعا کر کے اپنے فرض سے سرخرو ہو جاتے تھے لیکن ہمارے ہمسفر فضل الباری صاحب کا معاملہ دیگر تھا۔ آپ مشرقی پاکستان کے وزیر صحت تھے اور ہمارے تین نفری وفد کے لیڈر، صحت ان کی خاصی خراب۔ ہمارے جو ہمرکاب تین ایرانی اور تین ترک تھے۔ وہ فقرہ بھی کس دیتے تھے کہ وزیر

صحت کسی اچھی صحت والے کو بنایا ہوتا۔ بلکہ بہتر تو یہی تھا نہ بنایا ہوتا۔ خیر یں سن سن کران کا ہاضمہ خراب ہوگیا اور منہ ذرا سا نکل آیا۔ شکاگو میں انھوں نے ہم سے کہا کہ ملک کی حالت خراب ہو رہی ہے۔ میری وزارت خطرے میں ہے۔ جب اوپر والا ہی نہ رہے گا تو ہم نیچے والے کیسے رہیں گے مجھے تو بار بار غسل خانے جانا پڑتا ہے۔ اب تم میری جگہ کام کرو۔ ہم نے مؤدبانہ کہا کہ ہم مشرقی پاکستان کے وزیر صحت نہیں ہو سکتے، ہمیں اس قسم کے کام کا تجربہ نہیں، آپ حوصلہ نہ چھوڑیں۔ بولے میں تم سے مشرقی پاکستان کا وزیر صحت ہونے کی فرمایش نہیں کر رہا، اس وفد کی بات کر رہا ہوں جو کچھ کرنا ہے تمہی کیا کرو۔ میں اب سویڈن اور ترکی وغیرہ بھی نہیں جاتا، واشنگٹن سے ہی رخت سفر باندھتا ہوں۔ نیویارک ہم ان کو زبردستی لے تو گئے لیکن وہ اپنے کمرے سے باہر نہ نکلے اور وہیں سے لندن کے ائرپورٹ پر پہنچتے ہی وہ ہم سے یوں جدا ہوئے کہ دعا سلام بھی نہ کی۔ ان کی وزارت کے ساتھ بھی مانند شیشہ دیگر ہمی مانند کی واردات ہوئی۔ گویا وہ سیاسی بصیرت سے ایسے محروم نہ تھے جیسے صحت سے تھے۔

چونکہ آج ہمیں سفر تازہ در پیش ہے لہٰذا ہم اپنے پیارے ہوطنوں کی رہ نمائی کے لئے ایک ہدایت نامہ چھوڑے جا رہے ہیں، ان کو چاہئے کہ سچے مسلمان بنیں، اگر ہماری موجودگی میں کسی وجہ سے نہیں بن سکتے تھے تو ہمارے بعد بنیں۔ سچ بولیں ——— پورا تولیں۔ قوم اور ملک کے لئے ایثار کریں۔ اس کے لئے وہ چاہیں تو ہماری مثال اپنے سامنے رکھ سکتے ہیں، ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ اپنی زندگی کو اسلام کے سانچے میں ڈھالیں۔ اسلام کو اپنی زندگی کے سانچے میں نہ ڈھالیں۔ رمضان شریف کی آمد آمد ہے۔ ہم تو خیر سفر میں ہیں اور ہم پر مسافرت کے احکام کا اطلاق ہوگا لیکن اہل وطن کو ہماری تاکید ہے کہ ایک تو رمضان شریف کے دوران شراب خانے بند رہنے چاہئیں جس کسی کے پاس ڈاکٹر کا سرٹیفکیٹ ہے کہ یہ شخص اگر نہیں پیئے گا تو اس کی صحت تباہ ہو جائے گی وہ چند بوتلیں ابھی سے خرید کر رکھ لے۔ جو لوگ شراب نہیں پیتے وہ یہ احتیاط کریں کہ دن میں ایسے ہوٹلوں میں نہ جائیں جو پردے نہیں گراتے۔ صرف ایسے ہوٹلوں میں جائیں جو رمضان شریف کے احترام کے آداب جانتے ہیں اور باہر نکلیں تو اچھی طرح منہ پونچھ کر نکلا کریں۔

ان اونچی باتوں اور موعظ حسنہ کے ساتھ بعض مقامی ہدایتیں بھی ضروری معلوم ہوتی ہیں۔ ہمارا علاقہ جیسا ہم چھوڑ کر جا رہے ہیں ویسا ہی ہمیں واپس ملنا چاہیئے۔ ناظم آباد کی بڑی سڑک کو توڑ کر چند ہفتے پہلے جو پتھروں کی ڈھیریاں لگا دی گئی تھیں وہ ہمارے آنے تک لگی رہنی چاہئیں وہ بہت اچھی رومانٹک معلوم ہوتی ہیں۔ ہم نے اپنے دوستوں اور ملنے والوں کو یہ شعر لکھ کر بھیجا کر

انہی پتھروں پہ چل کے اگر آ سکو تو آؤ

مرے گھر کے راستے میں کوئی راستہ نہیں ہے

پاپوش نگر کے قبرستان کے سامنے جو مین ہول کئی ماہ سے کھلے پڑے ہیں ان کو بھی بند کرنے کی کوشش نہ کی جائے کیونکہ کسی شخص کا مردہ ان میں سے نکال کر وہیں سامنے دفن کر دینا کہیں زیادہ کم خرچ ہے بہ نسبت اس کے کہ اس کا جنازہ اس کے گھر سے لایا جائے۔

کارپوریشن کے ہیلتھ افسر صاحب بھی نوٹ فرما لیں کہ علامہ اقبال ٹاؤن میں ہمارے گھر کے ساتھ جو کوڑے کا فلک بوس ڈھیر ہے وہ وہاں سے نہ ہٹے ورنہ ہم احباب کو اپنے گھر کی اور کیا نشانی بتایا کریں گے۔ اب تو لوگ دور دور سے بلا کسی سے دریافت کئے محض بو سونگھتے وہاں پہنچ جاتے ہیں۔

ادب اور آرٹ کے بارے میں بھی لوگ ہماری ہدایات کے منتظر ہوں گے۔ ہمیں اس بارے میں کچھ زیادہ نہیں کہنا۔ مشاعرے جاری رہنے چاہئیں تاکہ زبان کی صفائی ہوتی رہے۔ صفائی کا مطلب یہ نہیں کہ ادب کے میدان میں بالکل ہی جھاڑو دے دی جائے بلکہ صیقل کرنے کی طرف اشارہ ہے۔ آرٹ کونسل کو ہماری ہدایت ہے کہ تجریدی مصوری کی نمائش جاری رکھے تاکہ لوگوں کا دل ملکی مسائل سے ہٹا رہے جن پر غور کرنے کا ہمارے نزدیک کچھ فائدہ نہیں۔ ہم تجرید کے قائل آرٹسٹوں سے بھی زیادہ ہیں۔ ہماری رائے میں ہمارے آرٹ کو مجرّد ہونا چاہیئے۔ ہمارے ادب کو مجرّد ہونا چاہیئے۔ بلکہ ادیبوں، شاعروں اور آرٹسٹوں کو بھی مجرّد ہونا چاہیئے۔ اگر باقی لوگ بھی مجرّد ہوں تو ہمارے نزدیک اور اچھا ہے۔ ہماری سوچی سمجھی رائے میں آنے والی نسلوں کا فائدہ اسی میں ہے کہ وہ پیدا نہ ہوں۔

مسائل تو اور بھی رہے جا رہے ہیں مثلاً انتقال اقتدار کے مسئلے پر ہماری رائے، بیگوں کے ادغام

کے بارے میں ہمارے خیالات وغیرہ۔ لیکن اخبار میں ان پر لکھنا ٹھیک نہیں پیش رو کو بڑا حکیم ہرنام داس بی۔اے مصنف ہدایت نامہ خاوند، ہدایت نامہ بیوی، ہدایت نامہ والدین وغیرہ سب کچھ متن میں نہیں لکھ دیتے تھے بلکہ کتاب کے اندر ایک لفافہ رکھ دیتے تھے اور وہی پوری کتاب کی جان ہوتا تھا۔ ہم نے بھی مذکورہ بالا موضوعات پر لفافے تیار کر رکھے ہیں جو دس روپے کا منی آرڈر بھیج کر ہم سے مفت طلب کئے جا سکتے ہیں۔ دس روپے کی شرط اس لئے ہے کہ صرف ضرورت مند حضرات طلب کریں، ورنہ لوگ بے ضرورت بھی لے لیتے ہیں کہ مفت کا ہے اور پھر پھینک دیتے ہیں۔

"میرا حال سنو۔ ہر دو جہاں کا دھتکارا ہوا نکما آدمی ہوں دوست کوئی نہیں کہ چاندنی کی تنہائی والی راتوں میں ابتدائے سرما کی چاندنی میں اس لاکھوں کے شہر کی گلیوں میں ساتھ گھوم سکے۔ تمہیں اپنی نامرادی (جذباتی) کا قصہ سنانے کو جی چاہا پھر یاد آیا ــــ آہ نہ کر لبوں کو سی ــــ عشق ہے دل لگی نہیں۔ اب کے تم میرا حال پوچھنے کے جتن دکرنا۔ ار ستمبر کی رات جب روح کا دیپ بجھ رہا تھا آخری شعر یہ کہے تھے

اب ہم کو اجازت کہ ہوا وقت ہمارا
محفل سے کریں اہل محبت تو کنارا
اس گھر کے الٰہی در و دیوار سلامت
اس گھر میں کیا تیس برس ہم نے گزارا
انشا کو مری جان بہت یاد کرو گی
جاتا ہے فقط دل پہ لئے داغ تمہارا

خط مورخہ ۲۲ جنوری ۱۹۵۵ء سے اقتباس

"عصری ادب" جانے رومانی شاعر کو خراج عقیدت پیش کرتا ہے جو حسن، انسان دوستی اور مظلوموں کی حمایت کا رسیا تھا۔

ادارہ

محمد حسن

تہذیبی شناخت کا مسئلہ

۱۹۴۷ء میں برصغیر ہند کی تقسیم کی بدولت پاکستان وجود میں آیا۔ پاکستان برصغیر ہند کے مسلم اکثریت کے اکثر سالم اور دو منقسم شدہ صوبوں پر مشتمل تھا۔ تقسیم مذہب کی بنیاد پر فرقہ وارانہ علیحدگی کے اصول پر ہوئی۔

نئی مملکت کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ اپنا علیحدہ تشخص قائم کرنے کا تھا۔ کل تک یہی تمام صوبے تھے جو اچانک ۱۶ اگست ۱۹۴۷ء کی صبح کو پاکستان کہے جانے لگے تھے ان کی تمام تر خصوصیات علاقائی تہذیب کی بنیاد پر قائم تھیں جن میں ان علاقائی صوبوں کے رہنے والے غیر مسلم بھی بڑی حد تک شریک تھے۔ پھر تقسیم ہند کے ہمرکاب فرقہ وارانہ فسادات کی زبردست لہر نے پاکستان کی نئی مملکت سے غیر مسلم باشندوں کو ہندوستان کا رُخ کرنے پر مجبور کیا اور ہندوستان کے مختلف علاقوں سے خصوصاً مشرقی پنجاب، اتر پردیش، بہار، مدھیہ پردیش اور آندھرا پردیش سے بڑی تعداد میں مسلم مہاجرین پاکستان آبسے۔ اس طرح گویا پاکستان کی تہذیبی انفرادیت تین واضح اجزا میں بکھر گئی۔

۱۔ ان مسلم باشندوں کی علاقائی تہذیب جو پاکستان کہے جانے والے صوبوں میں ۱۹۴۷ء سے قبل ہی سے رہتے بستے آئے تھے اور ان میں سے اکثر یہیں پیدا ہوئے پلے اور بڑھے تھے۔

۲۔ ان مسلم مہاجرین کی تہذیب جو ہندوستان کے مختلف علاقوں سے اپنی علاقائی تہذیب کی خصوصیات کے ساتھ پاکستان میں آکر بس گئے تھے جن کی جڑیں پاکستان کے مختلف علاقوں کی علاقائی تہذیب میں پیوست نہیں تھیں۔ پرانے بسنے والوں کے اور ان کے درمیان قدرِ مشترک مذہب ہی فراہم کرتا تھا یا پھر تہذیب کا وہ حصہ مشترک تھا جسے مذہبی یگانگت نے پیدا کیا تھا۔

۳۔ وہ غیر مسلم باشندے جو پاکستان کہے جانے والے علاقوں ہی میں پیدا ہوئے پلے اور بڑھے تھے مگر فرقہ وارانہ فسادات یا ان کی دہشت کے باعث پاکستان سے ہجرت کرکے ہندوستان

آبسے تھے اور یہاں اپنی علاقائی تہذیب ساتھ لائے تھے۔ ان کی جڑیں پاکستان کے علاقوں کی علاقائی تہذیب میں پیوست تھیں گو وہ پاکستان سے دور زندگی گزار رہے تھے۔

تیسرے گروہ سے قطع نظر، پاکستانی معاشرے کو پہلے دو عناصر کو ہم آہنگ کرکے ایک وحدت میں پرونے اور اس وحدت سے ایک امتیازی انفرادیت پیدا کرنے کی مہم درپیش تھی۔ اس مہم کو دو شکلوں میں سر کرنے کی کوشش کی گئی۔ ایک گروہ نے اس وحدت کی کلید مذہب کو قرار دیا اور اسلامی معاشرے اور اسلامی ادب کا نعرہ دیا کہ ان کے نزدیک اسلام ہی وجہ امتیاز فراہم کرسکتا تھا۔ اس ضمن میں محمد حسن عسکری[1] کے مضامین کی بڑی اہمیت ہے جن میں کلچر میں مذہبیت کے عنصر کو بنیادی قرار دیکر اسے ادب کا جوہر بنانے پر زور دیا گیا۔

دوسری شکل پاکستانی کلچر یا پاکستانی ادب کی تھی جس میں پاکستان کی تعریف علاقائی خصوصیات کی بنیاد پر کی گئی تھی اور یہ اصول وضع کر دیا گیا تھا کہ برصغیر ہند و پاک میں دو بڑے دریاؤں کے گرد دو عظیم تہذیبوں کا عروج ہوا۔ ایک دریائے سندھ جس نے موہن جو داڑو اور وادیٔ سندھ کی تہذیب کو جنم دیا۔ دوسری دریائے گنگ و جمن کے دوآبے کی تہذیب، جس نے آریائی معاشرے کو پیدا کیا۔ پاکستانی معاشرہ ان کے نزدیک پانچ ہزار برس یا اس سے بھی زیادہ پرانا معاشرہ ہے اور اس کی روایات اس سے قبل تاریخ وادی سندھ کے کلچر میں پیوست ہیں۔ یہی کلچر پشتو، بلوچی، پنجابی اور سندھی تہذیبوں میں رونما ہوا اور علاقائی خصوصیات کی شکل اختیار کر گیا اور اسی کلچر کو پاکستانی کلچر کہا جا سکتا ہے اور پاکستان کے اردو ادب میں اسی کلچر کی نمائندگی ہونی چاہئے اسی لئے اردو میں علاقائی زبانوں کے الفاظ کھپانے اور اردو میں پنجابی لہجے کی پیوندکاری کی کوششیں ہوتی رہی جس کی نمایاں مثالیں ظفر اقبال کی شاعری میں ملتی ہیں۔[2]

یہ دونوں صورتیں اشکال سے خالی نہ تھیں۔ اگر ادب کی بنیاد اسلام کو قرار دیا جائے تو اول تو

---

[1] محمد حسن عسکری کے مضامین اور اس کے بعد فراق گورکھپوری کے جوابات سے پیدا ہونے والی بحث "نقوش" لاہور میں بھی کافی عرصے چلی تھی۔ [2] اس ضمن میں ڈاکٹر وزیر آغا کی کتاب "اردو شاعری کا مزاج" خصوصیت سے قابل ذکر ہے جس میں اردو شاعری کا رشتہ موہن جو داڑو سے جوڑا گیا ہے۔

دیگر اسلامی ممالک کے ادب اور پاکستان کے اسلامی ادب میں وجہ امتیاز کیا ہو، دوسرے اسلام کے کس تصور کو پیش نظر رکھا جائے اور اسے مولویانہ تقشف سے کس طرح علیحدہ کیا جائے جس کی وجہ سے غالباً حسن عسکری کو بھی آخر میں " اسلامی ادب " جیسے مضامین لکھنے کے بعد " ڈان اور قرآن " لکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ دوسری طرف علاقائیت کو بنیاد بنایا جائے تو اسلام کی گنجائش مرکزی تصور کی حیثیت سے ادب اور تہذیب میں بہت کم رہ جاتی ہے. تاریخ کا جو تصور سامنے آتا ہے اس سے ہندوستان میں مسلمان تہذیب کے سبھی کارنامے خارج قرار پاتے ہیں اور اس نقطۂ نظر کو انتہاپسندانہ حد تک قبول کرنے والوں کے نزدیک آخر کار راجہ داہر والی سندھ اور مہاراجہ رنجیت سنگھ والی پنجاب ان علاقائی تہذیبوں کے ہیرو قرار پاتے ہیں جو عام پاکستانی ذہن کے لئے قابل قبول نہیں۔ ان دونوں میلانات کی کش مکش پاکستانی کلچر اور ادب میں عموماً اور پاکستان کے اردو ادب میں خصوصاً ظاہر ہوتی رہی ہے۔

پاکستانی ادب کی یہ کش مکش دراصل کافی گہری اور پیچیدہ ہے جو تہذیبی پیوندکاری کے عمل سے پیدا ہوئی ہے۔ آریا ہندوستان آئے تو قبل آریائی تہذیب کی بعض نشانیوں اور علامتوں کو اپنا کر اس پر چھا گئے۔ عرب ایران پہنچے تو قبل اسلام دور کی ایرانی تہذیب اور ادب پر اس طرح غلبہ حاصل کر لیا کہ اس کا وجود ہی موہوم ہو کر رہ گیا۔ دہلی والوں کا قافلہ لکھنؤ پہنچا تو اپنے سے پہلے کی تہذیب کو حرف غلط کی طرح مٹا کر ایک نئے دور کا آغاز کر دیا۔ کچھ اسی قسم کی صورت حال[۱] پاکستان میں بھی درپیش تھی فرق یہ تھا کہ اول تو آنے والے مہاجرین کی تعداد اتنی زیادہ یا ایسی صاحب اقتدار نہ تھی کہ اپنے سے قبل کی تہذیب اور ادب کی وراثت پر غالب آسکتی۔ دوسرے ۱۹۴۷ء سے پہلے ہی سے ان علاقوں میں ترقی یافتہ تہذیبی اور ادبی روایات موجود تھیں جہاں یہ روایات کمزور تھیں

---

[۱] پاکستان کے اردو ادب کے علیحدہ تشخص کا مسئلہ میرے علم میں پہلی بار ن۔ م۔ راشد نے " سوغات " بنگلور کے نظم نمبر ۱۹۶۳ء میں چھیڑا تھا [۲] اس ضمن میں انتظار حسین کے مضامین بسلسلہ " ہجرت " مطبوعہ رسالہ " معیار " دہلی ۱۹۷۷ء جمیل جالبی کی کتاب " پاکستانی کلچر " اور رئیس امروہوی اور جون ایلیا کے مضامین دیکھئے۔

پاکستان کے تہذیبی نقطۂ نظر کو سمجھنے کے لئے فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں کی کتاب FRIENDS; NOT MASTERS ڈاکٹر مبشر حسین کی کتاب " شاہ راہ انقلاب " خصوصیت سے مطالعے کے قابل ہیں۔

وہاں نئے آنے والے مہاجرین نے اس علاقے کو اپنے رنگ میں رنگ دیا جیسے سندھ خصوصاً کراچی میں جہاں پہلے کی سندھی آبادی میں مسلمان اہل تمول کی کمی تھی مگر پنجاب میں صورت اس سے مختلف تھی۔ اس لحاظ سے مہاجر اثر علک گیر پیمانے پر کوئی نیا تہذیبی پیکر بخشنے میں کامیاب نہیں ہو سکا اور اسے علاقائی تہذیبوں سے اثر قبول بھی کرنا پڑا۔

لسانی اعتبار سے اس علاقے کی زبانوں میں رسم خط کی سطح پر نقطۂ اشتراک موجود تھا۔ پنجابی گورمکھی رسم خط میں لکھی جاتی تھی، مگر اسی کے ساتھ ساتھ اس نے عربی، فارسی رسم خط کو بھی رائج رکھا تھا پشتو اور سندھی تو اس رسم خط سے پہچانی جاتی تھیں۔ عربی، فارسی الفاظ کی تعداد بھی ان زبانوں میں برعظیم کی دوسری زبانوں کے مقابلے میں زیادہ تھی اور ادبی روایات کے اعتبار سے بھی ان کا رشتہ عرب ایرانی روایات سے زیادہ قریبی تھا۔ درحقیقت جن روایات کو اسلامی قرار دیا جا رہا تھا وہ ترک ایرانی تہذیب کے عناصر اور اثرات سے عبارت تھیں۔ پاکستان ان علاقوں سے عبارت تھا جہاں یہ ترک ایرانی اثرات برصغیر میں سب سے پہلے اور زیادہ گہرے اور محیط تھے۔ ان اثرات کی مہیا کردہ مشترک بنیاد پر زور دے کر پاکستانی مفکروں کا ایک گروہ نیا ثقافتی تشخص فراہم کرنا چاہتا تھا۔ لیکن ان اثرات کو ان کے نسلی اور جغرافیائی یا علاقائی نام سے یاد کرنے کے بجائے اسے اسلامی کہنا پسند کرتا تھا گو لفظ اسلام کی توجیہہ انھیں ایک طرف دوسرے اسلامی ممالک سے متمیز کرنے میں ناکام ہوتی تھی اور دوسری طرف اسلام کے مختلف تصورات انھیں فقہی اور مولویانہ موشگافیوں میں اُلجھانے کے خطرات سے خالی نہ تھے۔

پاکستان میں اردو ادب تین مرکز ثقل کے درمیان تھا۔

—— ایک اسلامی محور۔ یہ پاکستانی ادب کا رشتہ مغربی ایشیا کی تہذیبوں سے ملاتا تھا اور ادب میں دقیق فارسی اور عربی الفاظ کے دخول کا قایل تھا۔ اس کی مثال عبدالعزیز خالد کی طویل نظموں کے اسلوب میں ملتی ہے۔

—— دوسرا علاقائی محور۔ یہ پاکستانی ادب کا رشتہ پنجابی، سندھی اور پشتو ادب سے جاملاتا تھا اور ادبی اسلوب میں علاقائی زبانوں کے الفاظ شامل کرکے ایک نئے لہجے کی داغ بیل ڈالنا چاہتا تھا جس کی مثال ظفر اقبال اور شیر افضل خاں کی شاعری میں ملتی ہے۔

۔۔۔ تیسرا تاریخی محور:۔ یہ اپنا رشتہ برصغیر کی تہذیبی تاریخ سے ملاتا تھا اور ہندوستان کی وسطی دور کے تہذیبی آمیزے کو اپنی وراثت میں شامل کرتا تھا جس کی مثالیں ناصر کاظمی کی میر پسند شاعری اور انتظار حسین کے اسلوب اور موضوعات میں اور جمیل الدین عالی کے دوہوں میں ملتی ہیں۔

یہ یاد رکھنا مفید ہوگا کہ پاکستان کا برصغیر سے کٹ کر ایک الگ ملک کی شکل اختیار کرنا بھی دراصل ایک حادثہ نہ تھا۔ ایک وسیع تر برصغیر میں پاکستان کے مطالبے کی آواز اس وقت ابھری جب برصغیر ہند کا بورژوا طبقہ جاگیرداری دور سے سرمایہ داری کے دور میں قدم رکھنے کے لئے بے قرار تھا اور اس تبدیلی کے عمل میں لازمی طور پر اس مذہبی یا تہذیبی اقلیت کو اپنا وجود خطرے میں نظر آنے لگا جس کی معیشت کی بنیاد جاگیرداری اور اس کی پس ماندہ تہذیب پر تھی۔ ہندوستانی مسلمانوں کے متوسط طبقے پر اس کا اثر دوسروں کی نسبت زیادہ گہرا تھا اس لئے پاکستان کے قیام میں یہ مصلحت بھی مضمر تھی کہ جاگیرداری اور اس کی پس ماندگی کو ایک پناہ گاہ مل گئی۔ اس لئے یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ ہندوستانی تہذیب کے جن اجزا نے یہاں عافیت پائی وہ جاگیردارانہ تہذیب کی پسماندگی کا حصہ تھے اور اس تہذیبی پس ماندگی کو پاکستان نے احترام دے کر اسے بورژوا زندگی کے ٹکراؤ سے بچانے کی کوشش کی۔ ہندوستان میں ارباب اقتدار جاگیرداری پس ماندگی کی پیوندکاری صنعت کاری کے نظام سے کرتے رہے۔ پاکستان میں ارباب اقتدار اور ان کے جاگیردارانہ حمایتی دلالی ہی پر قانع ہو گئے اور دلال بورژوائی نظام ہی سے فیض یاب ہونے کو ذریعۂ کمال جاننے لگے۔ اس سے ایک طرف او پری سطح پر درآمد کی ہوئی مصنوعات اور دولت کا فیض اعلیٰ تر طبقوں میں عام ہوا۔ دوسری طرف نچلے طبقے صنعتی دور کی برکتوں تک سے محروم رہ گئے۔ تہذیبی پس ماندگی کا یہ وجود اور اس سے ذہنی وابستگی کی حقیقت کو پاکستانی ادب کے مطالعے کرتے وقت فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

پاکستان کا اردو ادب

تنقیدی جایزہ

پاکستان کے اردو ادب کے بارے میں کچھ عرض کرنے سے پہلے نارسائی کی معذرت ضروری ہے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد سے کچھ عرصے تک تھوڑے بہت ادبی رسالے اور مطبوعات ہندوستان میں ملتی رہیں۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد عنقا ہوگئیں اور ۱۹۷۱ء کے بعد سے اب تک کہ ۱۹۷۸ء ہے صورت حال یہی ہے کہ کبھی کبھار پاکستان کے رسالے سرحد پار آجاتے ہیں اور گنی چُنی چند مطبوعات یہاں مل جاتی ہیں۔ ایسی صورت میں پاکستان کے اردو ادب کا کوئی تفصیلی یا اطمینان بخش تنقیدی جایزہ ہندوستان میں ممکن نہیں۔

تصویر کا دوسرا رُخ یہ ہے کہ جتنا کچھ اور جیسا کچھ بھی ملے اس کے تذکرے کے بغیر اردو ادب کی داستان مکمل نہیں ہوتی اس لئے نارسائی کے شکوے کے باوجود جغرافیائی اور سیاسی سرحدوں کو دھندلا کر تقسیم کی لکیر کے اس پار کے ادب کا ہلکا اور نا تمام ہی سا سہی نقشہ ضرور پیش نظر رکھنا ہوگا۔

ایک اور دشواری نقطۂ نظر کی ہے۔ ہندوستان کے اردو داں پاکستان کی تہذیبی اور فکری فضا سے پوری طرح واقف نہیں نہ وہ محرکات ان کے سامنے ہیں جنھوں نے پاکستان کے اردو ادب کو جنم دیا، نہ وہ نظریاتی اور جذباتی تقاضے ان کے پیش نظر ہیں جو اس ادب کے ذریعے پورے ہو رہے تھے۔ وہ تو اردو ادب ہی کے پس منظر میں پاکستان کے ادب کو بھی ...... پرکھے گا اور اس کی تنقید میں دوسروں کو جو بھی کوتاہی نظر آئے وہ کم سے کم اس نقاد کے لئے جواز سے خالی نہ ہوگی۔

پاکستان میں اردو ادب کا جایزہ لیتے وقت دو تقسیمیں ناگزیر سی ہیں ایک زمانی دوسری

مکانی۔ زمانی اس لئے کہ ۱۹۴۷ء سے پہلے ہندوستان اور پاکستان ایک ہی ملک کے دو حصے تھے اور بعض تہذیبی اختلافات کے باوجود دونوں میں ایک ہی سیاسی اور اقتصادی نظام کارفرما تھے، دونوں ایک ہی برطانوی سامراج کے زیر نگیں تھے اس لئے ان حالات نے جو یک جائی اور یکسانیت پیدا کی اس کی گونج دیر تک سنائی دیتی رہی گو بعض آوازیں اس یکجائی اور یکسانیت کی روکو روکنے کی کبھی ناکام اور کبھی کامیاب کوششیں کرتی رہیں

تقسیم ہندوستان کے فوراً بعد یہ دونوں رویے ابھرے۔ ایک طرف تو لاہور ترقی پسند تحریک کا مرکز تھا اور احمد ندیم قاسمی، احمد ریاض، ظہیر کاشمیری کی شاعری۔ اے حمید، ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور کے افسانے اور ممتاز حسین اور عبداللہ ملک کی تنقیدیں تقسیم سے پہلے کی ترقی پسند تحریک کا ایک تسلسل ہی لگتی تھیں۔ "سویرا" اور "ادب لطیف" کی آوازیں دراصل ترقی پسند تحریک ادب ہی کی آوازیں تھیں۔ اور ایسا لگتا تھا کہ دو ملک اور دو معیشتوں میں بٹنے کے باوجود دونوں ملکوں کے دانش ور ایک ہی قسم کے نیم جاگیردارانہ نیم سرمایہ دارانہ نظام کی دوغلی پالیسی اور دوغلی تہذیبی پیوند کاری کے خلاف نبرد آزما ہیں۔

تقسیم ہندوستان کے فوراً بعد فسادات کا سلسلہ شروع ہوا اور فسادات کی طرف رویے نے اس کا موقعہ بھی فراہم کیا کہ بعض دانش ور اور نقاد پاکستان کے اردو ادب کے لئے نئی پہچان کی بنیاد ڈھونڈھیں اور اسے برّ اعظم کی قدیم ترادبی اور فکری روایت سے توڑ کر ایک نیا رخ دینے کی کوشش کریں۔ اس ضمن میں ممتاز شیریں، صمد شاہین اور ان کے رسالے "نیا دور" اور پھر محمد حسن عسکری کے مضامین کا ایک اہم مقام ہے۔ ممتاز شیریں کا اعتراض یہ تھا کہ فسادات کے بارے میں لکھتے ہوئے ترقی پسند ہندو اور مسلم ادیب ترازو کے دونوں پلڑے برابر رکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے فسادی گروہوں پر ان کی ذمہ داری ڈالتے ہیں۔ اس ضمن میں کرشن چندر کی کتاب "ہم وحشی ہیں" اور خصوصاً اس کی ایک کہانی "پشاور ایکسپریس" کا حوالہ دیا گیا۔ مقصد یہ تھا کہ دراصل جس ایک طبقے (گروہ) کی ذمہ داری ہو اسی کو ٹوکا جائے جس کا مطلب یہ ہے کہ

ــــہ نام آگے بھی آئیں گے۔ یہ نام محض مثال کے طور پر دیئے گئے ہیں اس لئے اکثر ناموں کے شامل نہ کئے جانے سے غلط فہمی پیدا نہ ہونی چاہیئے۔

پاکستان کے اردو ادب اپنی حکومت کے ہم نوا ہوکر ہندو غنڈوں کو فسادات کا ذمہ دار قرار دیں اور ہندوستان کے اردو ادب اپنی حکومت کے ہم نوا ہوکر مسلمان غنڈوں کو۔ یہ شاید پہلی بڑی لطیف کوشش ادیبوں کو اپنے اپنے ملک کی حکومتوں کو پیچھے کھڑا کردینے کی تھی۔ گو کہ ترقی پسند ادیب کم سے کم اس وقت تک اپنی اپنی حکومتوں کی صف آرائی میں شریک اور حمایتی نہیں تھے۔

دوسری سطح پر محمد حسن عسکری کے مضامین نے اس مسئلے کو اٹھایا۔ انھوں نے ایک طرف تو 'اسلامی ادب' کا تصور پیش کیا جو گویا ہندوستان کی ادبی روایت سے یکسر رشتہ توڑ کر دوسرے اسلامی ممالک سے ایک نیا نظریاتی ربط پیدا کرنے کا جواز تھا۔ دقت اس میں یہ تھی کہ اول تو اس قسم کی 'مذہبیت' کو ادب کی بنیاد بنانے کا مشورہ دینے کے لیے حسن عسکری جیسے غیر 'ملّا' نقاد پوری طرح موزوں نہ تھے اور دوسرے یہ کہ جن اسلامی ملکوں سے ربط پیدا کرنے کا مشورہ دیا جا رہا تھا ان کے پاس کوئی ایسی عظیم الشان توانا ادبی آواز موجود نہ تھی جو اس قسم کے ادب کی آبیاری کرسکے۔ محمد حسن عسکری نے دوسری طرف ترقی پسند تنقید کے نظریات کا بطلان وجدانی اور تاثراتی سطح پر کرنا چاہا اور اس کاوش میں فرائڈ کی تحلیل نفسی سے لے کر فرانسیسی انحطاط پسندوں تک کے نظریوں کا سہارا لیا۔

اس نئے تنقیدی لب و لہجے کا اثر پڑا۔ عقل اور استدلال کی سطح پر ادب کے جن سماجی رشتوں کو کاٹنا ممکن نہ تھا وجدان اور فنی آزادی کے نام پر انھیں نظرانداز کرنے کی کوشش ہونے لگی اور پاکستان کے ادبی تنقید ہندوستان کے اردو ادب سے کہیں پہلے فن برائے فن، ہئیت پرستی اور تاثریت کی طرف قدم بڑھانے لگی۔ اس صورت حال کو پروان چڑھانے میں سیاسی حالات نے بھی مدد کی۔ ترقی پسند تحریک پر پابندی لگ گئی، اشتراکیت شجر ممنوعہ ٹھہری، فیض اور سجاد ظہیر راول پنڈی سازش کے مقدمے میں ماخوذ ہوئے۔ ان حالات میں ہر دانش ور کو اپنی پیشانی سے ترقی پسندی کا داغ دھونے کی فکر تھی اور عوامی تحریکوں کے کمزور پڑ جانے سے کسی انقلابی مستقبل کی طرف سے مایوسی عام ہوگئی۔

اس سنگین صورت حال نے تخلیقی سطح پر ایک اور آہنگ بھی پیدا کیا جس نے شاعری میں فیض کے لہجے کے نام سے دوام پایا۔ فیض نے غم کے بے پناہ اندھیروں سے ایک نئی کرن ڈھالنے کا فن ایجاد کیا۔ فیض کی شاعری خصوصاً غزلوں میں غم سے حاصل کردہ یہی صلابت اور

بانکپن ہے جو افوکھے پیرایۂ بیان میں ڈھل کر بے مثال بن گیا ہے۔ دوسری طرف ابن انشا کا چاند نگر تھا جس نے اپنا رشتہ پوری دنیا کے مظلوموں اور محکوموں سے کچھ اس طرح ملایا کہ شعری تجربہ ذاتی دستاویز سے زیادہ سچی اور بے ساختہ بن گیا اور پھر یہ تجربہ میر کے لہجے میں ڈھالا گیا اور اردو غزل کے قلندرانہ مزاج سے آمیز کیا گیا۔ اسی سلسلے کی ایک تیسری کڑی تھی جعفر طاہر کی طویل نظم جس میں چار درویشوں کی زبانی دنیا کے چاروں کھونٹ کی کہانی اس شکوہ اور شعری کیفیت کے ساتھ بیان ہوئی کہ پوری تاریخ اور تہذیب عصر حاضر کا زندہ تجربہ بن گئی۔ اسی روایت کا ایک جزو عبداللہ حسین کا ناول "اداس نسلیں" بھی ہے جو غم کو تپا کر کندن میں ڈھالتا ہے اور پھر یہ کندن سارے دیے کچلے انسانوں میں بکھیر دینے کے درپے ہے۔

مگر تخلیقی روایت کی سطح پر اس نئے آہنگ کا ظہور یہاں محض جملۂ معترضہ کے طور پر کیا گیا ہے یہ حقیقت ہے کہ اس صحت یاب، تابناک تخلیقی آہنگ کو تنقیدی حمایت نہ ملی۔ ممتاز حسین کے علاوہ کوئی اس آہنگ کا مزاج شناس نہ تھا اور ممتاز حسین نے نہ جانے کیوں اپنے کو عملی تنقید کے سانچوں کو متاثر کرنے کی اس جدوجہد سے بہت کچھ الگ رکھ کر کلاسیکی تنقید پر توجہ صرف کرنا مناسب سمجھا اور اس سلسلے میں اہم اور نتیجہ خیز کارنامے سرانجام دیئے۔ مثلاً 'باغ و بہار' کا دیباچہ، 'غالب ایک مطالعہ' اور 'امیر خسرو'۔ مجتبیٰ حسین، مظفر علی سید اور نظیر صدیقی کی تنقیدی نگارشات کی بھی یقیناً اس سلسلے میں بڑی اہمیت ہے لیکن ان میں سے کوئی بھی تخلیقی مزاج میں اہم تبدیلی پیدا کرنے یا نئی تخلیقی سمت دینے میں غیر معمولی کامیابی حاصل نہیں کر سکا۔

ممتاز حسین نے کلاسیکی ادب کو ایک نئے زاویے سے دیکھنے کی کوشش کی۔ 'مطالعۂ غالب' میں ان کے یہ بیانات نہایت اہم اور بلیغ ہیں جس کی معنویت کو مزید شرح و بسط کی ضرورت ہے:

> "جو شے کو شعر بناتی ہے وہ شخصیت نہیں بلکہ شاعر کا شعری عمل ہے۔ فن کی معروضیت کو تسلیم کیے بغیر حسن ادا کا مسئلہ حل ہی نہیں ہو سکتا۔"

> "شاعری اظہار ذات نہیں بلکہ عرفان ذات کا اظہار ہے۔ عرفان تمام تر ادراک کی شے ہے خواہ وہ ادراک تحلیلی عقل کا ہو یا ترکیبی عقل کا۔ چنانچہ اس نسبت سے ہر شاعر...... کاشف راز حیات یا مفکر بھی ہوتا ہے جو شے شاعر کو مفکر سے بلند کرتی ہے وہ یہ ہے کہ عرف عام کا مفکر یا فلسفی عموماً عقل کی تجرید سے گفتگو کرتا ہے وہ اپنی دانش کو

جو اس کی شہادت سے مضبوط نہیں کرتا اس کے برعکس اگر وہ واقعی شاعر ہے اور ناظم نہیں ہے تو وہ اپنی ہر رائے کی توثیق میں دل و جگر کو بہ حیثیت گواہ کے طلب کرتا ہے اور جہاں یہ گواہی نہیں ملتی وہ وہاں اپنی رائے معرض شک میں لاتا ہے۔"

(غالب ایک مطالعہ صفحہ ۱۱)

مجتبیٰ حسین نے نوا راتخ ترمی ز ن نکے معرکۃ الآرا مقالے کے بعد اپنے تنقیدی مضامین کا مجموعہ بھی شامل کیا اور نظیر صدیقی نے تنقید کو تاثرات سے تراکیب دے کر رشید احمد صدیقی کے توانا اور لطیف اسلوب کو تنقیدی مقاصد کے لئے استعمال کرنے کی خاطر دو مجموعے شائع کئے مظفر علی سید کے کئی اہم اور خیال انگیز مضامین چھپے جن کی گونج ہندوستان کی اردو ادبی دنیا تک پہنچی مگر ان کے کسی مجموعے تک رسائی نہیں ہوئی۔ البتہ ایسا لگتا ہے کہ اس سنجیدہ، متوازن اور معقول تنقید کی آواز مدھم رہی۔

ان کے پہلو بہ پہلو وہ دبستان تنقید تھا جس کی بنیاد تدریسی تقاضوں پر تھی۔ اس قسم کی تنقید کی خدمات کو نظرانداز کرنا مناسب نہ ہوگا لیکن اس تنقید کا اقدار کی تبدیلی یا تخلیقی تصورات کو متاثر کرنے میں بہت محدود حصہ رہا ہے۔ ڈاکٹر سید محمد عبداللہ، وقار عظیم، ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر وحید قریشی، ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر احسن فاروقی کی اکثر تصانیف اس ضمن میں آتی ہیں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے تحقیق اور تنقید کے باہمی رشتوں پر زور دے کر کلاسیکی سرمائے کے تجزیے کو ایک نیا رخ دینے کی کامیاب کوشش کی جس کی مثال نقد میر کے آخری مقالے میں ملتی ہے۔

ان دونوں مکاتیب تنقید کے پہلو بہ پہلو اور شاید ان دونوں سے زیادہ مؤثر طرزِ تنقید وہ تھا جس کا آغاز صمد شاہین، ممتاز شیریں اور محمد حسن عسکری کی تحریروں سے ہوا تھا۔ اسلامی ادب کا نظریہ تو زیادہ نہیں چلا لیکن ادب کے رشتے کو فکر اور سماج سے تقریباً منقطع کرنے یا ان پر سوالیہ نشان لگانے کا رجحان پنپا اور پروان چڑھا۔ اس روایت میں دو اہم نام سلیم احمد اور وزیر آغا کے ہیں۔ سلیم احمد نے شاعری میں پورے آدمی کا سراغ لگانا چاہا اور وہی پورا آدمی تھا جس کی نشان دہی حسن عسکری "آدمی اور انسان" میں کر چکے تھے۔ مقصد یہ تھا کہ ادب کو سماجی انسان یا سماج سے جڑے ہوئے انسان کی تصویر کشی کرنے کے بجائے سماج سے کٹے ہوئے انسان کی داخلی دنیا اور ہو سکے تو جنسی دنیا (جنس اور متعلقات جنس) کی تصویر کشی کرنی

چاہیئے۔ تنقید کی زبان بھی زیادہ تھی، تاثراتی بلکہ انشائیہ اور پھبتی کی سطح پر اترآئی اور تنقید رائے زنی اور جملہ بازی سے قریب آنے لگی۔

وزیر آغا نے تنقید کو ایک طرف تو ARCHTYPE اور تہذیبی قدامت والے سانچوں کے ذریعے سمجھنے کی کوشش کی تو دوسری جدیدیت کی اس لہر کی ترویج کی جو شاعری اور فن کو معاشرے سے ٹوٹے ہوئے انسان کے بکھراؤ کا اظہار سمجھنے پر زور دے رہی تھی۔ اردو شاعری کے مزاج کا رشتہ وزیر آغا نے چینی تصورات اور موہن جو داڑو اور قبل آریائی تہذیبی سانچوں سے جوڑ دیا جس کی بنیاد دلایل سے زیادہ قیاس پر یا مفروضہ نسلی مماثلتوں پر ہے۔ نئی شاعری میں ALIENATION اور ذات کے بکھراؤ اور معاشرے اور فرد کی باہمی آویزش کی مختلف شکلوں پر وزیر آغا نے زیادہ زور دیا۔

حال ہی میں پاکستان میں اردو تنقید بعض نئے ناموں سے آشنا ہوئی ہے۔ سجاد باقر رضوی ALIENATION اور ذات کے بکھراؤ والے ہئیت پرستانہ رویے پر زور دیتے ہیں۔ جمیل جالبی کو ایلیٹ کے مضامین کے مترجم کی حیثیت سے معروف ہو چکے ہیں۔ لیکن پاکستانی کلچر اور تاریخ ادب اردو کی اشاعت سے انھیں تنقید اور تحقیق کے میدان میں لا کھڑا کیا ہے۔ جمیل جالبی عصر حاضر کے تخلیقی تجزیے کی طرف زیادہ توجہ نہیں کر سکے ہیں لیکن ان کی تاریخ ادب کی پہلی جلد اور ارسطو سے ایلیٹ تک کے تنقیدی مضامین کا انتخاب سنجیدہ تنقید کو یقیناً متاثر کرے گا۔ محمد علی صدیقی نئی نسل کے ان نقادوں میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں جو ترقی پسند اقدار کی نئی توجیہہ و تعبیر میں مصروف ہیں۔

پاکستان میں اردو تنقید جہاں فنی اور وجدانی پہلو پر زیادہ زور دے رہی ہے وہاں ادب کی سماجی توجیہہ سے اس کا رشتہ بہت کچھ کمزور پڑا ہے اور یہ کمی تخلیق پر تنقید کی اثراندازی کے کم ہونے سے بھی ثابت ہوتا ہے۔ گو اس میں شک نہیں کہ عصر حاضر میں بھی غالب پر مجنوں گورکھپوری کی کتاب شائع ہوئی ہے اور اس دور کی تنقیدی فتوحات میں یہ کتاب منفرد بھی مگر کسی طرح تنہا نہیں ہے۔

شاعری میں پاکستان کے اردو ادب نے اپنی نئی جہات تلاش کرنے کی کوشش کی ہے محض

پاکستان کی جہات نہ تھیں ان میں سے بعض کی جھلک ہندوستان کی اردو شاعری میں بھی ملتی ہے۔

نئی غزل میں یہ حسیّت پہلے ابھری۔

پاکستان میں اس حسیّت کے کئی روپ تھے۔ ایک تو وہ مہاجر شعرا تھے جو ہندوستان کے مختلف قصبات اور شہروں سے، ہجرت کر کے پاکستان پہنچے تھے ان میں سے بڑی تعداد اُتر پردیش کے قصبوں یا پُرانی دہلی کے محلوں کے رہنے والوں کی تھی جو پاکستان کی سماجی فضا کو مہاجر کی نظر سے پرتال رہے تھے انھیں اپنا کھویا ہوا ماضی کا محاورہ عزیز تھا جس پر جاگیردارانہ تہذیب کی سُست روی، شائستگی اور حفظِ مراتب کے نشانات تھے اور جنوں، پریوں کے قصے پرانی داستانوں کی فضا اور اقدار و عقاید کی قدیم ذخیرہ گاہیں ابھی تک سایہ کئے ہوئے تھیں۔ افسانے میں اس رجحان کا نام تھا انتظار حسین۔ تو اردو غزل میں اس نازک لطیف اور نرم گوشے کا نام تھا ناصر کاظمی۔ جو شاید پاکستان کی اردو غزل میں فیض کے بعد سب سے بڑا نام ہے۔ ناصر کاظمی کے نزدیک غزل پر میر کا سا وقت پھر پڑا تھا اور اس لئے اس للکار سے میر ہی کی سی لَے ابھرنا لازمی سی تھی۔ ناصر کے الفاظ میں "میر کا ذکر اس لئے کرتا تھا کہ ایک خاص فضا میں پاکستان بننے کے بعد میر کے کلام کی گویا RELEVANCE سی ہو گئی تھی"۔ ناصر نے اردو غزل کو ٹھنڈک اور نرمی دی اور تشنج اور مقابلے سے تپتے ہوئے جدید معاشرے میں اس ٹھنڈک نے بڑا سکھ پہنچایا خصوصاً اس وقت جب ترقی پسند غزل کلاسیکی سانچے میں قوت اور حرارت، آگ اور شعلے پیدا کر رہی تھی۔ ناصر نے غزل کو نجی سی بات بنا لیا جس میں ساری امیجری اور لہجہ قصباتی زندگی کی نرم رفتار زندگی سے مستعار تھا۔ ؎

اُداسی بال کھولے سو رہی ہے — ہمارے گھر کی دیواروں پہ ناصر
چاند نکلے تو پار اُتر جائیں — رین اندھیری ہے اور کنارہ دور
کوئی چپکے سے پاؤں دھرتا ہے — دھیان کی سیڑھیوں پہ پچھلے پہر
آئے ہیں اس گلی میں تو پتھر ہی لے چلیں — کچھ یادگارِ شہرِ ستم گر ہی لے چلیں

غزل کا یہ نیا آہنگ پاکستان میں بہت کچھ پھلا پھولا۔ ناصر کی کوشش غزل کو ایک تہذیبی دستاویز کی فضا دینے کی تھی اور یہ کوشش بڑی حد تک کامیاب ہوئی۔

ایک اور اہم کوشش ابن انشا کی تھی جنھوں نے غزل کو میر کی نرمی اور سُبک گامی تو دی

مگر اس کے دائرۂ فکر کو بہت بڑھا دیا اور اس کا دامن عالمی آگہی سے جا ملایا۔ ابن انشا کی کوشش اپنی شاعری کو اپنے اور قارئین کے درمیان ایک مانوس اور بھرے پورے کنبے کی حیثیت سے متعارف کرانے کی تھی اور ان کے پڑھنے والے ان کے محبوب ہی سے نہیں۔ انشا جی اور ان کے جوگ بروگ سے بھی ایسے قریبی جان پہچان رکھتے ہیں کہ ان کی ہر غزل گویا مانوس لمحوں کی دہلیز معلوم ہوتی ہے۔ یہ کیفیت انوکھی ہے اور شاید ابن انشا ہی کی غزل تک محدود ہے۔ نجی اور مکالماتی طرز کا ایسا بے محابا استعمال شاید ہی کسی اور سے بن پڑا ہو:

اس شہر کے لوگ بڑے ہی سخی بڑا مان کریں درویشوں کا
پر تم سے تو اتنے برہم ہیں کیا ان سے مانگ لیا تم نے

سچ اچھا پر سچ کے لئے کوئی اور مرے تو اور اچھا
تم کوئی منصور ہو جو سولی پہ چڑھو، خاموش رہو

اس سلسلے کی اہم کڑی ظفر اقبال کی شروع کی غزلیں ہیں جن سے انوکھی تازگی اور شگفتگی تھی جیسے غزل نے روایت کی ساری تکان اور فرسودگی دھو ڈالی ہو اور نئی امیجری اور نئے سماں کے ذریعے نئے نویلے پھول کی طرح کھل اٹھی ہو۔ مگر ظفر اقبال اپنے اس تجربے کو بہت دور تک لیکر نہیں چلے اور بھٹک کر کرتب بازی کی نظر ہوگئے۔ ؎

میں بکھر جاؤں گا زنجیر کی کڑیوں کی طرح
اور رہ جائے گی اس دشت میں جھنکار مری

اس کے بعد کے رنگ و آہنگ کی پہچان بھی دشوار نہیں مگر چہرے نہیں پہچانے جاتے۔ صرف تین چہرے دوسرے خوش گو، خوش نوا چہروں کے انبوہ سے ابھرتے ہیں اور وہ ہیں احمد فراز، ناصر شہزاد اور احمد مشتاق۔ تینوں کے تین رنگ ہیں۔ انھیں میں منیر نیازی کو بھی شامل کرنا ہوگا جو غزل کے شاعر ہیں لیکن جن کی غزلوں میں اپنا ہی رنگ ہے۔ احمد فراز کے ہاں کلاسیکی رچاؤ، تازگی اور شگفتگی سے مل کر نئے آمیزے میں ڈھلتا ہے۔ ناصر شہزاد نے غزل کو زیادہ ارضی اور زیادہ رنگا رنگ بنایا اس زمین کی سوندھی سوندھی خوشبو، موسموں کے رنگ اور ارد گرد کی زندگی خصوصاً قصبات اور دیہات کی زندگی کی تشبیہیں استعارے اور امیجری سے نرالی مستی پیدا کر دی۔ احمد مشتاق نے توازن اور شگفتگی

سے غزل میں کلاسیکی رنگ و آہنگ کا جادو نئے رنگ سے جگایا۔

جدید غزل کی سبھی جہات کو ملا کر گوشوارہ تیار کیا جائے تو اس میں ایک خانہ تو خوش گو اور خوشنوا شاعروں کے لئے مخصوص ہوگا جن کے کلام میں پختگی اور شگفتگی تو ہے کیفیت اور مزا بھی ہے مگر کوئی انوکھی بات نہیں۔ انوکھی بات نہ ہونا کوئی عیب نہیں لیکن یہ نہ ہو تو کم سے کم جدید غزل کو نئی جہات بخشنے والوں کے ضمن میں ان قابل احترام اور قابل قدر فن کاروں کا نام شامل نہ کیا جا سکے گا اور اس ضمن میں جو نام ہیں ان میں سے کئی میرے بزرگ ہیں، کئی دوست، کئی قابل احترام کرم فرما۔

دوسرا خانہ ان غزل گو شعرا کا ہوگا جن کے یہاں انوکھا پن تو ہے مگر شاعری نہیں ہے وہ دراصل اس منزل سے گزر رہے ہیں جہاں وہ اپنی غزل میں امتیازی شان اور انفرادی آن بان پیدا کرنے کے لئے مختلف قسم کے لسانی اور معنوی تجربے کر رہے ہیں اور ان تجربوں کے جوش میں کرتب بازی تک بھی پہنچ جاتے ہیں ان کے شعبدے کبھی کبھی آنکھوں میں چکا چوند بھی پیدا کرتے ہیں مگر یہ وقتی اور ہنگامی شعبدہ بازی ہے۔ اچھے بھلے شاعر بھی کبھی کبھی اس چکر میں پڑے ہیں۔ جو ہنرمند تھے وہ اس منزل سے جلد اور آسان گزر گئے، جو ایسے ہنرمند نہ تھے وہ انہی پُر پیچ راہوں میں کھو کر رہ گئے۔ چلتے چلتے چند شعر ان کے بھی پڑھتے چلئے :۔

ٹوٹے میرے کو لے اُڑا کون　　ڈی سی آفس کے بس سٹاپا　(ظفر اقبال)

اک نقرئی کھنک کے سوا کیا ملا شکیب　　ٹکڑے یہ مجھ سے کہتے ہیں ٹوٹی پلیٹ کے

(شکیب جلالی)

ہلال حرف خوف سا فصیل سنگ نیل پر　　یا عدم کا زرد رنگ خواہش خراش پر

(منیر نیازی)

تمام شب تمہیں تنہا برہنہ رکھیں گے　　ہم آج پھر تری ہمت کو آزمائیں گے

(مراتب اختر)

پھر احمد ندیم قاسمی کی غزل تھی جس نے فیض کا دروبست اور چٹیلا پن نہیں برتا بلکہ ایک بے محابا اور بے تکلف قسم کے لہجے کو کلاسیکی رنگ کا جزو بنا دیا۔ فیض نے جسے ذاتی حوالے سے استناد بخشا تھا۔ ندیم نے اسے غزل کے رمز و ایما میں ڈھال کر آگہی کے دائرے میں نبھایا۔ ندیم کے

کے ہاں غزل بے محابا پن سے شناسا ہوئی اور اس بے محابا انداز میں پہنائی بھی تھی اور تہداری بھی۔ پھر حفیظ ہوشیار پوری کی خوش نوائی اور نغز گوئی ہے۔ عدم کی مست اور سرشار غزل ہے جو شخصیت کی رعنائی اور قلندری سے جگمگاتی ہے۔ قتیل شفائی کی غزل ہے جس میں گیت جیسی نرمی، روانی اور سرشاری ہے۔ ظہیر کاشمیری کی نئے شعور سے سجی اور رچی ہوئی غزل ہے جس کی صلابت اس کی لطافت کو جلا بخشتی ہے۔ شان الحق حقی کی نکسالی سے درست غزلیں ہیں۔ رئیس امروہوی کی استادانہ پختگی سے معمور غزل ہے۔ لیکن نئی غزل کی داستان دراصل ناصر کاظمی سے شروع ہوتی ہے اگو مجید امجد کی چند غزلیں مستی اور رنگینی، ترنم اور تغزل کے اعتبار سے قابل لحاظ ہیں یہ بھی غزل کا ایک نیا آہنگ تھا مثلاً :۔

برس گیا بہ خرابات آرزو ترا غم — قدم قدم تری یادیں، سبو سبو ترا غم

ہر ایک دریچہ خندہ بہ لب، ہر ایک کلی کہرام — ہم لب سے لگا کر جام ہوئے بدنام بڑے بدنام

پھول مرجھا نہ جائیں بجروں میں — ماتجھیو، کوئی گیت ساحل کا)

یہ گویا پاکستانی غزل کی ایک اہم جہت کے اشاریے تھے۔ یوں ذرا غور سے دیکھا جائے تو جدید غزل کی ایک نئی جہات کا شمار کچھ اس طرح کیا جائے گا :

(الف) ربودگی فضا والی غزلوں کا تجربہ۔

(ب) فکر آلودگی کا تجربہ، جس نے غزل کو بوجھل، علامتی اور دقیق بنانا چاہا۔

(ج) اسلوبیاتی غزلیں، جن میں زیادہ تر کرشمہ بازی، نئی لفظیات، تراکیب یا امیجری کی ہو۔

اس میں شبہ نہیں کہ جدید تر غزل جیسی بھی ہے پاکستان سے اُبھری۔ اور یہ بات بھی غیر متعلق نہیں کہ فیض، احمد ندیم قاسمی، ظہیر کاشمیری، عارف عبدالمتین، فارغ بخاری، اور بعض دوسرے شعرا کو چھوڑ کر جدید تر غزل کا آہنگ اسی وقت اُبھرا جب پاکستان میں ترقی پسندی ہی کا نہیں سماجی انقلاب کا تصور اس حد تک دھندلا دیا گیا تھا کہ سوشلزم کا نام لینا جرم تھا اور ترقی پسندی گناہ کبیرہ تھی۔ پاکستان اپنا قبلہ و کعبہ امریکہ کو تسلیم کر چکا تھا اور یکے بعد دیگرے فوجی حکومتیں اسلام کا نام لے کر اپنے فوجی اور تہذیبی سبھی رشتے مغربی ممالک سے استوار کرنے کے کام میں لگی تھیں۔

لیکن اب ہم اردو نظم کے کوچے میں داخل ہو چکے ہیں۔

اردو نظم کو پاکستان بننے سے پہلے بھی ان علاقوں سے بہت کچھ مل چکا تھا جو اب پاکستان میں شامل ہیں۔ دراصل ۱۸۷۴ء میں اردو نظم کا باقاعدہ آغاز ہی انجمن پنجاب کے مشاعرۂ لاہور سے ہوا تھا۔ محمد حسین آزاد نے نظم کی بنیاد ڈالی اور پھر یہ روایت اقبال کی عہد آفریں نظم نگاری سے ہوتی ہوئی راشد اور فیض تک پہنچی۔ پاکستان کے قیام کے وقت یہ دونوں نام اردو نظم کو نئی معنویت دینے کے لئے مستند سمجھے جاتے تھے اور اس روایت کو نیا احترام اور استناد ملا تھا۔

راشد نے نظم کی تکنیک کو نیا آہنگ دے دیا۔ اب تک کی نظم یا تو بیانیہ تھی یا انشائیہ۔ یعنی اس میں یا تو واقعہ اور موضوعِ شعر کا بیان ہوتا تھا یا شاعر کی ذات کا راست اظہار۔ دونوں صورتوں میں اظہار خاصہ برملا تھا۔ راشد نے پہلی بار نظم کو ڈرامائی اور تہہ دار اظہار سے آشنا کیا۔ اب نظم موضوع یا ذات کا راست اظہار نہیں بلکہ پلاٹ اور کرداروں کے ذریعے مختلف جہات بخشیں۔ راشد کی نظم سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس سے پہلے اس کے سباق و سباق کو سمجھ لیا جائے مثلاً "ناشتہ" نظم کو پڑھنے سے پہلے یہ معلوم ہونا ضروری ہے کہ اس کا تعلق خلائی سفر سے ہے اور یہاں خدا اور جدید دور کے انسان کی ملاقات کا تذکرہ ہے۔

اسے ضد کہ نور کے ناشتے میں شریک ہوں
ہمیں خوف یہ سحرِ ازل
کہ وہ خود پرست نہ روک لے
ہمیں اپنی راہِ دراز سے
کہیں کامرانیِ نو کے عیش و سرور میں
ہمیں روک لے
نہ خلا کے پہلے جہاز سے
جو زمین کی سمت رحیل تھا
ہمیں یہ خبر تھی کہ اپنی صوت گلوا سے
ہمیں یہ خبر تھی بیان و حرف کی خوا سے

ہے ہر ایک شے سے عزیز تر

ہمیں اور کتنے ہی کام تھے، تمہیں یاد ہے
ابھی پاسپورٹ لئے نہ تھے
ابھی روزگاری کا انتظار تھا
سوٹ کیس بھی ہم نے بند کئے نہ تھے
اسے ضد کہ نور کے ناشتے میں شریک ہو

وہ تمام ناشتہ اپنے آپ کی گفتگو
میں لگا رہا
"ہے مجھے زمیں کے لئے خلیفہ کی جستجو
کوئی نیک خو، جو مرا ہی عکس ہو، ہو بہو"
تو امیدواروں کے نام ہم نے لکھا دیئے
اور اپنا نام بھی ساتھ ان کے بڑھا دیا
"مری آرزو ہے شجر حجر
مری راہ میں شب و روز سجدہ گزار ہوں
مری آرزو ہے کہ خشک و تر
مری آرزو میں نزار ہوں
مری آرزو ہے کہ خیر و شر
مرے آستاں پہ نثار ہوں
مری آرزو ہے......"
شجر حجر تھے، نہ خشک و تر
ہمیں کیا خبر؟
تو تمام ناشتہ چپ رہے

وہ جو گفتگو کا دھنی تھا آپ ہی گفتگو میں لگا رہا

بڑی بھاگ دوڑ میں ہم جہاز پکڑ سکے
اسی انتشار میں کتنی چیزیں
ہماری عرش پہ رہ گئیں

وہ تمام عشق
وہ حوصلے
وہ مسرتیں، وہ تمام خواب
جو سوٹ کیسوں میں بند تھے

"ایران میں اجنبی" کے بعض قطعات کو راشد نے 'منظوم مختصر افسانے' قرار دیا تھا۔ بعض نظموں کو اسکیچ بتایا تھا، بعض کی حیثیت خود کلامی کی ٹھہرائی تھی (دیباچہ صفحہ ۳)۔ یہی صورت ان کے تقریباً سبھی مجموعوں کی ہے۔ نظم کی یہ ایک نئی جہت تھی جس میں نظم کے سیاق و سباق[۱] کا جاننا ضروری تھا اور بیانیہ سے زیادہ افسانوی یا ڈرامائی، خاکہ نگاری یا کردار نگاری کی تکنیک سے نظم کا ایک نیا جہاں پیدا کرنے کا تجربہ کیا گیا تھا۔ یہ نظمیں بیانیہ نہیں ہیں براہ راست انداز کی تاثراتی نظمیں نہیں ہیں بلکہ شاعر اپنے تاثر کو ڈرامائی واقعہ یا کردار کی شکل دے کر قاری سے مناسب اثر قبول کرانا چاہتا ہے اور یقیناً یہ اردو نظم کے پیکر اور اس کی پہنائی اور جہت میں اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔

نظم کی دوسری جہت فیض کی بخشی ہوئی ہے۔ فیض نے کم نظمیں کہیں لیکن 'اے روشنیوں کے شہر'، 'شیشوں کا مسیحا'، 'دریچے'، 'ہم کہ تاریک راہوں میں مارے گئے'، اور 'دعا' اس لحاظ سے غیر معمولی نظمیں ہیں کہ ان میں ایک طرف تو رمزیت کا با معنی اور لطیف استعمال ہے اور دوسری

۱۔ مثلاً حسن کوزہ گر کا کردار یا اندھے کباڑی کا کردار یا 'ہمہ اوست'۔ نظم کا پورا قصہ نظم کے سیاق و سباق کا لازمی جزو ہے۔

طرف ان میں تجربے کا وہ خلوص، توانائی اور نرمی ہے جس سے اردو نظم اس سے قبل نا آشنا تھی درد و کرب کے کھولتے جذبوں کو تجربے کے خلوص اور احساس کی قربت سے نرمی اور شائستگی کے ساتھ شعر بنا دینے کا یہ معجزہ فیض ہی کے نام لکھا تھا۔[۱۲]

یہاں یہ صراحت ضروری ہے کہ راشد اور فیض دونوں کی نظموں میں تکنیک اور لہجے، فکر اور طرزِ احساس کی یہ امتیازی شان قیام پاکستان کے بعد واضح ہوئی گو اس کے آثار اس سے قبل کے قبل کے کلام میں بھی ہیں۔ راشد کے ہاں اس کیفیت کو پیدا کرنے میں پاکستان کے حالات سے زیادہ بین الاقوامی حالات کو..... دخل ہے جب کہ فیض پر قید و بند کی کیفیات کے محرک کی حیثیت سے اس وطن کا دخل کہیں زیادہ ہے جس پر فیض اپنی نظموں میں نثار ہوتے رہے اور جہاں یہ رسم چلی ہے کہ کوئی نہ سر اٹھا کے چلے۔

راشد اور فیض کے بعد اردو نظم میں سب سے اہم نام مجید امجد اور جعفر طاہر کے ہیں۔ مجید امجد نے جدید شہری زندگی کے ان اثرات کو موضوعِ سخن بنایا جو وہ انفرادی زندگیوں پر مرتب کرتی ہے۔ مجید امجد اس اجتماعی سانچے میں ڈھل جانے پر مجبور فرد کی دردناک مگر ناگزیر صورت حال کے شاعر ہیں اور ان کیفیات کو وہ جدید صنعتی زندگی اور شہری چہل پہل کے سیاق و سباق میں احساس کی دردمندی اور تازگی کے ساتھ نظم میں ڈھال دیتے ہیں۔ یہاں بھی انداز بیانیہ کے بجائے تہ دار ہے مثلاً ان کی نظم 'توسیع شہر' جو شاید 'امروز' اور 'بس اسٹینڈ' کی طرح اور ان کی مقبول نظم 'آٹوگراف' سے کہیں زیادہ اہم اور توجہ طلب ہے۔ رمزیہ پیرایے میں جدید شہری زندگی کے فرد کو کچل دینے والی خشونت کو کیسے بھرپور انداز میں پیش کرتی ہے:۔

بیس برس سے کھڑے تھے جو اس نہر کے دوار — جھومتے کھیتوں کی سرحد پر بانکے پہرے دار
گھنے سہانے چھاؤں چھڑکتے بور لدے چھتنار — بیس ہزار میں بک گئے سارے ہرے بھرے اشجار
جن کی سانس کا ہر جھونکا تھا ایک عجیب طلسم — قاتل تیشے چیر گئے ان ساونتوں کے جسم

[۱۲] مثلاً دعا کا مصرعہ "ان کی پلکوں پہ شب و روز کو آساں کر دے" کی نرمی یا "گڑی ہیں کتنی صلیبیں مرے دریچے میں" کی معنویت اور رمزیت۔

گری دھڑام سے گھائل پیڑوں کی نیلی دیوار — کٹتے بیکل، جھڑتے بنجر، چھٹتے برگ و بار
سہمی دھوپ کے زرد کفن میں لاشوں کے انبار — آج کھڑا میں سوچ رہا ہوں گاتی نہر کے دوار
اس مقتل میں صرف اک میری سوچ لہکتی ڈال — مجھ پر بھی اب کاری ضرب اک اے لئے آدم کی آل!!

یہاں قتل ہونے والے پیڑ ہیں یا فرد یا انسان کا فکر و احساس یا پوری تہذیب!! شاعر نے علامتی تہہ داری سے نظم کو نہایت بلیغ بنا دیا ہے۔ لیکن نظم کی جہات پر غور کرتے وقت شاید ہئیت اور تہہ داری کے تجربوں سے کہیں زیادہ اہم مسئلہ یہ ہے کہ نظم روایتی دروبست سے دامن بچا کر تازگی کے ساتھ کسی نئے حسن کا احساس جگا سکتا ہے یا نہیں۔ ظاہر ہے نہ محض خیال شاعری ہے نہ محض جذبہ، نہ محض ہیئتی تجربہ شاعری ہے نہ محض تہہ داری۔ شاعری اگر ہے تو یہی نئے حسن کا احساس ہے اور یہ احساس محض، لہجے یا تجربے یا کسی اور ادبی کرتب سے نہیں جگایا جا سکتا۔ اسے بیدار کرنے کے لئے تجربے کا انوکھا پن، لہجے کی ندرت، فضا کا کیف اور امیجری کا فن کارانہ استعمال سبھی درکار ہے۔ اس کیفیت آفرینی کی صرف دو مثالیں کافی ہیں۔ دو نظمیں "بس اسٹینڈ پر" اور "ہیولی" کا آخری حصہ:

"رات بجھتی شمع نیندوں کا غبار
برف کی زنجیر میں جکڑے ہوئے جھونکوں کی بزم
میں کہاں تھا۔ کچھ بتا۔ اے دل کے اوپر ناچتی ناگفتہ نظم!"

"مگر توبہ، مری توبہ، یہ انساں بھی آخر اک تماشا ہے
یہ جس نے پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہونا بڑے جتنوں سے سیکھا ہے
ابھی کل تک جب اس کے ہونٹ محرومِ زنخداں تھے
ابھی کل تک جب اس کے ابروؤں تک موئے پیچاں تھے
ردائے صد زماں اوڑھے لرزتا کانپتا بیٹھا
ضمیرِ سنگ سے بس ایک چنگاری کا طالب تھا"

"مگر اب تو یہ اونچی میٹوں والے جلو خانے میں بستا ہے
ہمارے ہی لبوں سے مسکراہٹ چھین کر اب ہم پہ ہنستا ہے
خدا اس کا، خدائی اس کی، ہر شے اس کی، ہم کیا ہیں
چمکتی موٹروں سے اڑنے والی دھول کا ناچیز ذرہ ہیں"

"ہماری ہی طرح جو پائمال سطوت میری و شاہی ہیں
شکوکھا پا پیادہ، آب دیدہ، دل زدہ، وامانده راہی ہیں
جنھیں نظروں سے گم ہوتے ہوئے رستوں کی غم پیمائیکوں میں
دکھائی دے رہی ہیں آنے والی منزلوں کی دھندلی تصویریں"

"ضرور اک روز بدلے گا نظام قسمت آدم
بسے گی اک نئی دنیا بسے گا اک نیا عالم
شبستاں میں نئی شمعیں، گلستاں میں نیا موسم"

"وہ رت اے ہم نفس جانے کب آئے گی
وہ فصل دیر رس جانے کب آئے گی
یہ نو نمبر کی بس جانے کب آئے گی"

اس نظم میں انسانیت کی ارتقا کی تاریخ جن فضا آفریں اور کیفیت زا تصویروں اور تشالوں میں ادا ہوئی ہے وہ نئے حسن کا احساس جگاتی ہے اونچی میٹوں والے جلو خانے، چمکتی موٹروں سے اڑنے والی دھول کے ذرے، رستوں کی غم پیمائیوں، نئی شمعیں، گلستاں کے نئے موسم، رت، فصل دیر رس اور پھر نو نمبر کی بس کا تذکرہ۔ پوری فضا نئے جمال سے مملو ہے۔
ابن انشا اس حسن آفرینی میں مجید امجد سے بھی آگے ہیں۔ وہ متوسط طبقے کے اس نیک نیت انسان دوست، قلندری صفت، حسن پرست نوجوان کے ترجمان ہیں جو روپیہ پیسے کے پہیئے پر گھومنے والی دنیا کی ستم ظریفیوں سے نالاں اور اندھے جبر اور EXPLOITATION سے متنفر ہے

جو ہر ایک حسین شے کے دکھ کو دل پرلے کر اداس ہو جاتا ہے اور اپنی بے بسی پر کڑھتا ہے۔ "خزاں کی ایک شام":

پھوا تونے اپنی سوندھی باس گنوائی	"آج سے میں نے اگلی رت کی آس گنوائی"
پودے تو کیوں سوکھ رہا ہے زرد ہوا ہے	"اس جنگل میں جینے سے جی سرد ہوا ہے"
سپنوں کی پریوں کے آنچل چوم رہے ہیں	ہم بھی چپ چپ تنہا تنہا گھوم رہے ہیں
کیسے اُجڑی بستی کو آباد کروگے	لوگو! کل تم ہم لوگوں کو یاد کروگے
دل اپنا ہم کھول کے رکھیں کس کے آگے	شام ہوئی پردیسی پنچھی گھر کو بھاگے

ابن انشا کی نظموں میں ربودگی اور آگہی کا ایک عجیب و غریب امتزاج ملتا ہے ان کی نظم "افتاد" خود ایک ایسا کارنامہ ہے جو اردو نظم میں یادگار رہے گا جس نے آگے بڑھ کر جعفر طاہر کے "ہفت کشور" کا تصور ابھارا ہوگا۔ ابن انشا نے دل زدہ حسن پرست جمال دوست انصاف کے شیدائی نوجوان کی نجی شخصیت کو کائنات کی وسعت اور انسانیت کی ہمہ گیری عطا کی ہے پھر نئی امیجری، نیا لہجہ اور نئی نرمی اور ٹھنڈک سے معمور شعری فضا حسن کا ایک نیا جہان تعمیر کیا ہے۔

جعفر طاہر کی "ہفت کشور" تاریخ و تمدن کے پردے پر نئی شعری دیومالا کی تخلیق ہے جس نے اردو نظم کو رزمیہ کی سی وسعت اور پنہائی دی ہے اس نظم کا پھیلاؤ عالمی تہذیب کے دائرے تک پھیلا ہوا ہے۔ نظم قصہ چہار درویش کے طرز پر ہے لیکن اس نظم کی فضا تہذیبی امیجری سے اس طرح ترتیب دی گئی ہے کہ انسان کی پوری جد و جہد کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے گویا شعر کے پردے میں مورخ ٹوائن بی کی دنیا سجائی ہے اور اس ابدی استفہامیئے کا سوال تلاش کرنے کی کوشش کی ہے جو صدیوں سے انسانی وجود کا پیچھا کر رہا ہے۔ یہ کارنامہ اردو نظم کی تاریخ کے اہم ترین اجتہادات میں شمار کیا جانا چاہیئے کہ اس نے فکر، تمثال اور شعری ہیئت تینوں حیثیتوں سے اردو نظم کو نیا رخ دے دیا۔ اس حسین اور ہوش رُبا فضا کے پیچھے انسان کے ابدی استحصال کی زیریں لہر صاف جھلکتی ہے..... لفظ، تمثال، صوت اور معنیٰ آفرینی کے اس طلسم خانے کا ایک منظر ملاحظہ ہو:

گلے ملے مسکرا کے محفل میں برگ و بار و بہار با ہم
جھکتی شاخوں نے جھرجھری لے کے زیب فرمایا رخت شبنم
سلگتے ٹیلوں کی چیختی دھڑکنیں ملہاروں میں کھو گئی تھیں
ہزاروں بے نور پتلیاں آج شب چناروں میں سو گئی تھیں

حرم سرا میں روش روش پر سنگنیوں نے گلاب چھڑکا
طبیعتیں بھر بھر آئیں دل گدگدائے لیکن حیا نے جھڑکا
مقیش کی جلوہ باریاں دیکھنے کو آنکھیں ترس گئی تھیں
یہ آج شب کتنی بجلیاں ایک ساتھ آ کر برس گئی تھیں

پہلے بند کے آخری مصرعے میں استحصال اور استبداد کی زیریں لہر صاف نمایاں ہے۔

اس کے علاوہ منیر نیازی کی نظمیں ہیں جن کی فضا گویا اڈگرایلن پو کی پراسرار کچھ ہیبت ناک اور اندھیری علامتوں سے تیار ہوئی ہے منیر نیازی۔ اپنی غزلوں کے برخلاف۔ نظم میں بھوتوں اور آسیب زدہ مکانوں کی علامتوں سے نظم کا تار و پود بنتے ہیں لیکن فکری آہنگ کے اعتبار سے ان نظموں میں اس فرد کی پتا ہے جو نئے معاشرے کی بھول بھلیوں میں دہشت زدہ ہو کر مسرت اور خود شناسی کا راستہ بھول بیٹھا ہے۔ منیر نیازی کی نظموں کا اجتہاد ہے تو یہ ہے کہ رومانی رنگینی کے بجائے کھردری اور کسی قدر بدنما تمثالوں کے ذریعے نئی نظم کا پیکر سنوارا اور اسے معنیٰ آفرینی اور تجربے کی گرمی بخشی۔

پھر شاید فہمیدہ ریاض کا نام لینا واجب ہے جنھوں نے اردو نظم کو بلکہ پوری اردو شاعری کو عورت کے بے جھجک اور بے خوف لہجے سے آشنا کیا۔ ابھی تک شاعری مرد کی میراث تھی افسانے میں عصمت اور واجدہ تبسم نے نسوانی احتجاج کی آواز بلند کی۔ مگر وہ بھی اس حد تک کہ مرد قارئین کے لئے انبساط کا سامان فراہم کر سکے۔ لیکن فہمیدہ ریاض نے عورت کو ایک عام انسان کی حیثیت سے وسیلۂ اظہار بخشا اور اس کے ذہن اور جذبات سے بے جا استحصالی اور رسمی زنجیروں کو دور کیا "باکرہ" اور "لاؤ ہاتھ اپنا لاؤ ذرا" جیسی نظم بے باک اور جرأت مندانہ نظمیں ہیں جن میں ایک بالغ اور صحت مند عورت صحت مندانہ جنسی تلذذ کا ذکر کرتی ہے اور عام انسان کے حقوق اد

طلب کرتی ہے۔ لہجے اور فکری آہنگ دونوں کے اعتبار سے فہمیدہ ریاض کی یہ نظمیں تاریخ ساز ہیں۔ پھر فہمیدہ نے عورت کی ذہنی اور جنسی آزادی کے اس تذکرے کو ہر قسم کے استحصال اور استبداد سے جا ملایا ہے اور محنت کشوں، نوجوانوں اور مظلوم اور غلام انسانوں کی جدوجہد کو بھی موضوع سخن بنایا ہے۔ اس لئے یہ کارنامہ اور بھی وقیع ہو جاتا ہے۔ اسی ضمن میں پروین شاکر تازہ کاری نغزگوئی اور روزمرہ کی زندگی کے چھوٹے بڑے گھریلو تجربوں پر لکھی ہوئی نظموں کی رنگینی اور نرمی بھی قابل قدر اضافہ ہے۔

اس کے بعد ایسے شاعروں کی ایک فہرست سامنے آتی ہے جو کامیاب اور کامران شاعر ہیں ان کی بعض نظمیں اہم بھی ہیں لیکن ان شاعروں نے نظم کو کوئی نیا موڑ نہیں دیا ان میں سے بعض کی فلسفہ طرازیوں نے جگ جیتا لیکن ان کا نام آنے پر شاید ہی کوئی ایسی نظم یاد آئے جو بھلائے نہ بھولے۔ افتخار جالب کا نام نئی نظم کے فلسفہ طراز کی حیثیت سے بڑا ہے لیکن میرے لئے وہ صرف ایک نظم کے شاعر ہیں "گیا سال"،

'جانے والے تجھے رویا تو نہیں ہوں لیکن
میں نے یادوں کے پراسرار حزیں مدفن میں
بڑی حسرت سے تجھے زیر تہہ خاک اُدھر رکھا ہے'

نئی شعریات اور نئی بوطیقا کی تدوین کی ان کی کاوشوں اور نئی لفظیات کی تلاش الگ مسائل ہیں۔

حبیب جالب ہیں جن کی نظمیں پاکستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک زندہ اور جاندار احتجاج کی آواز بن کر گونجیں۔ "ہتھکڑی" یا "نیا دستور" اس احتجاج کی محض علامتیں تھیں۔ لیکن حبیب جالب کی نظمیں مطبوعہ شکل میں سامنے نہیں ہیں لہٰذا ان کی فنی بالیدگی کے بارے میں کچھ کہنا ممکن نہیں۔

عارف عبدالمتین نے اردو نظم کی ترقی پسندانہ روایت کو زندہ رکھا لیکن اب ترقی پسند نظم کی راہیں زیادہ پُر پیچ اور ژولیدہ تھیں۔ اب محض امید، حوصلے اور مقاومت کا پیغام نظم کرنا کافی نہ تھا بلکہ معاشرے کے آئینے میں استحصال کے نئے چہروں کو پہچاننے کی ضرورت تھی۔

اس کے بعد وہ ذہنی اور شعری رویے ہیں جنھوں نے شعوری طور پر اپنے کو باطنی رشتوں سے اس طرح ملایا ہے کہ علامتی اظہار کے راستے سے ہوتے ہوئے تصوف اور ماورائیت تک جا پہنچے ہیں اور شخصیت اور انفرادیت کے عرفان کو سماجی سیاق و سباق کے بجائے ذات اور تصورات، تجرید اور تعینات کے ذریعے حاصل کرنا چاہتے ہیں ان میں شاید سب سے اہم نام جیلانی کامران کا ہے جن کے ہاں یہ رجحان زیادہ نمایاں ہے وزیر آغا کی علامتی نظمیں ہیں جن میں باطنیت ہلکے پھلکے مناظر اور تمثالوں کی شکل اختیار کرتی ہے۔ محمد صفدر، سلیم الرحمن، ساقی فاروقی اور نہ جانے کتنے اور نام ہیں ان کی بعض نظمیں اچھی ہیں لیکن ان کے بل پر یہ فیصلہ کر دینا کہ پاکستان میں اردو نظم محض علامتی پیرایے اور باطنی کھوج کا شکار ہو چکی ہے، صحیح نہ ہوگا۔ پاکستان کی اردو نظم میں احتجاج کی آواز بھی ہے انقلابی، دردمندی بھی اور توانا اور بہشت پہلو حیثیت بھی۔

انھیں میں شبنم رومانی کی نظموں کا امپریشن اسٹک آرٹ ہے جو دھیمے اور شائستہ لہجے میں احتجاج کی مشعل روشن کرتا ہے۔

یہ آفتاب
ایک ٹمٹماتا چراغ سا ہے

یہ ماہتاب
ایک داغ سا ہے

یہ پھول
جیسے ہوں قتل نامے کی سرخ تحریریں
یہ شاہراہوں کے نقشے ہیں
کہ آبلے ہیں
جو پھوٹ کر آج اپنی حالت پہ رو پڑے ہیں (ابہام)

آخر میں پاکستان میں نثری نظم کے فروغ کے بارے میں کچھ کہنا ضروری ہے۔ نثری نظم ہنوز پاکستان میں بحث کا موضوع بنی ہوئی ہے۔ اس کے جواز اور عدم جواز کا فیصلہ یہاں موضوع بحث نہیں کہ جب تک کوئی بڑا شاعر، نثری نظم کو وسیلۂ اظہار نہیں بناتا یا پھر نثری نظم خود کوئی اعلیٰ فن کا دبیرا

نہیں کرتی یہ بحثیں جاری رہیں گی۔ البتہ یہ بات قابل ذکر ہے کہ پاکستان کے بعض اچھے شاعر نثری نظم کی طرف متوجہ ہوئے ہیں ان میں فاطمہ حسن کی نثری نظموں میں اختصار، کیفیت اور تجربے کی توانا حسّیت پائی جاتی ہے۔ اور اس لحاظ سے ان کی نثری نظمیں کامیاب ہیں۔ نثری نظم کی خوبی یہی ہے کہ اس کا کوئی لفظ بھی محض آرایشی نہ ہو اور صرفی اور نحوی ترتیب کے نثری آہنگ کو برقرار رکھنے کے باوجود پڑھنے والے کو ایسے کیفیاتی اشارے فراہم کر دے کہ وہ دیر تک ان نظموں کی فضا میں نئی کیفیات دریافت کرتا رہے یہ خوبی فاطمہ حسن کی نظموں میں ہے۔

خاتون شاعروں کے سلسلے میں پروین شاکر کا ذکر بھی ضروری ہے جس کی آزاد نظموں میں فہمیدہ ریاض کی روایت آگے بڑھتی نظر آتی ہے۔ شاید پروین شاکر کی نظم کے یہ ٹکڑے عورت کی بے محابا آواز کا کچھ پتہ نشان دے سکے جو حال ہی میں اردو شاعری میں بلند ہوئی ہے:

سجے سجائے گھر کی تنہا چڑیا

تیری تازہ سی آنکھوں کی ویرانی میں
پچھم جا بسنے والے شہزادوں کی ماں کا دکھ ہے!
تجھ کو دیکھ کے اپنی ماں کو دیکھتی ہوں

اور سوچتی ہوں
ساری مائیں ایک مقدر کیوں لاتی ہیں؟
گود میں پھولوں والی!!!
آنگن پھر بھی خالی!!! (دوست چڑیوں کے نام کچھ حرف)

آنگن کی ویرانی کا یہ نازک اور لطیف احساس ایک شاعرہ ہی نظم کر سکتی تھی!

پاکستان میں اردو شاعری کا یہ جائزہ مختلف جہات کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ یہ شاعری ایک ایسے معاشرے کی داستان ہے جو مغربی ممالک کی فضا کو اپنے ملک سے پیوند تو کرنا چاہتا ہے لیکن خود مغرب کے صنعتی اور معاشی نظام سے دور ہے۔ مگر........ ....قدیم جاگیردارانہ تصورات میں پیوست ہیں جس کے نتیجے کے طور پر کلاسیکی تشبیہیں اور استعارے، علامتیں مرصع زبان اور متصوفانہ خیالات اس طرح ابھرتے ہیں

وحید اختر

پاکستانی غزل (۵۰ء کے بعد)

برصغیر کی آزادی اور تقسیم کے بعد سرحد کے دونوں طرف غزل کا احیا ہوا۔ غزل کو نام نہاد انقلابی شعرا و ناقدین نے رجعت و قدامت کا حلیف مان کر گردن زدنی قرار دے دیا تھا۔ ترقی پسندوں اور ارباب ذوق کے شعرا نے نظم پر زیادہ توجہ صرف کی۔ اس نئی صنف کو ہئیت، زبانی وسائلِ اظہار کی سطح پر جرأت مندانہ تجربوں کی ضرورت بھی تھی۔ اس توجہ نے نظم کو ترقی دی اور اس بے توجہی نے غزل کو سیاسی نعروں کی یلغار سے محفوظ رکھا۔ حسرت، جگر، ذوق، اثر، عابد علی عابد، صوفی تبسم، حفیظ جالندھری، اور چند اساتذہ منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے غزل میں سیاسی، سماجی وسائل کی چاشنی پیدا کرتے رہے۔ لیکن اس کی ہئیت اور مزاج کے کٹرپن کو کوئی بھی نہ بدل سکا۔ آزادی کے بعد سیاسی، سماجی آدرشوں کی شکست کے احساس نے تخلیقی طرزِ فکر میں بھی تبدیلی پیدا کی۔ خارج سے مایوسی داخل کی طرف رجوع کرتی ہے۔ احساسِ شکست تلاش و احتساب نفس کی طرف لے جاتا ہے۔ ایک طرح سے اسے تجربے کی خودکوشی و خود اظہاری کے مماثل سمجھنا چاہیئے۔ شعر میں اس میلان نے خودکوشی و خود آگہی کی داخلی زبان و ہئیت میں پناہ لی ہے۔ زبان کا غزل سے بڑھ کر شناسا کون ہو سکتا تھا۔ تقسیم کے ساتھ ہجرت اور بے زمینی کے تجربے نے نئی آوازوں کو جنم دیا۔ مابعد تقسیم کے پیچیدہ تجربات و احساسات کو پرانی نسل کے شعرا کما حقہ ادا نہیں کر سکتے تھے۔ ان کی دنیا بھی جماتی تھی۔ جن کی دنیا ٹوٹی یا جو اپنی بسی بسائی دنیا کو چھوڑ کر نئی دنیا کی تلاش میں نکلے وہ نئی نسل کے تجربے میں نفسیاتی اور تخلیقی طور پر شریک ہو گئے۔ ہجرت و اجنبیت کو محض نقل مکان سمجھنا غلطی ہے۔ اپنی دنیا میں رہ کر بھی ایک فرد تخلیقی سطح پر ان تجربوں سے گزر سکتا ہے۔ فیض اور ان کے ہم عصر شعرا

کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ وہ اپنی دنیا........ میں اجنبی ہوگئے۔ تو نئے تصورات کی دنیا نے انھیں اپنی طرف بلایا جیسے اب تک پاکستان کے دانشور اور تخلیق کار کھوج رہے ہیں۔ اس اجنبیت اور تلاش کے تجربات نے پرانی نسل کو وہ اسلوب غزل دیا جس کے لئے فیض کا دعوے بے جا نہیں۔ ؎

ہم نے جو طرز فغاں کی ہے قفس میں ایجاد
فیض گلشن میں وہی طرزِ بیاں ٹھہری ہے

دستِ صبا غزل کے قدیم سرمایے میں ان علایم و استعارات کی تلاش ہے جو غزل کو نئی معنویت دے سکتے تھے۔ اس تلاش نے قدما کے لہجے کی بازیافت کا راستہ بھی دکھایا۔ زندان نامہ قدیم کی تخلیق جدید کا اشاریہ ہے۔ فیض آزادی کے پہلے دہے کے ممتاز ترین غزل گو ہیں۔ وہ پہلے سے غزل کے مزاج کے آشنا تھے۔ نئے تجربات نے ان کے اسلوب میں کلاسیکیت کو جدید طرز احساس و اظہار سے آمیز کرکے انھیں غزل کا امی و مجدد بنا دیا۔ حسرت، جگر، فراق، حفیظ اس تجربے سے نہیں گزرے تھے۔ ان کے یہاں تبدیلی آئی بھی تو اُس کا رنگ ہلکا تھا۔ فیض کی پوری شاعری اپنے موضوعات کے لحاظ سے بھی محدود ہے اور اظہار کے لحاظ سے بھی۔ اُن کی غزل کی فضا میں بھی تازگی و شگفتگی کے باوجود وسعت کے امکانات نہیں تھے۔ البتہ اُن کے لہجے میں عوام گیر اپیل تھی۔ ہندو پاکستان میں مقبولیت کے باوجود فیض کی غزل نئے تجربات خصوصی نئی نسل کے حساس و منفرد شعرا کی وسیلۂ اظہار نہیں بن سکتی تھی۔ ان کی آواز کے پہلو بہ پہلو پاکستان میں غزل کی جو مشعلیں جلتی اور جگمگاتی رہیں اُن کے نگہداروں میں احمد ندیم قاسمی، حفیظ ہوشیارپوری ظہیر کاشمیری، قتیل شفائی، صوفی تبسم، عابد علی عابد، احسان دانش، عدم، رئیس امروہی، یوسف ظفر، مجید امجد، سیف، حقی اور مختار صدیقی کے نام نمایاں ہیں۔ ان میں قاسمی کو اس لحاظ سے امتیاز حاصل ہے کہ اُن کے یہاں فکر کی زہرناکی لہجہ جدید طرز احساس کے رچاؤ میں زیادہ کامیابی سے شامل ہوئی۔ ان سب شعرا نے جدید لہجے اور اسلوب کے امکانات کی طرف اشارے ضرور کئے لیکن ان امکانات کو پوری طرح بروئے کار لانے کا کام باقی صدیقی، ناصر کاظمی، سلیم شاہد........ مصطفیٰ زیدی، سلیم احمد، شاد امرتسری، ابن انشا، احمد ظفر، شہزاد احمد، احمد فراز، حمایت علی شاعر

ظفر اقبال، جمیل الدین عالی، محبوب خزاں، سجاد باقر رضوی، مظفر علی سید، جعفر طاہر، جلیل حشمی اور احمد مشتاق نے کیا۔

اگر یگانہ نے غزل کے احیا میں نمایاں کام کیا تو ناصر کاظمی کو جدید غزل کی تشکیل میں سب سے منفرد مقام حاصل ہوا۔ انھوں نے غزل سے فضا آفرینی کا وہ کام لیا جو ان سے پہلے اساتذہ میں کوئی بھی دے سکا تھا۔

کچھ یادگار شہر ستم گر ہی لے چلیں — آئے ہیں اس گلی میں تو پتھر ہی لے چلیں
یوں کس طرح کٹے گا کڑی دھوپ کا سفر — سر پر خیالِ یار کی چادر ہی لے چلیں
رنجِ سفر کی کوئی نشانی تو پاس ہو — تھوڑی سی خاکِ کوچۂ دلبر ہی لے چلیں
اس شہرِ بے چراغ میں جائے گی تو کہاں — آ اے شبِ فراق تجھے گھر ہی لے چلیں

یہ آواز جس کی تشکیل میں میر سے لے کر فراق و یگانہ تک کئی آوازیں جگمگا رہی ہیں روایت سے بندھی ہونے کے باوجود انحراف کی آواز تھی۔ ۱۹۵۰ء سے ۶۰ء تک یہی آواز نئی نسل کے نفسیاتی ہونے، اجنبیت اور سفر و تلاش کی ترجمانی کرتی رہی۔ باقی صدیقی کی آواز اس سے الگ رہی۔ لیکن احمد مشتاق سے لے کر ہندوستان کے بیش تر نئے غزل گو شعرا ناصر کاظمی کی آواز کے حلقے ہی میں لہریں بناتے رہے۔

ناصر کاظمی کی آواز کے دائرے سے باہر آواز کی بہت سی لہریں اٹھیں۔ ابن انشا کے رومانی اور اکھڑ لہجے میں ابتدا بڑی کشش تھی۔ عالی نے دوہے کی زبان کو غزل سے آشنا کیا۔ اس رنگ کو بعد میں ناصر شہزاد نے چمکایا۔ سلیم احمد نے کلاسیکی لہجے میں مخالف کلاسیکی مخالف رومانی باتیں کرنے کی طرح ڈال کر چونکایا۔ اُن کی بے باک شاعری کا خاتمہ بالآخر تصوف کے مضامین پر ہوا۔ یہ جدید غزل کی بوالعجبی کی ایک نمائندہ مثال ہے۔ حمایت علی شاعر، مصطفیٰ زیدی، منیر نیازی، حامد عزیز مدنی، شہزاد احمد، اختر ہوشیارپوری، مختار صدیقی، احمد فراز، سجاد باقر رضوی، ضیا جالندھری نیم کلاسیکی لہجے میں جدید تر تجربات سے غزل کے امکانات کو وسیع تر کر رہے تھے۔ پاکستان کی غزل کے ان تجربوں نے ہندوستان میں بھی غزل کے احیا کے فروغ کو تقویت دی۔ ترقی پسند

شاعروں میں لے دے کر ایک مجروح نے ہندوستان میں غزل کی آبرو کو باقی رکھا تھا۔ اب ان کے ساتھ نئی آوازوں کا ایک کارواں بھی دشت غزل میں چل پڑا۔ اس آبلہ پیمائی کیلئے فیضان و اشارۂ غائبانہ پاکستان کی غزل سے مل رہا تھا۔

سلیم احمد کی چونکا دینے والی غزل کا دامن بہت محدود تھا۔ یہ ارتفاع کی طرف صرف ایک قدم تھا۔ ارتفاع کی زیادہ جاندار آواز پاکستانی اور ہندوستانی غزل میں ظفر اقبال نے اٹھائی۔ آب رواں تک وہ کلاسیکی لہجے میں اچھی بھلی ٹھکی ٹھکائی مگر جدید طرز احساس کی ترجمان کامیاب غزلیں کہتے رہے۔ گل آفتاب، کی غزل میں غزل کے سرمایہ روایات اور زبان سے بغاوت شعوری طور پر نمایاں کی گئی ــــــ ہندو پاکستان میں آج وہ غزل جیسے جدید تر کہا جاتا ہے۔ ظفر اقبال کے اس جرأت مند مگر بڑی حد تک سمت گم گشتہ تجربے کی بازگشت بھی جا سکتی ہے۔ اس انتہا پسندی و سنسنی خیزی کو توازن کی راہ دکھانے والوں میں ساقی فاروقی، اطہر نفیس اور احمد مشتاق، جون ایلیا، عبداللہ علیم، مشفق خواجہ اور شکیب جلالی کے نام نمایاں ہیں۔ ان شعرا میں سب سے زیادہ انفرادیت شکیب جلالی کے یہاں تھی۔ ان کی خود اختیار جواں مرگی نے ان کی غزل کو جدید نسل کے لئے نشانِ راہ بنا دیا۔

مزاج اور طرز اظہار کے لحاظ سے ۵۸ء کے بعد کی ہندوستانی اور پاکستانی غزل میں خط تقسیم و امتیاز کھینچنا ممکن نہیں۔ لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ غزل کے نئے امکانات کو پاکستانی شعرا نے زیادہ خوبی سے چمکایا ہے ان کے تجربے سے ہندوستان کے شعرا نے بھی پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ پاکستانی سیاست و سماج نے جس شاعری کو جنم دیا اس کا اظہار غزل کی زبان ہی میں بہتر ہو سکتا تھا کہ یہ پردے میں بات کہنے کا آرٹ سکھاتی ہے۔ غزل تجربے کی پردہ دری سے زیادہ پردہ داری کے قابل ہے۔ پردہ دری کے آداب نے ہمارے ملک کی پردہ در زبان شعر کو بھی احتیاط و ابہام کے گر سکھلائے۔ پردہ دری و پردہ داری کی جدلیاتی کشمکش نے ہندوستانی غزل کو کاٹ اور تیور دیئے ہیں جو اسے پاکستانی غزل سے ممتاز کرتی ہے۔

جدید پاکستانی غزل نے ہمارے سرمایۂ غزل میں جو وقیع اضافے کئے ہیں یہاں ان کی صرف چند منتخب مثالیں ہی پیش کی جا سکتی ہیں۔ وقت کی تنگ دامانی اہم شاعروں کے

ایک ایک دو دو اشعار سے زیادہ کی متحمل نہیں ہو سکتی :

حامد عزیز مدنی ـــــــ فراق سے بھی گئے ہم وصال سے بھی گئے
سبک ہوئے ہیں تو عیش ملال سے بھی گئے
چراغ بزم ابھی جان انجمن نہ بجھا
کہ یہ بجھا تو تیرے خط و خال سے بھی گئے

ابن انشا ـــــــ کل چودھویں کی رات تھی شب بھر رہا چرچا تیرا
کچھ نے کہا یہ چاند ہے ، کچھ نے کہا چہرا تیرا

مصطفٰے زیدی ـــــــ اک موج خون خلق تھی کس کی جبیں پہ تھی ؟
اک طوق فرد جرم تھا کس کے گلے میں تھا ؟
راتوں کو کلی بن کے چٹکتا تھا تیرا جسم
دھوکے میں چلی آئی نسیم سحری بھی

حمایت علی شاعر ـــــــ تیرے میرے درمیاں حائل رہی دیوار حرف
رکھ لیا اک بات نے ہر بات کا پردہ یہاں

احمد ندیم قاسمی ـــــــ انداز ہو بہو تیری آواز ہی کا تھا
دیکھا نکل کے گھر سے تو جھونکا ہوا کا تھا

ناصر کاظمی ـــــــ عشق میں ہم نہیں زیادہ طلب
جو ترا ناز کم نگاہی دے
عمر بھر کی نوا گری کا صلہ
اے خدا کوئی ہم نوا ہی دے
یہ ٹھٹھری ہوئی لمبی راتیں کچھ پوچھتی ہیں
یہ خامشی آواز نما کچھ کہتی ہے
بیدار رہو بیدار رہو بیدار رہو
اے ہم سفرو! آواز درا کچھ کہتی ہے

تیری گلیوں تک ہم نے دیکھا تھا
پھر نہ جانے کدھر گیا وہ
دل تو میرا اُداس ہے ناصر
شہر کیوں سائیں سائیں کرتا ہے

احمد فراز ——— اب کے ہم بچھڑے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں
جس طرح سوکھے ہوئے پھول کتابوں میں ملیں
آج ہم دار پہ کھینچے گئے جن باتوں پر
کیا عجب کل وہ زمانے کو نصابوں میں ملیں
کرے گا کون تیری بے وفائیوں کا گلہ
یہی ہے رسم زمانہ تو ہم بھی اب کے گئے

منیر نیازی ——— میری صدا ہوا میں بہت دور تک گئی
پر میں بلا رہا تھا جسے بے خبر ہوا

سلیم احمد ——— حسن جب سے ہوا ہے کم آزار
عشق بھی بن گیا ہے دنیا دار
بُرا لگا میرے ساقی کو ذکر تشنہ لبی
کہ یہ سوال مری بزم میں کہاں سے اٹھا

عالی ——— یہاں کسی کو بھی کچھ حسب آرزو نہ ملا
کسی کو ہم نہ ملے اور کسی کو تو نہ ملا
غزلیں دو ہے گیت کی شہرت ملک سے باہر پھیلی تھی
ہندوستان سے آنے والے تحفے میں لے جاتے تھے
تم ایسے کون خدا ہو کہ عمر بھر تم سے
امید بھی نہ رکھوں نا امید بھی نہ رہوں

ظفر اقبال ——— بزم میں آئے تو خود گرمی بازار ہوئے
ہم جنھیں ہاتھ لگانے میں گنہگار ہوئے
زندانی جسم آرزو کو ، جنگل کی ہوا ہے جان لیوا
سج دھج ہے اور بھی غزل کی ، جس روز سے یہ ہوئی ہے بیوا

سجاد باقر رضوی ——— میں سرگراں تھا ہجر کی راتوں کے بوجھ سے
مایوس ہو کے لوٹ گئے دن وصال کے

ساقی فاروقی ——— مجھے خبر تھی مرا انتظار گھر میں رہا
یہ حادثہ تھا کہ میں عمر بھر سفر میں رہا
مری صدا پہ نہ برسیں اگر تیری آنکھیں
تو حرف و صوت کے سارے دیئے بجھا دوں گا

احمد مشتاق ——— کوئی شرر نہیں بچا پچھلے برس کی آگ میں
ہم نفسان شعلہ خو آگ نئی جلائیے
میں بہت خوش تھا کڑی دھوپ کے سناٹے میں
کیوں تیری یاد کا بادل مرے سر پر آیا!

شکیب جلالی ——— مجھے گرنا ہے تو میں اپنے ہی قدموں میں گروں
جس طرح سایۂ دیوار پہ دیوار گرے
کیا کہوں دیدۂ تر یہ تو میرا چہرہ ہے
سنگ کٹ جاتے ہیں بارش کی جہاں دھار گرے
وہ تجلی کی شعاعیں تھیں کہ جلتے ہوئے تیر
آئینے ٹوٹ گئے ۔ آئینہ بردار گرے
آکر گرا تھا ایک پرندہ لہو میں تر
تصویر اپنی چھوڑ گیا ہے چٹان پر
نہ آتی تیز چلے سر پھری ہوا سے کہو

شجر پہ ایک ہی پتہ دکھائی دیتا ہے
یہ ایک ابر کا ٹکڑا کہاں کہاں برسے
تمام دشت ہی پیاسا دکھائی دیتا ہے

پاکستانی شعر صدیوں پیچھے اور صدیوں آگے تک پھیلے ہوئے دشت غزل میں جگہ جگہ برسے ہیں ـــــ اب یہ دشت اتنا پیاسا یہاں نہیں جتنا ۱۹۵۰ء سے قبل تھا۔ غزل اس وقت ادبی جرائد کے صفحات پر نظم سے زیادہ برس رہی ہے ممکن ہے اسے اردو شاعری کے لئے اچھا شگون نہ سمجھا جائے مگر غزل کی ہمہ گیر مقبولیت اور سدا بہار جوانی سے انکار کوئی کر سکتا ہے۔ نئی غزل شاہد ہے کہ اختلاف طبائع کے لحاظ کے ساتھ صنعت میں ہر عہد اور ہر تجربے کا ساتھ دینے کی استعداد ہے۔

پاکستان کی اردو غزل کے اہم نام

فیض احمد فیض	حفیظ جالندھری
منظور حسین شور	شان الحق حقی
ابن انشا	رئیس امروہوی
ناصر کاظمی	جون ایلیا
جمیل الدین عالی	قتیل شفائی
حفیظ ہوشیارپوری	ظہیر کاشمیری
ناصر شہزاد	شبنم رومانی
ظفر اقبال	شکیب جلالی

باقر مہدی

پاکستانی نظم پر ایک سوالیہ نظر

پاکستانی نظم کی طویل کہانی اردو شاعری کی اہم ترین کہانی ہے۔ اور مجھے اس کہانی کی صرف یہ جھلکیاں پیش کرنی ہیں یہ داغ داغ اُجالا یہ شب گزیدہ سحر سے یہ داستان شروع ہوتی ہے اور نثری نظم تک جاری رہتی ہے۔ میرا جی، راشد، فیض، اس کے تین اہم شاعر گذرے ہیں۔

نظم کی ہئیت میں تجربے کرنے کا سب سے پہلا کام راشد نے انجام دیا تھا اور آج آزاد نظم کو جو مقبولیت حاصل ہے اس پر راشد کی پرچھائیں نہ سہی پھر بھی راشد کے نام سے آزاد نظم کی بغاوت وابستہ ہے۔

بیدار مغزی، سرکشی اور تشنگی کے ایک انوکھے امتزاج نے راشد کی آزاد نظم کو کلاسیکی درجہ عطا کر دیا ہے۔ مگر مجھے تو ان کا ذکر کرنا ہے جسے ثقہ ناقد نظر انداز کر رہے ہیں۔ اس سے پہلے پاکستانی ادب کے منظر نامے پر ایک سرسری نظر ڈالتے ہیں۔

پاکستانی نظم کے چند اقتباسات سنئے :۔

راشد : مرگِ اسرافیل پر آنسو بہاؤ
وہ خداؤں کا مقرب وہ خداوند کلام
موت انسان کی روح جا بر داں
آسمانوں کی ندائے بیکراں
آج ساکت مثلِ حرف ناتمام
مرگِ اسرافیل پر آنسو بہاؤ

فیض : ناگہاں آج مرے تارِ نظر سے کٹ کر
ٹکڑے ٹکڑے ہوئے آفاق پہ خورشید و قمر

اب کسی سمت اندھیرا نہ اُجالا ہوگا
بجھ گئی دل کی طرح راہِ وفا میرے بعد

مجید امجد: چونک کر میں نے دیکھا گلتے بکھر بکھرے کاغذ پر ایک میری نظم کے سارے حرف اب ان کے جبڑوں میں تھے۔ دیکھیں سچ کہتی ہیں جو اس گدلی یکسوئی میں بیٹھ کے کالی روشنائی کے ریزوں کو یوں گرم گرم چباتی ہیں۔

دیکھیں سچ کہتی ہیں واقعی باہر موت کی شرطوں پر جیتے ہیں جینے والے اکثر میرے تعاقب میں آتی ہیں۔ وہ آنکھوں کی گردش کرتی پتلیاں آنکھیں جو یوں اپنی پلکوں پر میرے لفظوں کو تولتے ہی میری نبضوں کے بقایوں کو بھی گن لیتی ہیں

ساقی فاروقی: دن گذرے اور موسم بدلے اور جگ بیت گئے۔ اک آواز تعاقب کرتی ہے۔ باہر آنے دو۔ درجنوں ڈاکٹروں اور سرجنوں کے ایکسرے کی خنک شعاعوں سے اجل کر دیکھ لیا۔ شہر بدل، ملک بدل دیکھ لیا۔ مگر لہو وہی صدا ہلکورے لیتی ہے۔ باہر آنے دو اس زنداں سے باہر آنے دو۔ شیر امداد علی پانی کی امانت غصب کئے۔ اپنے گھر میں زنجیر ہوئے بیٹھے ہیں۔ باہر پانی کھڑا ہے اور پانی میں پیپل کے پتوں کی طرح سایے خشمگیں آنکھوں والے پیلے مینڈک اپنا گھیرا ڈالے پڑے ہوئے ہیں

جیلانی کامران: لفظ نے میری خاک اڑائی لکھا عبرت ناک فسانہ
دنیا مجھ کو جان چکی ہے کورے خط کا اک پروانہ

بول کبوتر دانہ دانہ
مسجد کو گھر بار سمجھ کر میں نے لکھے خط ہزاروں غم کے کپڑے پہن کے نکلے میرے
یار کناروں عقل کی بازی جیت گیا کمزور گداگر اور دیوانہ
بول کبوتر دانہ دانہ

یہ شاید پاکستانی نظم کے چند اہم، کم اہم............ اقتباسات ہیں نتیجہ چہار سمتی تجربے سبق

انتظار اور ابھی اور ابھی ــــ مگر خوب سے خوب تر کی جستجو نہیں، تجربے اور تجربے۔ یہی پاکستانی نظم کا کلیدی لفظ ہے۔ اور احساس فکر میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ہمارے سامنے نئی نئی وفاداریوں کا مسئلہ ہے۔ ضمیر کی آواز ذات کا شعور و عرفان اور تخلیقی جرأت، سیاسی وفاداریوں کے سامنے بے معنی ہو کر رہ گئی ہیں۔ اسی لئے گوشۂ عافیت کے طور پر ہم دیومالا، تاریخ، تصوف قدیم داستانوں اور قصہ کہانیوں میں پناہ لے رہے ہیں۔ پھر مغربی ادب کی طرف چلے گئے ہیں اور وہاں کی باتوں کو دُہرا کر خوش ہو رہے ہیں۔ اپنی تہذیب کی تشکیل کو، نئی اقتدار کی تلاش و جستجو، اپنا مزاج بنانے اور سنوارنے کے کام کو ہم نے طاق میں دھر دیا ہے۔ یہی وہ المیہ ہے جس نے ہمارے ارد گرد کُہر کو اور گہرا کر دیا ہے۔" یہ ۱۹۶۱ء میں لکھا گیا تھا۔

میں نے یہ طویل اقتباس اس لئے دیا ہے کہ پاکستانی نظم اسی المیئے سے پچھلے ۲۵ سال سے دوچار ہے اور رہے گی۔ اس لئے کہ وہاں کا دانشور طبقہ احیاء پرستی، قدامت نوازی اور قدیم کلاسیکیت کو زندہ کرنے کی مسلسل کوشش کر رہا ہے۔ لیکن اس کے مدمقابل ایک چیخ کی طرح چند شاعروں کی نظمیں ہیں جو بغاوت، حقیقت، استعارے، علامت، زندگی اور اس کے ہزار ہا رنگ و نور، سائے اور تاریکی کو نئے نئے پیرایوں میں اظہار کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اکثر ناکام مگر زندہ تجربے، وہ دنیا کو طبقوں، رنگ و نسل میں بٹا ہوا دیکھ کر خود اسی مرض کا شکار نہیں ہوتے ہیں۔

آزاد نظم کو مقبول عام بنانے میں سب سے زیادہ پاکستانی شاعروں کا ہاتھ ہے اور اس حیثیت سے بھی انکار ممکن نہیں ہے کہ پاکستانی نظم ہندوستان کی شاعری پر اثر انداز ہوتی رہی ہے۔ عادل منصوری نے افتخار جالب کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا تھا

ہر ایک پنا لب ایک   افتخار جالب ایک

افتخار جالب سے مجھے کئی بار ملنے کا لاہور میں شرف حاصل ہوا تھا۔ زبان کی تشکیلِ نو کے سب سے بڑے داعی افتخار جالب تھے۔ اس لئے کہ اب وہ اپنے خیالات کو رد کر کے خاموشی اختیار کر چکے ہیں۔ نظم میں الفاظ کی ترتیب، اندرونی نغمگی، تہوں میں چھپا ہوا معنوی احساس، رگ رگ کر ابھرتی ہوئی بے صدا چیخ اور بھر نثراور نظم کی گری دیوار پاش پاش۔

——— کیوں آخر افتخار جالب نے استعارہ برائے استعارہ اور زبان کی تشکیل نو کو ایک دم سے رد کیوں کر دیا۔ اس سوال کا پورا جواب نہیں دیا جا سکتا۔ بلکہ اسی لئے کہ میں تو پاکستانی نظم کے سلسلے میں چھپے ہوئے چند سوالات کو اُبھارتا جاؤں گا۔ .... ایک جائزہ لینے کی کوشش نہیں کروں گا کیونکہ وہ ناموں اور بکھرے شعروں کی کھتونی بن کر رہ جائے گا۔ اصل بات یہ ہے کہ پاکستانی نظم اقبال کے اثر سے تو بہت پہلے نکل چکی تھی مگر وہ ایک مہلک مرض میں مبتلا ہو گئی۔ یعنی شاعروں اور ادیبوں کے ذمے (CULTURAL ROLE) ثقافتی رول کا یقین اور وضاحت اس مرض کی وجہ سے جو تجربے اور آوارگی کی آزادی تھی وہ خود اداکاری کا شکار ہو گئی۔

——— افتخار جالب اپنے ایک مضمون "نئی شاعری اور سویت زدہ تنقیدیں" میں لکھتے ہیں کہ "آپ ماضی میں کتنے ہی پیچھے کیوں نہ چلے جائیں آپ کو ایسی کوئی نسل انسانی نہیں ملے گی جو پبلک ورلڈ میں اتنے واشگاف طریقے سے زندہ رہی ہو جتنا کہ ہم رہ رہے ہیں۔ حد یہ ہے کہ ہمارے خوف اور خواب تک اجتماعی اور خارجی ہیں پھر بھی ہم ہیں کہ نہیں چاہتے کہ ہماری شاعری برون خانہ آئے۔" آج سے دس سال پرانی یہ رائے ہے اور اسی مضمون پر ترقی پسند شاعر حبیب جالب کی مدح ہے۔ یہ جملے سنئے "حبیب جالب نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ بارود کسی وقت بھی پھٹ سکتا ہے ان موضوعات کو اپنایا۔ عین ان حالات میں جب بزدلی کے جذبات ابہام اور استعارہ کے ذرائع یا جا بہ جا بڑے چشم پوشی کے مواقع مصلحت و مصالحت کی گنجائش اور بے عملی کے فواید وافر تھے براہ راست انداز تخاطب کو اپنایا ———"

——— مگر وہی بات جس جوش و خروش سے براہ راست تخاطب کو رد کیا گیا تھا اسی جوش کے ساتھ اپنایا گیا۔ ایک فرق کے ساتھ یعنی ہوش مندی کے ساتھ دوسرا حلقہ وزیر آغا کا ہے جو شاعری کو کاغذی پھولوں کی طرح سجاتا جاتا ہے۔ بے شک اس حلقے کے پاس اچھی نظمیں ہیں مگر میری بحث اچھی نظموں سے نہیں ہے۔ پاکستانی نظم نے جو روپ ریکھائیں پچھلے ۲۵ سال میں اختیار کی ہیں وہ پرانے معیارات کو رد کر کے حاصل کی ہیں۔ نئے آہنگ کی تلاش زبان کو آسان خیالات کو محسوس کرنے کی مسلسل کوششیں جذبے کو آواز میں ڈھالنے کے نئے پرانے ایک نہیں درجنوں شعرا نے یہ کام انجام دیا ہے اس لئے کوئی فہرست مکمل نہیں ہو سکتی۔

اس کے علاوہ پاکستانی نظم آواں گارد کے طور طریقے اپنانے کی لگاتار کوششیں کرتی رہی ہے۔ نثری نظموں کی جو نغگی اور شرف اعجاز احمد نے بخشی ہے وہ اردو شاعری کے لئے ایک انوکھی لذت رکھتی ہے اس سے پہلے یہ اندازہ ہی نہ تھا کہ نثری نظمیں اتنی پُر اثر اور با معنی بھی ہو سکتی ہیں۔

سب سے بڑی بات تو وہاں کی شاعرات نے کی جس میں فہمیدہ ریاض اور کشور ناہید پیش پیش ہیں۔ اسلامی معاشرے کی عورت نے اردو شاعری میں پہلی بار نہایت بے باکی اور ایمانداری سے شعری تجربوں کا ساتھ دیا اور مردوں کی بنائی ہوئی دنیا کے خلاف بغاوت کی۔ ظاہر ہے کہ تجربے اور بغاوت ادب میں انفرادی کوششیں ہوتی ہیں اکثر ناکام مگر ان کی اہمیت سے انکار کرنا ممکن نہیں ہے۔

پاکستانی نظم کی تعمیر میں جو عناصر مضمر ہے اس کے اجزا کا ذکر کیا جائے تو سب سے پہلے الفاظ کی انفرادی معنویت کا ذکر آئے گا یعنی شاعر اپنے الفاظ کو لغوی معنی سے لگ اور ہی معنی دیتا ہے یا دینے کی کوشش کرتا ہے۔ دوسری بات پیکر تراشی کی ہے تیسری آہنگ کی جستجو جس نے آگے چل کر نثری نظم کو جنم دیا۔ اور چوتھی بات شہری تجربے کی ہے۔ یعنی یہ چار اجزا پاکستانی نظم کی تعمیر میں پیش پیش رہے ہیں۔ نظم برائے زندگی یا برائے نظم، جی ہاں نظم برائے نظم کو بھی پاکستانی نظم برت چکی ہے۔ پاکستانی نظم میں جتنی تیزی سے تجربے اور تجزیے ہوتے رہے ہیں اس کا اندازہ لگانے کے لئے چند نظموں کے اقتباسات دیئے جاتے ہیں۔

افتخار جالب کی ایک 'نیلگوں افلاک' میں نے چھوا ہی نہیں بلور کا پھیلا ہوا خول دبیز میرے ہاتھوں میں نہیں شیشہ گری و شعبدہ بازی کا فن میں کیا کروں۔

سلیم الرحمٰن کی نظم　　سوالوں کا زنجیر ــــ ابتدا یہ میرا المیہ ہے

میں اس وقت اس کھیل میں آکے شامل ہوا

جب ہر ایک شکل

اپنے لہو کی مچلتی ہوئی آگ سے سرخ تھی

اختتام:　　میں اپنے سوالوں کی زنجیر میں قید ہوں

اور انکار کے رات دن سے گذرتا ہوں
میرے لئے معجزے اور پرانی کتابوں میں لکھی ہوئی ساری سچائیاں
مردہ نسلوں کی تاریک قبروں میں ملتی ہوئی تختیاں ہیں

اور آج محمد سلیم الرحمٰن پچھلے چند برسوں کی نظموں کے بارے میں کہتے ہیں "ان میں تین صفات نظر آئیں گی تشدد، اجتہاد اور خود کلامی۔ جہاں تک تشدد اور اجتہاد کا تعلق ہے وہ جذباتی بھی ہو سکتا ہے ہئیتی بھی لسانی بھی اور نظریاتی بھی اور بعض اوقات ان سب کیفیتوں کا ملغوبہ بھی۔ خود کلامی ان نظموں کا جزو اعظم ہے۔" محمد سلیم الرحمٰن نے جو ۲۵ نظموں کا انتخاب کیا ہے وہ تجرباتی ذہن کا ایک طرفہ انتخاب ہے۔ اس میں کراچی کے شعرا مثلاً عبداللہ علیم، اسد محمد خاں، فہمیدہ ریاض شامل نہیں ہیں مگر کوئی بھی انتخاب مکمل نہیں ہو سکتا۔ اس کا میں نے اس لئے ذکر کیا کہ اب پاکستانی نظم لاہور، کراچی اور سرگودھا کے مراکز کے نمائندہ شاعروں کی آوازوں پر مشتمل ہے اور ان میں EMPHASIS کے فرق کے ساتھ ساتھ رویئے اور نظریئے کا بھی فرق ہے۔ کچھ پاکستانی شاعر لندن اور امریکہ میں بھی ہیں۔ خاص کر ساقی فاروقی اور اعجاز احمد ہیں سمجھتا ہوں کہ انکا بھی پاکستانی نظم میں بڑا حصہ ہے۔ اس کے علاوہ زاہد ڈار کا بھی ذکر ضروری ہے مادھو کے نام سے اس کی یہ نظمیں سات رنگ میں شائع ہوئی تھیں تو ہنگامہ ہو گیا تھا۔ اب زاہد ڈار کے یہاں ٹھہراؤ سا آگیا ہے ورنہ اس کی نظموں کی اشاعت اکثر ہنگامہ خیز ہوتی تھی۔ ایک بالکل نئے شاعر سرمد صہبائی کی آواز آہستہ آہستہ ابھر رہی ہے کہ یہ اعجاز احمد کی نظم دیار پڑھنے کا وقت ہے:

یارب
میں ابھی زندہ ہوں
میری موت اک راز کی صورت چھپائے رکھنا
مجھے آج تک ایسی تاریکی کی تلاش ہے
جس میں لفظ سچ بولنے پہ قادر ہوں

اگلی بار مجھے ایسا وجود دینا
جس میں لفظوں کو ان باتوں کا علم ہو
جن کے اظہار پہ انہیں قدرت نہیں
اور اگلی بار بھی میں ناکام رہوں
تو ایک بار پھر ـــــ اور ـــــ ایک بار پھر

یہ زندگی تو پرانے کپڑوں کی طرح تار تار ہو رہی ہے

طارق زیدی[1]

نثری نظم

آج کی شاعری، آج کا ادب، آج کی مصوری، آج کے نظریات۔ لیکن یہ آج کیا ہے کب سے کب تک ہے۔ فن کی دنیا میں یہ تقسیم بے معنی ہے کہ یہاں تو ؎

فردا و دی کا تفرقہ یک بار مٹ گیا

ابھی جدید شاعری اپنے منطقی نتیجے موت کو پہنچ رہی تھی کہ آج کی شاعری کے نام پر ہئیت میں اجتہاد کا علم بلند ہو گیا۔ دو چار برس کی بات ہے کہ جدید تر شاعری کے نام لیوا اسے اردو میں واحد شعری امکان فرض کئے بیٹھے تھے اور آج کی شاعری کے ہمہ گیر فراڈ کے نام پر اردو شاعری اپنے تمام امکانات اور اپنی تمام ہیئتوں کے ساتھ متروک قرار دے دی گئی تھی۔ اگر غزل باقی تھی تو گلافتاب کی آخری غزلوں کے بل پر اور نظم باقی تھی تو مآخذ کی نظموں میں لیکن مولانا حالی کی نظم کی تحریک اور آزاد نظم کی تحریک کے برعکس اب کے عجیب بات دکھائی دی کہ شاعری تو بس واجبی واجبی ہی تھی نظموں کے بشکل ایک ڈیڑھ مجموعے تھے مگر بنام شاعری تنقیدی مضامین اور نظریاتی مفروضات .... کا ایک سیلاب تھا۔ مگر علم کی یہ بہتات شاعرانہ صداقت کی اس کمی کو پورا نہ کر سکی اور بالآخر جدید تر نظم اپنے تمام تر بلند آہنگ دعوؤں کے ساتھ اردو کے شعری . . . . وژن میں کوئی قابلِ ذکر اضافہ کئے بغیر اپنے انجام کو پہنچی اور ظفر اقبال اردو غزل کے واحد امکان ہونے سے تائب ہوئے۔ افتخار جالب کچھ یوں گئے کہ پھر ادب اور ادبی نظریہ سازی کی خبر تک نہ لی۔

بعینہ یہی صورت نثری نظم کے آغاز میں نظر آئی کہ یہاں بھی تنقیدی شور و غوغا ایک ہراول دستے کے طور پر پہلے نمودار ہوا پھر کچھ شاعری روانہ کی گئی اور پھر یہ بیان جاری کیا گیا۔ عروض کے آہنگ کا شعر میں پایا جانا بالکل ایسا ہی ہے جیسے مُردہ شیر کی کھال میں بھوسا بھر دیا گیا ہو۔ یہ بیان مبارک احمد کے مضمون "فن کی نئی توضیح" میں ملتا ہے لیکن اس طویل مضمون میں اور اس

[1] طارق زیدی بدھو ملی میں اردو کے استاد اور حلقۂ ارباب ذوق لاہور کے سکریٹری ہیں۔

کے دیگر ہمسفروں میں ایک بات مشترک تھی کہ تنقیدی نظریہ سازی کی بہتات کے باوجود شاعری کے حوالے صرف مبارک احمد کی اپنی نظموں سے پیش کئے گئے تھے اور اس پہ طرہ یہ کہ جو LINES خالص شاعری کی مثالوں میں درج کی گئی تھیں ان میں سے اکثر باقاعدہ بحر میں تھیں۔ دعوے اور اسی مضمون میں دعوے کی نفی کی۔ اس سے شاندار مثال ملنی ناممکن ہے۔ اس شور و غوغا کے آغاز کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر وزیر آغا کا دستہ بھی میدان میں کود پڑا۔ پھر اوراق نوائے وقت میں 'DAWN' میں ایک مباحثے کا آغاز ہوا۔ اس پورے مباحثے میں فریقین کی طرف سے مجرد بحثیں تو بہت تھیں لیکن نہ تو نثری شاعری کے حامی اپنے موقف کے ثبوت میں شاعری سے حوالے دیتے تھے اور نہ مخالف۔ لے دے کر وزیر آغا کے ہاں اگر حوالہ آیا تو ڈاکٹر تاثیر کی انشائے لطیف کا "آخری گیت" کا یا انیس مجتبیٰ کے "تبسم" کا۔ اس کے پس پردہ کون سے رویے تھے ان کا جائزہ ذرا ٹھہر کر لیا جائے گا۔ ایک نظر اس مجادلے میں شامل ادیبوں کے بنیادی موقف پر۔

قمر جمیل نے اپنے مضمون "پروز پویم" کے معیارات میں نقشے بنا کر بتایا کہ :

> پروز پویم کے لئے ضروری ہے کہ اس میں شعری اور جمالیاتی تجربہ موجود ہو اظہار نثر کے آہنگ میں ہوگا۔ لیکن بنیادی طور سے تجربہ شعری ہونا چاہیئے۔ پروز پویم ایک نئی جمالیات سے پیدا ہو رہی ہے جس میں نزاکت سے زیادہ توانائی اہمیت رکھتی ہے (گوئٹے کا فاوسٹ اور ہنری مور کے مجسمے) بھدا پن یا GROTESQUE بھی اس جمالیات کا ایک حصہ ہے اور یہ حصہ بھی پروز پویم کی مجموعی ہارمونی کا حصہ بن جاتا ہے۔

انیس فروغ کا خیال ہے کہ پروز پویم میں احساسات اور فیلنگ کا فطری اظہار ضروری ہے۔ پروز پویم تجربے کو مسخ ہونے سے بچا لیتی ہے۔ اس مقام پر روایتی شاعری اور نثری شاعری کے فرق کو سمجھانے کے لئے دو شکلیں بنا کر دکھاتے ہیں یہ نقشے کچھ نامکمل ہیں۔ اس لئے کہ ان سے یہ تو ظاہر ہو جاتا ہے کہ اچھی پابند شاعری کا باطن شعری ہوتا ہے اور بیرونی یا خارجی (OUTER) حصہ نثر کے آہنگ پر مشتمل ہوتا ہے لیکن اس سے پوری صورت حال واضح نہیں ہوتی۔ ایک ہی بحر میں ہونے کے باوجود ان دونوں غزلوں کی اندرونی موسیقی (SUBTERRANEAN MUSIC) علیحدہ ہوتی ہے۔ مثلاً ایک ہی بحر میں اکبر الہ آبادی اور حافظ کی غزل موجود ہے۔

لیکن ان دونوں غزلوں کی موسیقیت کی نوعیت اور اس کے درجے میں زمین اور آسمان کا فرق ہے۔ اسی طرح پابند شاعری اور نثری نظموں میں ایک طرف تو پیمایش شدہ آہنگ اور نثر کے آہنگ کا فرق ہے اور دوسری طرف اس کی اندرونی موسیقی میں بھی فرق ہوتا ہے۔ نثری نظم کی موسیقی نظم میں احساس، فکر، خیال، جذبہ اور تخیل کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ خود بھی تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ یعنی اس کی باطنی میلوڈی نظم کے ارتقا اور اس کے PATTERN کے ساتھ ساتھ بدلتی جاتی ہے۔"

بالکل یہی FORMULATION مآخذ کے دیباچے میں نظر آتی ہے۔ ملاحظہ کیجئے:

"جاننے کی سطح مستقیم باقی نہیں رہی۔ پہلے اشیا کا ادراک منظم طریق پر کیا جاتا تھا۔ چیزیں ایک باضابطہ ترتیب میں بندھ جاتی تھیں انھیں ایک زاویہ جان لینے کے بعد بآسانی پہچانا جاسکتا ہے۔ اب ہمارا علم کسی ایک سیدھی سمت میں نہیں بڑھتا۔ دیکھو تو ایک سرا نظر آتا ہے دوسرے کی خبر نہیں ہوتی۔ سب کچھ گنجلک اور بے ترتیب ہے۔ بعض مقامات پر لا ینحل!! الٹی سیدھی سمت میں بڑھتی موجیں ایک دوسرے سے دراَویزاں ہیں۔ آڑے ترچھے خطوط ایک دوسرے کو کاٹتے ہیں۔ بوقلموں پیچیدگی کا منظر ابھرتا ہے۔ پھر سے دیکھیں تو شوخ اور دھندلے رنگوں کا معمورہ ہے جس کی اپنی پلاسٹک ہیئت ہے۔"

مندرجہ بالا بیانات کے برعکس وزیر آغا کا خیال تھا کہ:

"جب کوئی امیج داخلی آہنگ تک محدود رہے اور خارجی آہنگ کی دھڑکن میں مبتلا نہ ہو تو وہ شعری امیج کے مقام تک نہیں پہنچ پاتا بلکہ نثری امیج کی سطح پر ہی رہتا ہے۔۔۔۔ شعر یت ایسی مخصوصیت کا حامل ہوتا ہے جس میں شعری آہنگ کے داخلی اور خارجی دونوں عناصر باہم شیر و شکر ہو چکے ہوتے ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ شعری امیج بجائے خود ایک ایسی پیچیدہ اکائی ہے جو نثری آہنگ کی اکہری حالت سے بالکل مختلف ہے ثبوت اس کا یہ ہے کہ اگر آپ شعری امیجز کی حامل کسی نظم کو سلیس نثر میں منتقل کریں تو آپ دیکھیں گے کہ اس کے جملہ شعری امیجز نثری امیجز تک تبدیل ہو گئے اور نظم کا سارا جادو ہی

ختم ہو کر رہ گیا۔ اسی طرح اگر آپ اردو کی کسی نظم یا شعر کو انگریزی میں منتقل کریں تو آپ فوراً محسوس کریں گے کہ اصل جادو یا اسرار (MYSTERY) غائب ہو گیا ہے۔ وجہ یہ کہ شعر کا جادو تو لفظوں کی ایک خاص پراسرار ترتیب کے تابع ہے اور امیج بھی اس خاص ترتیب کا حصہ بن کر ہی شعریت سے لبریز ہوتا ہے جب یہ ترتیب برباد ہوتی ہے تو امیج سے اس کی شعریت چھن جاتی ہے اور شعر کا تاثر زائل ہو جاتا ہے۔ مثلاً آپ غالب کا یہ شعر لیں : ؎

ہے کہاں تمنّا کا دوسرا قدم یا رب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

اور اسے نثر میں یوں منتقل کریں :

یا رب
تمنا کا دوسرا قدم کہاں ہے
ہم نے دشت امکاں کو ایک نقشِ پا (کی صورت میں) پایا ہے

تو آپ دیکھیں گے کہ شعری ترتیب کو نثری ترتیب میں منتقل کر دینے سے جادو کی وہ ساری کیفیت غارت ہو گئی جس سے شعر کا تاثر عبارت تھا۔ سوال یہ ہے کہ جادو کی یہ کیفیت کن عناصر سے مرتب ہوئی تھی اور کس طرح وجود میں آئی تھی کہ اس کی محض ایک اینٹ سرکانے سے ساری عمارت ہی ڈھے گئی . . . . . شعری آہنگ اور نثری آہنگ کے فرق کا ذکر چھڑا ہے تو مجھے کہنے کی اجازت دیجئے کہ آہنگ صرف ادب تک محدود نہیں، موسیقی کا بھی آہنگ ہوتا ہے اور پلاسٹک آرٹس کا بھی۔ اسی طرح روشنی کا بھی آہنگ ہے اور فطرت کا بھی بلکہ ایک کائناتی آہنگ بھی ہے جس کی تال پر سارا عالم ہئیت دھڑکتا چلا جا رہا ہے۔ گویا ہر شے کا آہنگ ہی دراصل اس کی پہچان ہے لہٰذا نثر کا تشخص اس کے نثری آہنگ سے اور شعر کا شعری آہنگ سے ہوگا۔ نثری نظم کے نام لیوا نثر کے عام آہنگ (GENERAL - RHYTHM) اور نثر کے فنی آہنگ (ARTISTIC RHYTHM) میں تو تمیز کر لیتے ہیں مگر فنی آہنگ اور شعر کے شعری آہنگ کو بالعموم خلط ملط کر دیتے ہیں۔

حالانکہ نثر جب نثری ادب کا لبادہ پہنتی ہے تو یہ فنی آہنگ کے باعث ہوتا ہے نہ کہ شعری آہنگ کے باعث۔ شعری آہنگ کے سلسلے میں مختلف نظریات مثلاً GRAPHIC کے نظریے یا PROSODY کے نظریے یا پھر MUSICAL کے نظریے ACOUSTIC METRES کے نظریے کا تفصیلی ذکر کروں تو بات تکنیکی سی ہو جائے گی جبکہ یہاں صرف اس بات کو واضح کرنے کی ضرورت ہے کہ شعری آہنگ بنیادی طور پر نثری آہنگ سے بالکل مختلف شے ہے اور نثری نظم کے نام لیواؤں نے ان دونوں کو خلط ملط کر کے محض گرد اڑانے کی کوشش کی ہے۔"

مندرجہ بالا بیانات سے ظاہر ہے کہ ان متخالف گروہوں میں بنیادی اختلاف نمبر ا نثر اور شاعری نمبر ۲ نثر اور نظم کے فرق کا ہے اور اس مسئلہ کو قمر جمیل نے یوں حل کیا ہے:

"اگر عمارت انڈے کے ڈیزائن پر ہو تو انڈا نہیں ہوتی جدید عمارت ہوتی ہے بس اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر شاعری یا نظم کا فارم نثر کی طرح ہو اور اس کے اندر شاعری ہو تو یہ نثر نہیں، ہوتی شاعری ہوتی ہے۔"

اپنے خوب صورت اسلوب کے باوجود یہاں نثری نظم کی حمایت کی بنیادیں منطقی نقطۂ نظر سے مضبوط نہیں ہیں کہ ہئیت فی نفسہٖ ایک NO MAN'S LAND ہے۔ سو محض ہئیت کی حمایت یا مخالفت میں دلائل فراہم کرنا ایک مہمل کوشش ہے۔ ان طویل اقتباسات کے لئے میں معذرت خواہ نہیں کہ نثری نظم کے سلسلے میں جو نظریاتی FORMULATION سامنے آئی ہے اس کو کسی قدر واضح کرنے کے لئے یہ ضروری تھا۔

۲

اس وقت بنیادی طور پر نثری نظم دو اسالیب میں منقسم ہے۔ ایک اسلوب تو قمر جمیل اور ان کے ساتھ کے دوسرے لوگوں کا ہے جس میں ایک LYRICAL انداز دکھائی دیتا ہے اور یہ نظمیں دراصل غزل کے مزاج میں لکھی گئی ہیں۔ ثروت حسین کی دو نظمیں ملاحظہ ہوں۔

نظم

رات کے نئے درختوں کو کیا معلوم کہ ان کی بھرپور شاخوں پر اُگے ہوئے
پتوں سے بھی کہیں زیادہ
صبحیں اور شامیں ہیں جو ہم نے انہی کھلے میدانوں میں بتائی ہیں
جنگلی بیر کی جھاڑیوں، نیم کی اونچی چوٹیوں اور سرخ کھپریل
کی انہی چھتوں پر دھوپ اور چاندنی کو اترتے سنا ہے
کچھ بہت ہی پرانے درختوں پر ہمارے نام
اب بھی کھدے ہوئے ہیں
راستے کے نئے درختو، اپنی خنک چھاؤں
ہماری راہ میں نچھاور کرو
ہم تمہارے بزرگوں کی عمر کے ہیں

ایک لڑکی سے ملاقات

بس اتنا یاد ہے
سرخ پنکھڑیوں والا ایک پھول تھا
جو دھول بھرے سمندر سے گزرتے ہوئے گم ہوا
اے خوب صورت آنکھوں والی لڑکی
میرے قریب آ
وہ پھول تجھ میں جل رہا ہے

ثروت حسین کی نظمیں اب تک اس مزاج کی نثری نظموں میں اہم ترین ہیں کہ ثروت حسین غزل، قطعات، پابند نظم اور آزاد نظم میں شاعری کے اچھے نمونے پیش کر چکے ہیں اور ان کے کلام پر ایک نظر ڈالنے سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان کی شاعری کسی ناقد کے زیرِ سایہ پروان نہیں چڑھی۔

اسی طرح کی نظمیں عذرا عباس، فاطمہ حسن، انور سن رائے اور فراست رضوی کے ہاں بھی دکھائی دیتی ہیں لیکن شاعری کے نقطۂ نظر سے جو فرق ہے وہ عذرا عباس اور فاطمہ حسن کی ان نظموں سے ظاہر ہے۔

وہ دن — عذرا عباس

یوں ہی چلتے چلتے
یا کسی پیڑ کے نیچے
ہانپتے
سانس لیتے
پرندوں کی مانند
وہ دن بھی
گزر گیا

فاصلے — فاطمہ حسن

میں نے اپنے آپ کو
خود سے دور رکھا ہے
میری ذات میں تم تھے
اور تم نے دوری چاہی ہے

بہرحال اس پوری شعری صورت حال میں جو تنقیدی مباحث کی وجہ سے مہمل ہوتی جاتی ہے نثری نظم سوائے ثروت حسین کے اور کہیں بھی کوئی ایسا نمونہ پیش نہ کر سکی جس سے اسے اردو شاعری کا واحد امکان سمجھا جا سکے اور لطف یہ ہے کہ ثروت حسین غزل اور آزاد نظم میں آج بھی نثری نظموں سے زیادہ بہتر شاعری کر رہے ہیں۔

LYRICAL شاعری کے برعکس فہیم جوزی، مسعود منور، نسرین انجم بھٹی، مبارک احمد اور

شائستہ حبیب ہیں کہ ان کے نزدیک آج کی شعری جمالیات دراصل رزمیہ کی جمالیات ہے۔
اسی لئے فہیم جوزی کی طویل نظمیں اور "نفرت کا رزمیہ" کے کینٹوز اس مکتبۂ شعر کے نمائندہ قرار
دیئے جاسکتے ہیں۔ مثلاً

"میں زرد کرنوں کے زوال کی آخری نشانیاں دفن کر رہا ہوں
اترتے چڑھتے دریاؤں کے بے آباد کناروں پر دھوپ
کی کھیتیاں اُگانے کے خواب مرجھانے لگے: نہیں نہیں!
اے ظلم کی ہواؤ رک جاؤ کہ میرے محبوب کا قافلہ
پڑاؤ کے بعد آغاز سفر کی پہلی منزل میں ہے
لرزہ میرے ہاتھوں میں کدال کی طرح تن گیا ہے۔ لبوں
پر نفرت کی کپکپاہٹ آتی جاتی سانس ہے کہ دن
کے ترازو میں رات تُل رہی ہے۔ میرے کانپتے ہاتھ
سوچتے ہیں اور میری آنکھیں
جو کسی منزل کے نشان کی سمت بن گئی ہے۔ اپنے پیاروں
کی قسم فقط ان کے لئے روشن ہیں جو آنسوؤں کی مٹی میں
بصارت کی کلیاں اُگاتے ہیں
میرے پیاروں کے جسم پر زخموں کی جتنی دراڑیں ہیں
اتنے ہی راستے ہیں ـــــ راستے ہی راستے بشارتوں
کی بارشوں میں کھلتے ہوئے
اور خوابوں کے بادبانوں سے کھیلتے ہوئے"

فہیم جوزی کی نظم کے برعکس نظمیں سنانے سے میں خود گریز کر رہا ہوں کہ میں آپ کو مزید بور کرنا نہیں چاہتا۔ بہرحال بات نثری نظم کی روایت قایم کرنے پر ہو رہی تھی۔ مبارک احمد نے نثری نظم کی روایت کچھ یوں متعین کی ہے: پابند نظم، آزاد نظم، جدید تر نظم اور نثری نظم ـــــ قمر جمیل اس کارشتہ ریمبو اور ورلین کی نثری نظموں سے جوڑتے رہے اور اس رابطے کو مشرق

کی صنمیات اور اسلامی تصوف کی روایت میں پرو کر دیکھا گیے۔ اس کا تذکرہ ان کی گفتگو "ڈرائنگ روم" میں ملتا ہے۔ اس کے برعکس ڈاکٹر وزیر آغا اور محمد علی صدیقی نے اس کا تعلق انشائے لطیف ٹیگور کے نثر پاروں اور خلیل جبران کی تحریروں سے قایم کیا ـــــ یہ دونوں کوششیں روایت کے یک رخے تصور پر مبنی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے "آج کی شاعری" کے نعرے کو ایک ہمہ گیر فراڈ قرار دیا ہے۔ اس لئے کہ ادب کی ساری روشیں اور ساری جہتیں بہ یک وقت موجود ہوتی ہیں اور فن کار تو اس وقت تک معتبر ہوتا ہی نہیں جب تک ادب کی پوری تاریخ کا سرمایہ اس سے اپنا ظہور نہ کرے۔ بہرحال فی الحال ہمیں نثری نظم کا اس کے متوازی موجود شعری رویوں سے ملا کر جائزہ لینا ہوگا اور ماضی کی ادبی تاریخ کو سامنے رکھ کر اس کے مقام کا تعین کرنا پڑے گا۔

۳

نثری نظم کے حامی اس ہئیت کو تیسری دنیا میں جنم لیتے ہوئے ایک آزادی کے شعور سے مربوط جانتے ہیں اور ثبوت میں وہ سوہوں کی WILD GRASS کا حوالہ دیتے ہیں۔ دوسری طرف اسے مکاشفات کی روایت سے منسلک کرکے الہامی کتابوں کے آہنگ کے تابع کہا جاتا ہے۔ جہاں تک اول الذکر کا تعلق ہے تو چینی شاعری میں نثری پیرایۂ بیان کئی صدی قبل مسیح سے استعمال ہو رہا ہے اور قدیم شاعری میں اس کی روایت چی فو کے نثری رزمیے سے چلتی ہے۔ جو بہ یک وقت چینی ادب میں تنقید کا ماخذ بھی ہے اور MAXIMS کی روایت سے قریب بھی۔ اب رہ گئے مکاشفات سے تعلق، تو اسے میں شاعری کی بجائے SURREALISTIC FICTION سے زیادہ قریب سمجھتا ہوں کہ اس میں وہ تاثیریت مفقود ہے جس پر آج کے نثری شاعر زیادہ زور دے رہے ہیں۔ بفرضِ محال ہم اسے نثری شاعری کی روایت تسلیم بھی کرلیں تو سب سے اہم سوال یہ اٹھے گا کہ وہ کونسی نثری نظمیں ہیں جو الہامی کتابوں کے آہنگ اور صوفیانہ مکاشفات کی ایک کائنات ترتیب دیتی ہیں ـــــ ظاہر ہے کہ اب تک جو نثری نظمیں ہمارے سامنے آئیں ان سے ایسی کوئی بات ظاہر نہیں ہوتی اور ادب میں امکان محض کی بنیاد پر کوئی فیصلہ صادر نہیں کیا جاسکتا۔ دوسری صورت مولانا حالی کے بعد اردو نظم کی روایت ہے

جس میں اور بہت سے شاعروں کے ساتھ اقبال اور مجید امجد کے نام ملتے ہیں۔ کچھ ہی عرصے کی بات ہے کہ مجید امجد کے ایک نقاد کو ان کی کچھ نظموں پر نثری نظم کا گمان ہوا۔ لیکن بعد ازاں یہ بات غلط ثابت ہوئی۔ یہ غلط فہمی اپنی مضحکہ خیزی سے قطع نظر اردو شاعری میں ایک اہم واقعہ یوں ہے کہ اس سے ایک بات تو بہرحال ثابت ہو جاتی ہے کہ عروض کا نظام بھی اپنی انتہائی صورت میں ایک نثری آہنگ کو اپنے اندر اس طرح سمیٹ سکتا ہے کہ یہ غلط فہمی پیدا ہونے لگے کہ یہ چیزیں نثر میں لکھی گئی ہیں۔ دوسری اہم بات نثری نظم کے حامیوں کی وہ غلط فہمی ہے جو انھیں عروض کے آہنگ سے متعلق ہوئی۔ کہ ان کے خیال میں عروض ایک طریقۂ اظہار ہے اور تجربے کے اظہار کے لئے ایک جبر ہے۔ لہٰذا اس سے چھٹکارا پانا ضروری ہے۔ حالانکہ عروض کی حیثیت طریقۂ اظہار کے بجائے طریق مشاہدہ Method of Perception کی ہے۔ ہر زبان اپنے طور پر ادراک کے ایک وسیع طریقۂ کار سے عبارت ہے اور اسی لئے ہر مزاج کی زبان کا اپنا ایک عروضی نظام ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ فنی حقیقت اور علمی حقیقت میں سب سے اہم فرق یہ ہے کہ علمی حقیقت میں اضافہ ہمیشہ اس سے پہلے موجود ایک حقیقت کو باطل قرار دینے کے بعد ہوتا ہے۔ جب کہ فنی حقیقت دریافت شدہ آفاق کی بنیاد پر وسعت حاصل کرتی ہے اور اس میں ایک حقیقت دوسرے کے تضاد میں قائم نہیں ہوتی لہٰذا نثری نظم کو اردو کی پوری شعری روایت کے تضاد میں دیکھنا کوتاہ بینی کا ثبوت ہے اور یہی وہ نقطۂ نظر ہے جس کے باعث اس ہئیت کے مخالفوں کو ایک ویسا ہی متشددانہ اور موقف اختیار کرنا پڑا۔ میرے خیال میں اردو کے شعری منظرنامے کے ہزارہا امکانات میں سے ایک امکان نثری نظم بھی ہے اور یہ ہئیت آزاد نظم، غزل، حتیٰ کہ قصیدے اور مثنوی تک سے ایک زندہ رشتے میں موجود ہے۔ اس بات کا ثبوت نثری نظم پر ناصر کاظمی، منیر نیازی، صلاح الدین محمود، اقبال اور میر تک کے وہ اثرات ہیں جو اب تک ایک کُل میں نہ ڈھل سکے لیکن یہ POTENTIAL صرف چند شاعروں کے ہاں نظر آتا ہے۔

اب تک نثری نظم دراصل شاعری کے فلاپ CASES کو زندہ کرنے کی کوشش کرتی رہی ہے۔ نثری نظم کے اماموں میں مبارک احمد، قمر جمیل اور عارف عبدالمتین نظر آتے ہیں اور اتفاق یہ ہے کہ ایک قدر ان تمام میں مشترک ہے کہ یہ مستند غیر شاعر ہیں۔ ان کی نثری

نظموں میں شاعری ہو نہ ہو، بہرحال ان کی غزلیں اور آزاد نظمیں نثر سے بھری پڑی ہیں۔ اب رہ گئے نوجوان شاعر تو ان میں سے کچھ بے چارے تو ان بزرگوں کے تتبع میں زندگی گزار رہے ہیں البتہ دو تین نام مثلاً ثروت حسین اور نسیم جوزی کا تذکرہ ہو چکا ہے۔ نسرین انجم بھٹی کے ہاں بھی شاعرانہ عنصر ملتا ہے البتہ مسعود منور کی نثری نظمیں اس کی پابند اور آزاد نظموں سے بدرجہا بہتر ہیں۔

اس وقت جو تضاد نثری نظم کے حامیوں اور مخالفوں میں نظر آتا ہے اس کی وجہ مجردات سے COMMIT کرنے کی صورت حال ہے۔ افسانہ ایک مجرد تصور کی حیثیت میں میرے لئے اہمیت نہیں رکھتا اور اگر انتظار حسین کا افسانہ مجھے اچھا لگتا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں اُن کی ہم پانی پتی کی بھی حمایت کروں کہ وہ بھی افسانہ نگار ہیں۔

شعری قوت کی ہئیت سے مطابقت اس کے مقام کا تعین کرتی ہے نہ کہ ہئیت حاصل ہونے والی آسانیاں یا مشکلات۔ چنانچہ میں سمجھتا ہوں کہ نثری نظم کی حمایت میں کمربستہ ہونا یا اس کو یک قلم مسترد کر دینا دراصل ایک سکے کے دو رُخ ہیں۔ اصل اہمیت تو فن کار کی ذات کو حاصل ہے اور اردو تنقید فن کار کی ذات سے بے خبر مجردات کے ایسے علمی گورکھ دھندے میں پھنس گئی ہے جہاں نظریات کو اشعار پہ نافذ کر کے نتائج نکالنے کا عمل تیز اور تیز تر ہوتا جاتا ہے۔

ادارے کا مقالہ نگار کے خیالات سے متفق ہونا ضروری نہیں۔

"غزل کی یہ جرأت صرف انھیں کا حصہ ہے، جو نثری نظم کے عہد کی روح کو خود میں زندہ پاتے ہیں۔ نئی تعمیر شدہ سڑکوں پر چلنے کے لئے عام نہج سے ہٹ کر چلنے کے لئے اپنی ہی تربیت کی ضرورت ہے۔ نئی تعمیر شدہ سڑکوں پر چلنا آسان کام نہیں ہے۔ اس کے لئے یہ رسک لینا پڑتا ہے کہ اگر ہم اس سڑک پر چلنے کے لئے پیدا نہیں ہوئے تو کم از کم اس سڑک کی تعمیر کا حصہ ہی بن جائیں گے۔"

اقبال فریدی

ڈھونڈتا پھرتا ہے خیال

فیض احمد فیض

آج اک حرف کو پھر ڈھونڈتا پھرتا ہے خیال
مدھ بھرا حرف کوئی، زہر بھرا حرف کوئی
دل نشیں حرف کوئی، قہر بھرا حرف کوئی
حرفِ اُلفت کوئی، دلدارِ نظر ہو جیسے
جس سے ملتی ہے نظر بوسۂ لب کی صورت
اتنا روشن کہ سرِ موجۂ زر ہو جیسے
صحبتِ یار میں آغازِ طرب کی صورت
حرفِ نفرت کوئی شمشیرِ غضب ہو جیسے
تا ابد شہرِ ستم جس سے تبہ ہو جائیں
اتنا تاریک کہ شمشان کی شب ہو جیسے
لب پہ لاؤں تو مرے ہونٹ سیہ ہو جائیں

آج ہر سُر سے ہر اک راگ کا ناتا ٹوٹا
ڈھونڈتی پھرتی ہے مطرب کو پھر اس کی آواز
جوششِ درد سے مجنوں کے گریباں کی طرح
چاک در چاک ہوا آج ہر اک پردۂ ساز
آج ہر موجِ ہوا سے ہے سوالی خلقت
لا کوئی نغمہ کوئی صوت تری عمر دراز
نوحۂ غم ہی سہی شورِ شہادت ہی سہی
صورِ محشر ہی سہی بانگِ قیامت ہی سہی

سپاہی کا مرثیہ

فیض احمد فیض

اٹھو اب ماٹی سے اٹھو
جاگو میرے لال
اب جاگو میرے لال
گھر گھر بکھرا بھور کا کندن
گھور اندھیرا اپنا آنگن
جانے کب سے راہ تکے ہیں
بالی دلہنیا، بانکے ویرن
سونا تمہرا راج پڑا ہے
دیکھو کتنا کاج پڑا ہے
بیری براجے راج سنگھاسن ۔ تم ماٹی میں لال
اٹھو اب ماٹی سے اٹھو ۔ جاگو میرے لال
ہٹ نہ کرو ماٹی سے اُٹھو ۔ جاگو میرے لال
اب جاگو میرے لال

غزل

فیض احمد فیض

وہ بتوں نے ڈالے ہیں وسوسے کہ دلوں سے خوفِ خدا گیا
وہ پڑی ہیں روز قیامتیں کہ خیالِ روزِ جزا گیا
جو نفس تھا خارِ گلو بنا، جو اُٹھے تو ہاتھ لہو ہوئے
وہ نشاطِ آہِ سحر گئی وہ وقارِ دستِ دعا گیا
جو طلب پہ عہدِ وفا کیا تو وہ قدرِ رسمِ وفا گئی
سرِ عام جب ہوئے مدعی تو ثوابِ صدق و صفا گیا
وہ دوائے درد کی ابتدا وہ کہ جس سے یار تھے آشنا
وہ ادائے موسمِ گل گئی وہ مزاجِ بادِ صبا گیا
ابھی بادبان کو تہہ رکھو، ابھی مضطرب ہے رُخِ ہوا
کسی راستے میں ہے منتظر وہ سکوں جو آکے چلا گیا

نظم

فیض احمد فیض

جب سورج نے جاتے جاتے
اشکِ آباد کے نیلے افق سے
اپنے سنہری جام
میں ڈھالی
سرخیٔ اوّلِ شام
اور یہ جام
تمہارے سامنے رکھ کر
تم سے کیا کلام
کہا
پرنام
اٹھو اور اپنے تن کی سیج سے اٹھ کر
اک شیریں پیغام
ثبت کرو اس شام
کسی کے نام
کنارِ جام

شاید تم یہ مان گئیں
اور تم نے
اپنے لبِ گلفام
کیے انعام
کسی کے نام
کنارِ جام
یا شاید تم
اپنے تن کی سیج پہ سج کر
تھیں محوِ آرام
کہ رستہ تکتے تکتے
بجھ گئی شمعِ جام
اشکِ آباد کے نیلے افق پر
غارت ہو گئی شام

●

صلیبِ انقلاب

پروفیسر منظور حسین شورؔ

ب گنگا و جمنا مجھے واپس کر دے
میرے سورج کا اُجالا مجھے واپس کر دے
میں سلگتا ہوں تو پھر تو نہ ہوا دے مجھ کو
میرے معبود! کوئی اور سزا دے مجھ کو

یا مٹا دے دلِ تاریخ سے تاریخ کے داغ
یا بجھا دے مرے ماضی کے سحر تاب چراغ
اِن چراغوں کا اُجالا نہ بنا دے مجھ کو
میرے معبود! کوئی اور سزا دے مجھ کو

چھین کر مجھ سے مرے کاہکشان و مہتاب
عوضِ کارواں دے کے مجھے ریگِ سراب
نخلِ ماتم سرِ صحرا نہ بنا دے مجھ کو
میرے معبود! کوئی اور سزا دے مجھ کو

یہ حوادث کا سمندر کہ ہیں جس میں غرقاب
میرے اجداد کی غیرت، مری تہذیب کے خواب
اِس سمندر کے نہ سینے میں چھپا دے مجھ کو
میرے معبود! کوئی اور سزا دے مجھ کو

قتلِ آدم ہے اگر قوم و وطن کی تعبیر
تا تاریک ہے گر نیّرِ اعظم کا ضمیر
دورِ منظومۂ شمسی سے ہٹا دے مجھ کو
میرے معبود! کوئی اور سزا دے مجھ کو

رمزِ گرداب، نہ دریا کا اشارا سمجھا
سب نے "سیلاب" کہا میں نے کنارا سمجھا
اِس سے آگے مری جرأت نہ بڑھا دے مجھ کو
میرے معبود! کوئی اور سزا دے مجھ کو

انقلابوں کا یہ شب خون، حوادث کا یہ خواب
میری ہجرت ہے کہ صدیوں کے گناہوں کا عذاب
اب مرے خواب کی تعبیر بتا دے مجھ کو
میرے معبود! کوئی اور سزا دے مجھ کو

ہڈیاں جس میں ہوں تہذیبِ کہن کی مدفون
جس کے پرویز پیا کرتے ہوں فرہاد کا خون
اُس خرابات کا حافظ نہ بنا دے مجھ کو
میرے معبود! کوئی اور سزا دے مجھ کو

ہوں جہاں اتنے کفن زرد مزاروں کے امین
اتنے ٹکڑوں میں ہو تقسیم جہاں اتنی زمین
اک لحد بھی نہ سرِ دشتِ بلا دے مجھ کو
میرے معبود! کوئی اور سزا دے مجھ کو

اپنے چہرے پہ لہو اپنے وطن کا ملنا
کس سے ممکن ہے بھرے شہر میں تنہا چلنا
کربِ تعزیر بانداز خطا دے مجھ کو
میرے معبود! کوئی اور سزا دے مجھ کو

تیز تر جب بھی ہوئی صرصرِ غربت کی سنک
میرے مرہم نے بھی چھڑکا مرے زخموں پہ نمک
تازہ مرہم نہ کوئی میرے خدا دے مجھ کو
میرے معبود! کوئی اور سزا دے مجھ کو

برہمن مجھ سے خفا، اہلِ حرم مجھ سے نفور
سینکڑوں میل میں اجداد کی قبروں سے بھی دور
میں ہوں مجرم، تو مرا جرم بتا دے مجھ کو
میرے معبود! کوئی اور سزا دے مجھ کو

اب بھی دھرتی ہے جو انسان کے لہو سے نم
اب بھی گو کعبہ و بُت خانہ ہیں صرفِ ماتم
اتنا غم تو نہ عطا کر جو ہنسا دے مجھ کو
میرے معبود! کوئی اور سزا دے مجھ کو

میں نے اک عمر سنا، سازِ حوادث کا سرود
میں نے اک عمر پڑھا گردشِ دوراں کا درود
اب کسی حشر کی آواز سنا دے مجھ کو
میرے معبود! کوئی اور سزا دے مجھ کو

جنبشِ لب بھی جہاں جانِ فلاطوں کو ہو قہر
جس کے زندانوں میں سقراط پیا کرتے ہوں زہر
میں ہوں اُس شہر کی دیوار تو ڈھا دے مجھ کو
میرے معبود! کوئی اور سزا دے مجھ کو

زہر ہر سانس میں پینا نہیں آتا مجھ کو
زندگی کا یہ قرینہ نہیں آتا مجھ کو
شیوۂ مرگِ بالاقساط سکھا دے مجھ کو
میرے معبود! کوئی اور سزا دے مجھ کو

قہرِ ادراک ہے اُس دانش و حکمت کا شعور
جس کے مرہم سے سلگتے ہوں جگر کے ناسور
دعوتِ ہوش، نہ حکمت کی صلا دے مجھ کو
میرے معبود! کوئی اور سزا دے مجھ کو

کج کلاہوں کی ثنا جن کے ضمیروں کی ہو دام
یہ غلام ابنِ غلام، ابنِ غلام ابنِ غلام
اِن غلاموں کی صفوں میں نہ جگہ دے مجھ کو
میرے معبود! کوئی اور سزا دے مجھ کو

میری گفتار بھی تقصیر، مری چپ بھی گناہ
مرا مہتاب بھی تیرہ، مرا سورج بھی سیاہ
صلۂ فن نہ مرے فن سے سوا دے مجھ کو
میرے معبود! کوئی اور سزا دے مجھ کو

یہ ضمیروں کی تجارت، یہ دل و دین کا سود
اک حرم پر ہوں جہاں دام فگن اتنے یہود
اِن یہودانِ حرم میں نہ ملا دے مجھ کو
میرے معبود! کوئی اور سزا دے مجھ کو

جھوٹ جائز مری سنت میں نہ تزویر مباح
فن کا محتسب نہ ہنر کا میں حسن بن صباح
خلعتِ میر نہ غالب کی قبا دے مجھ کو
میرے معبود! کوئی اور سزا دے مجھ کو

کربِ احساس نہ دے، طاقتِ گفتار نہ دے
میرے لب سی کے مجھے جرأتِ اظہار نہ دے
میں ہوں انسان تو پتھر کا بنا دے مجھ کو
میرے معبود! کوئی اور سزا دے مجھ کو

شہریاروں کی نمک خوار نہیں میری اَنا
مجھ کو اِس جرمِ شکم زاد کا مجرم نہ بنا
صلۂ مدح، نہ انعامِ ثنا دے مجھ کو
میرے معبود! کوئی اور سزا دے مجھ کو

میر و سلطاں کا قصیدہ مجھے منظور نہیں
بیعتِ خس کسی طوفان کا دستور نہیں
کاسۂ فقر، نہ کشکولِ گدا دے مجھ کو
میرے معبود! کوئی اور سزا دے مجھ کو

جھوٹ کا جرم، جہاں اَسفل و عالی کا ہو دین
ہر صنم کو ہو جہاں اپنی خدائی کا یقین
اُس صنم خانے کا آذر نہ بنا دے مجھ کو
میرے معبود! کوئی اور سزا دے مجھ کو

خونِ آدم سے جہاں کرتے ہوں حجاج وضو
انبیا ملتے ہوں چہروں پہ جہاں آکے لہو
ایسے کعبے کا نہ بوجہل بنا دے مجھ کو
میرے معبود! کوئی اور سزا دے مجھ کو

آفتابوں کو ہو جب اپنے اُجالوں سے گزند
فیضِ تزویر سے جب جعفر و صادق ہو بلند
تو کہیں جعفر و صادق نہ بنا دے مجھ کو
میرے معبود! کوئی اور سزا دے مجھ کو

جس کی تاریخ کا شہکار ہو قتلِ شبیرؓ
جس کے بازار میں بکتے ہوں یزیدوں کے ضمیر
پھر وہ کعبہ نہ پسِ کرب و بلا دے مجھ کو
میرے معبود! کوئی اور سزا دے مجھ کو

جب جنازوں پہ کھڑے ہو کے اذاں دیں تیمور
شب کی ظلمات میں تحلیل ہو جب صبح کا نور
تو مری صبح کی ظلمت سے بچا دے مجھ کو
میرے معبود! کوئی اور سزا دے مجھ کو

کتنی سنگین چٹانوں سے کیا میں نے کلام
میں نے کن برف کے تودوں پہ لکھا آگ کا نام
سازِ زرتشت نہ گوتم کی صدا دے مجھ کو
میرے معبود! کوئی اور سزا دے مجھ کو

میں ہوں اُس قتل گہ دیدہ وراں میں مصلوب
کہ جہاں صبح کا سورج ہو دمِ صبح غروب
میں ہوں سورج تو پھر اتنی نہ ضیا دے مجھ کو
میرے معبود! کوئی اور سزا دے مجھ کو

نہ سرِ کعبہ ٹھکانا، نہ سرِ بُت کدہ گھر
میرا چلنا بھی سفر، میرا نہ چلنا بھی سفر
میرے آغاز کا انجام بتا دے مجھ کو
میرے معبود! کوئی اور سزا دے مجھ کو

رہ گزر بھول گیا، رختِ سفر بھول گیا
اپنا گھر بھول گیا، غیر کا گھر بھول گیا
پھر مرا گھر نہ کہیں یاد دلا دے مجھ کو
میرے معبود! کوئی اور سزا دے مجھ کو

تاجرانِ وطن و قوم ہوں جب لوح و قلم
جنسِ بازار ہو جب مفلس و مزدور کا غم
نیتِ فن نہ ضمیرِ اُدَبا دے مجھ کو
میرے معبود! کوئی اور سزا دے مجھ کو

علم کے جہل سے کھنچ جاتی ہے سقراط کی کھال
لیکن اس حبس میں ہے سانس کا لینا بھی محال
سانس لینے کے لئے کچھ تو ہوا دے مجھ کو
میرے معبود! کوئی اور سزا دے مجھ کو

مسندِ جہل ہو جب نشۂ پندار میں چور
زنگیوں کو ہو جہاں اپنی صباحت کا غرور
مستیٔ ہوش، نہ حکمت کا نشہ دے مجھ کو
میرے معبود! کوئی اور سزا دے مجھ کو

میں ہوں اور صحبتِ ناجنس کی دہکی ہوئی آگ
جہل کہتا ہے ٹھہر! عقل کا اصرار کہ بھاگ
اس دوراہے پہ مری سمت بتا دے مجھ کو
میرے معبود! کوئی اور سزا دے مجھ کو

ناز کش حالی و اقبال کے جب ہوں مدفن
ہر گلو باز کی مسند ہو جہاں مسندِ فن
تو وہاں مسندِ فن پر نہ بٹھا دے مجھ کو
میرے معبود! کوئی اور سزا دے مجھ کو

ناقدِ اطلس و کمخواب ہوں جب بوریا باف
جہل کم ظرف ہو جب نقد و نظر کے صراف
کعبۂ ہوش، نہ احرام ذکا دے مجھ کو
میرے معبود! کوئی اور سزا دے مجھ کو

ہم اگر کہہ نہ سکیں ہر متنبی کو نبی
ہم کو تسلیم نہ ہو شب کی جو تیرہ نسبی
اس میں نقصان ترا کیا ہے بتا دے مجھ کو
میرے معبود! کوئی اور سزا دے مجھ کو

کتنے اندھوں میں کئے آئینے میں نے تقسیم
کتنے گونگوں کی فصاحت کو کیا ہے تسلیم
اب سکوت در و دیوار بنا دے مجھ کو
میرے معبود! کوئی اور سزا دے مجھ کو

آدمی چہرہ بہ چہرہ ہیں یہاں قابلِ غور
لوگ باطن میں ہیں کچھ اور بظاہر کچھ اور
اہرمن کوئی نہ جبریل نما دے مجھ کو
میرے معبود! کوئی اور سزا دے مجھ کو

یہ بغل گیر چٹانیں، یہ دعا گو اصنام
یہ ریا کوش ملاقات، یہ پُرکار سلام
یہی صہبا ہے تو پھر زہر پلا دے مجھ کو
میرے معبود! کوئی اور سزا دے مجھ کو

انقلابوں کے جہنم میں جھلس جاتے ہیں روپ
کیا ضروری ہے کہ ہو اتنی کڑی وقت کی دھوپ
تو کسی ابر کے سائے سے جلا دے مجھ کو
میرے معبود! کوئی اور سزا دے مجھ کو

گر شرافت ہے اسی ربطِ ریاکار کا نام
گر اسی زہر سے معمور ہے مے خانہ تمام
اس سے کچھ کم غمِ ربطِ شرفا دے مجھ کو
میرے معبود! کوئی اور سزا دے مجھ کو

ہم سرِ دشت جہاں ابر کے سائے میں چلے
کیا خبر کتنا اندھیرا تھا چراغوں کے تلے
یہ بھی نقصان سحر ہے تو بجھا دے مجھ کو
میرے معبود! کوئی اور سزا دے مجھ کو

محترم دیس میں اخلاص سے جب تھے اشراف
جب شرافت پہ نہ تھا دینِ سیاست کا غلاف
دیس ایسا نہ کوئی یاد دلا دے مجھ کو
میرے معبود! کوئی اور سزا دے مجھ کو

سِفلگی جن کو ہے شائستگیٔ نفس کا سوگ
مضحکہ ڈوبنے والوں کا اڑاتے ہیں وہ لوگ
ہم سفر اب نہ کوئی میرے خدا دے مجھ کو
میرے معبود! کوئی اور سزا دے مجھ کو

ختم ہوتا ہے کہاں عمرِ گریزاں کا سفر
ریت پر کون بناتا ہے کسی دشت میں گھر
پھر کسی تازہ خطر سے نہ ملا دے مجھ کو
میرے معبود! کوئی اور سزا دے مجھ کو

وقت کا سیلِ رواں بھی نہ مرے کام آیا
ساتھ میرے، مرا ساحل بھی تہِ دام آیا
تو کہیں پھر نہ کنارے سے لگا دے مجھ کو
میرے معبود! کوئی اور سزا دے مجھ کو

ہم جہاں لے کے حیاتِ گذراں ڈوب گئے
کیا خبر کتنے بھرے شہر وہاں ڈوب گئے
آئینہ پھر کوئی ساحل نہ دکھا دے مجھ کو
میرے معبود! کوئی اور سزا دے مجھ کو

وقت کی دھوپ میں انساں سہی خاک نشین
اس کڑی دھوپ میں انسان سے سایہ تو نہ چھین
تربتِ صبر، نہ تابوتِ رضا دے مجھ کو
میرے معبود! کوئی اور سزا دے مجھ کو

بحر و بر لے کے اُڑا، دشت و دمن لے کے اُڑا
میں قفس توڑ کے نکلا، میں چمن لے کے اُڑا
میری پرواز کی جرأت نہ ڈرا دے مجھ کو
میرے معبود! کوئی اور سزا دے مجھ کو

ہمدمِ چیں، نہ مجھے نوحہ گرِ شام بنا
تاجرِ کفر، نہ سوداگرِ اسلام بنا
تو نہ مجموعۂ اضداد بنا دے مجھ کو
میرے معبود! کوئی اور سزا دے مجھ کو

میری سنّت کے پیمبر، نہ ہلاکو نہ یزید
مجھ کو انسان سے اب بھی ہے شرافت کی امید
اتنی شدت سے نہ احساسِ اَنا دے مجھ کو
میرے معبود! کوئی اور سزا دے مجھ کو

زخم میں، ساز بھی ہیں ساز کا آہنگ بھی ہیں
آگ میں، پھول بھی ہیں تیشہ بھی ہیں سنگ بھی ہیں
میں حقیقت ہوں تو افسانہ بنا دے مجھ کو
میرے معبود! کوئی اور سزا دے مجھ کو

اک گلستاں ہی نہیں صرف مری حدِ نظر
اس قدر بھی مری پرواز کو محدود نہ کر
تو کہیں گل کدہ بردوش اڑا دے مجھ کو
میرے معبود! کوئی اور سزا دے مجھ کو

گردشِ وقت نے اس خاک میں بویا ہے مجھے
کہ جہاں میری بہاروں نے ڈبویا ہے مجھے
اب کسی اور ہی صحرا سے اُگا دے مجھ کو
میرے معبود! کوئی اور سزا دے مجھ کو

کیوں تصور میں بزرگی کی بلائیں فراموش ملیں
کیا ضروری ہے کہ مرہم سے بھرے زخم چھلیں
شامِ غربت میں نہ یادوں کا دیا دے مجھ کو
میرے معبود! کوئی اور سزا دے مجھ کو

ہیچ کر کتنے رفیقوں کی وفاؤں کا ضمیر
میں نے کس کرب سے توڑی تھی وفا کی زنجیر
تو یہ زنجیر کہیں پھر نہ پہنا دے مجھ کو
میرے معبود! کوئی اور سزا دے مجھ کو

اب مرے زخم کو مرہم کی ضرورت بھی نہیں
اس قدر تنگ مرا ظرفِ جراحت بھی نہیں
میرے غم میں نہ کوئی نوحہ سرا دے مجھ کو
میرے معبود! کوئی اور سزا دے مجھ کو

حُرمتِ مرگ گئی، زیست کا معمول گیا
اب تو اجداد کی قبروں کو بھی میں بھول گیا
اب مری سانس کی سولی پہ چڑھا دے مجھ کو
میرے معبود! کوئی اور سزا دے مجھ کو

کم ہے کیا حشر سے اس گوشۂ صحرا کا سکوت
جس میں ہر شخص لیے پھرتا ہے اپنا تابوت
زخمِ تسبیح، نہ ناسورِ دعا دے مجھ کو
میرے معبود! کوئی اور سزا دے مجھ کو

سینکڑوں میل کے بے خواب سفر سے پہلے
سو گئے ہم نہ کسی رات سحر سے پہلے
آنکھ لگ جائے تو پھر تو نہ جگا دے مجھ کو
میرے معبود! کوئی اور سزا دے مجھ کو

خوابِ اجداد سہی عظمتِ آدم کی سحر
بربریت کا اندھیرا مرا مقسوم نہ کر
دے مگر یہ نہ غمِ ارض و سما دے مجھ کو
میرے معبود! کوئی اور سزا دے مجھ کو

گرز میں بوس ہیں تہذیب و شرافت کے حصار
اتنی کچی ہے اگر آدمیت کی دیوار
تختِ دارا، نہ بساطِ فقرا دے مجھ کو
میرے معبود! کوئی اور سزا دے مجھ کو

یہ فلک بوس در و بام، یہ سنگین محل
ان کے شیشوں میں اگر خون ہے جمہور کا حل
محفلِ شاہ، نہ بزمِ وُزَرا دے مجھ کو
میرے معبود! کوئی اور سزا دے مجھ کو

ایک خرمن کا خدا، ایک پہ خوشہ بھی حرام
گر اسی پستی فطرت کا مساوات ہے نام
صبرِ نادار، نہ کبرِ اُمَرا دے مجھ کو
میرے معبود! کوئی اور سزا دے مجھ کو

میں کہ بیٹھا ہوں سرِ شاخ سمیٹے ہوئے پر
کیا خبر کتنی فضائیں ہیں مری گردِ سفر
آسماں سے نہ سرِ خاک گرا دے مجھ کو
میرے معبود! کوئی اور سزا دے مجھ کو

جو اٹھا بھی نہ سکے آدمیت کی دیوار
جو گرا بھی نہ سکے نسل و تعصب کا حصار
ایسا ماحول نہ اے میرے خدا دے مجھ کو
میرے معبود! کوئی اور سزا دے مجھ کو

جس کی دیوار پہ آدم کے لہو کا ہو غلاف
جس کی تقدیر ہو چنگیز و ہلاکو کا طواف
ایسا کعبہ نہ مرے رب سے ملنے دے مجھ کو
میرے معبود! کوئی اور سزا دے مجھ کو

کربِ آدم مرا دیں، آدمیت میرا یقیں
ہو چمن میرا چمن، ساری زمیں میری زمیں
کربِ پرواز، نہ اندوہ خلا دے مجھ کو
میرے معبود! کوئی اور سزا دے مجھ کو

میں ہوں اِس دہر کے ماتھے پہ وہ سورج کی لکیر
جس کو آزادئ آدم نے کیا ہے تحریر
میں اگر حرفِ غلط ہوں تو مٹا دے مجھ کو
میرے معبود! کوئی اور سزا دے مجھ کو

رات سورج کی جبیں چوم رہی ہے کب سے
گرد سورج کے زمیں گھوم رہی ہے کب سے
اک تصور تو اُجالے کا نیا دے مجھ کو
میرے معبود! کوئی اور سزا دے مجھ کو

میں کہ ہوں دیدہ ورِ گردشِ افلاک و زمیں
میں فقط اپنے ہی ماحول کا انسان نہیں
اتنا کم ظرف و سُبک سَر نہ بنا دے مجھ کو
میرے معبود! کوئی اور سزا دے مجھ کو

اب بھی میں نشۂ تخلیق و تفکر میں ہوں چور
آج بھی مجھ کو مری دیدہ وری کا ہے غرور
اب مری ذات سے بیگانہ بنا دے مجھ کو
میرے معبود! کوئی اور سزا دے مجھ کو

میرا سورج، میرے ماتھے کی شکن ہے کہ نہیں
سوچتا ہوں مرا قاتل مرا فن ہے کہ نہیں
جاگنے کی بھی کوئی صبح سُلا دے مجھ کو
میرے معبود! کوئی اور سزا دے مجھ کو

میری نظروں میں نہ تھی آدمیت کی تقسیم
میں سمجھتا تھا کہ انسان ہے اس سے بھی عظیم
اِس سے آگے نہ غمِ فکرِ رسا دے مجھ کو
میرے معبود! کوئی اور سزا دے مجھ کو

غزل

منیر نیازی

بے چین بہت پھرنا، گھبرائے ہوئے رہنا
اک آگ سی جذبوں کی دہکائے ہوئے رہنا
چھلکائے ہوئے پھرنا خوشبو لب لعلیں کی
اک باغ سا ساتھ اپنے مہکائے ہوئے رہنا
اس حسن کا شیوہ ہے جب عشق نظر آئے
پردے میں چلے جانا، شرمائے ہوئے رہنا
اک شام سی کر رکھنا کاجل کے کرشمے سے
اک چاند سا آنکھوں میں چمکائے ہوئے رہنا
عادت ہی بنا لی ہے تم نے تو منیر اپنی
جس شہر میں بھی رہنا اکتائے ہوئے رہنا

غزل

احمد مشتاق

عجب نہیں کبھی نغمہ بنے فغاں میری
مری بہار میں شامل ہے اب خزاں میری

میں اپنے آپ کو اوروں میں رکھ کے دیکھتا ہوں
کہیں فریب نہ ہوں دردمندیاں میری

میں اپنی قوتِ اظہار کی تلاش میں ہوں
وہ شوق ہے کہ سنبھلتی نہیں زباں میری

یہی سبب ہے کہ احوالِ دل نہیں کہتا
کہوں تو اور اُلجھتی ہیں گتھیاں میری

میں اپنے عجز پہ نادم نہیں ہوں ہم سخنو
ہزار شکر طبیعت نہیں رواں میری

میرے اور تمہارے بیچ

میرے اور تمہارے بیچ
اس نیلی چادر کے سوا کچھ بھی تو نہیں
پھر یہ اکیلا گہرا میرے دل پر کیسے اتر رہا ہے
یہ گہرا سناٹا کیا ہے
یہ لمحہ کیوں سمٹ رہا ہے!

جو کچھ میرے دل میں ہے وہ رسموں کے رشتے سے ماورا ہے
رسموں کا یہ رشتہ دیواروں سے ہم کو جھانک رہا ہے
گہرا سانس نہیں لے سکتی
میں بے چین ہوئی جاتی ہوں

فہمیدہ ریاض

ٹھنڈی کالی رات کی تنہائی

اس کی آغوش میں کتنی گرمی ہے
میں کس طرح اس کی آغوش کو چھوڑ دوں
اس کے ہونٹوں کی مانوس خوشبو مجھے کر چکی ہے اسیر
اس کو معلوم کیا
میرے کمرے کے باہر بہت زور سے
میری کھڑکی پہ سر کو پٹکتی ہوئی
چل رہی ہے جو سرما کی تیکھی ہوا
گھر کے اُمڈی چلی آرہی ہے جو پچھم سے کالی گھٹا
گھور اندھیرے کے سینے میں گونجی ہے جو
بوندیوں کی صدا
ان سے بچپن کا میرا بڑا ساتھ تھا

باکرہ

فہمیدہ ریاض

آسماں، تپتے ہوئے لوہے کی مانند سفید
ریگ سوکھی ہوئی پیاسے کی زباں کی مانند
پیاس حلقوم میں ہے، جسم میں ہے، جان میں ہے

سر بزانو ہوں جھلستے ہوئے ریگستاں میں
تیری سرکار میں لے آئی ہوں یہ وحشِ ذبیح!
مجھ پہ لازم تھی جو قربانی، وہ میں نے کر دی

اُس کی اُبلی ہوئی آنکھوں میں ابھی تک ہے چمک
اور سیہ بال ہیں بھیگے ہوئے خوں سے اب تک
تیرا فرمان یہ تھا اس پہ کوئی داغ نہ ہو

سو یہ بے عیب اچھوتا بھی تھا ان دیکھا بھی
بے کراں ریگ میں سب گرم لہو جذب ہوا
دیکھ چادر پہ مری ثبت ہے اس کا دھبا
اے خداوندِ کبیر
اے جبّار!
متکبر و جلیل!
ہاں ترے نام پڑھے اور کیا ذبح اسے
اب کوئی پارۂ ابر آئے، کہیں سایہ ہو
اے خداوندِ عظیم
بادِ تسکیں! کہ نفس آگ بنا جاتا ہے!
قطرۂ آب! کہ جاں لب پہ چلی آئی ہے

زبانوں کا بوسہ

زبانوں کے رس میں یہ کیسی مہک ہے!
یہ بوسہ کہ جس سے محبت کی صہبا کی اُڑتی ہے خوشبو
یہ بدمست خوشبو جو گہرا، غنودہ نشہ لا رہی ہے
یہ کیسا نشہ ہے!
مرے ذہن کے ریزے ریزے میں ایک آنکھ سی کھل گئی ہے
تم اپنی زبان میرے منہ میں رکھے جیسے پاتال سے میری جاں کھینچتے ہو
یہ بھیگا ہوا گرم و تاریک بوسہ
اماوس کی کالی برستی ہوئی رات جیسے اُمڈتی چلی آ رہی ہے
کہیں کوئی ساعت ازل سے رمیدہ
مری روح کے دشت میں اُڑ رہی تھی
وہ ساعت قریب تر چلی آ رہی ہے
مجھے ایسا لگتا ہے
تاریکیوں کے
لرزتے ہوئے پُل کو
میں پار کرتی چلی جا رہی ہوں
یہ پُل ختم ہونے کو ہے
اور اب
اس کے آگے
کہیں روشنی ہے

فہمیدہ ریاض

ابد

یہ کیسی لذت ہے جسم شل ہو رہا ہے
یہ کیا مزا ہے کہ جس سے ہے عضو عضو بوجھل
یہ کیف کیا ہے کہ سانس رُک رُک کے آ رہا ہے
یہ میری آنکھوں میں کیسے شہوت بھرے اندھیرے اُتر رہے ہیں
لہو کے گنبد میں کوئی در ہے کہ وا ہوا ہے
یہ چھوٹتی نبض، رُکتی دھڑکن، یہ ہچکیاں سی
گلاب و کافور کی لپٹ تیز ہو گئی ہے
یہ آبنوسی بدن یہ بازو کشادہ سینہ
مرے لہو میں سمٹتا سیال ایک نکتے پہ آ گیا ہے
مری نسیں آنے والے لمحے کے دھیان سے کھنچ کے رہ گئی ہیں
بس اب تو سرکا دو رُخ پہ چادر
دیئے بجھا دو

فہمیدہ ریاض

سہج چلی پروائی

سرسوں کے پھولوں سے، گیہوں کی بالی سے سجایا
دھرتی ایک کنواری تم نے دلہن اسے بنایا
رس برساتے بادل گزرے، سہج چلی پروائی
تم کو چھاتی سے لپٹاتے دھرتی کب شرمائی
ہاتھ تمہارے چھوئیں تو اس کے انگ کو روپ سہائے
ان ہاتھوں سے کیا گھبرانا، تمہیں یہ ہاتھ پرائے
وہ دھرتی جو سدا تمہاری سیوا کرتی ہے
سر پر ہاتھ دھرو گے تم، بیٹھی ہے آس لگائے
دن ڈوبا ہل پاس کھڑا ہے، دیکھو یہ انیائے
اس کی کوکھ میں بیج تمہارا، دوجا پھل کیوں پائے
یہی ہے ماتا، یہی ہے پتنی، یہی تمہاری بیٹی
پاس وڈیروں کے مت چھوڑو، بڑی اداس رہے گی

شہر والو سنو

فہمیدہ ریاض

اس بریدہ زباں شہر میں قصہ گو خوش بیاں آئے ہیں
شہر والو سنو اس سرائے میں ہم قصہ خواں آئے ہیں

شہرِ معصوم کے ساکنو! کچھ فسانے ہمارے سنو
دور دیسوں میں ہوتا ہے کیا ماجرے آج سارے سنو
وہ سیاہ چشم پستہ دہن سیم تن نازنیں عورتیں
وہ کشیدہ بدن، سبز خط، خوش قطع ماہرو نوجواں
اور وہ جادوگری ان کی تقدیر کی
وہ طلسمات، سرکار کی نوکری
ایک انوکھا محل۔
جس سے گزرا تو ہر شاہزادے کا سر خوک کا بن گیا
درس گاہوں میں وہ جوق در جوق جاتے ہوئے نوجواں
وہ تبسم فشاں ان کی پیشانیاں ہائے کھوئیں کہاں
آن کی آن میں پیر اتنے ہوئے
ضعف سے ان کی مژگاں تلک جھڑ گئیں
جسم کیا روح پر جھریاں پڑ گئیں

اور وہ شہزادیاں
کچی عمروں میں جو سیر کرنے گئیں
باغ کا وہ سماں
عشق کے پھول کھلتے ہوئے دور تک ریشمی گھاس میں

وہ فسوں ساز خوشبو بھٹکتی ہوئی ان کے انفاس میں
افسروں اور شاہوں کی آغوش میں
ان کے نچلے بدن کیسے بتھرا گئے

وہ عجب مملکت
جانور جس پہ مدت سے تھے حکمراں
گو رعایا کو اس کا پتہ تک نہ تھا
اور تھا بھی تو بے بس تھے لاچار تھے
ان میں جو اہلِ دانش تھے مدت ہوئی مر چکے تھے
جو زندہ تھے بیمار تھے
کچھ عجب اہلِ فن بھی تو تھے اس جگہ
سامری سحر سے روگ میں مبتلا
طلعتِ شاہ تھی ان کی واحد دوا
بیش تر قابِ سلطان کے خوشہ چیں
گیت لکھتے رہے گیت گاتے رہے
عہدِ زریں کے ڈنکے بجاتے رہے

کن وزیروں سے ان کی رقابت رہی
اور کام آئی کس کس کے جادوگری
شام کا جب کھٹولا اڑا تو پھر کیا ہوئی وہ پری؟
جمع کرتے تھے ہم ایک رنگیں فسانہ عجب داستاں
آستینوں میں دفتر نہاں لائے ہیں
شہر والو سنو

وہ اک زنِ ناپاک ہے

منیر نیازی

وہ اک زنِ ناپاک ہے
بہتے لہو کی قید میں!
گردش میں ماہ و سال کی
دہکی ہوس کی آگ میں
اپنی طلب کی چاہ میں
زائیدۂ ابلیس تھی
چل دی اسی کی راہ میں
اس منزلِ موہوم کو
جس کا نشاں پیدا نہیں
سنگم وہ نور و نار کا
جس کا پتہ ملتا نہیں

اُبلے لہو کے جوش سے
پستان اس کے پھٹ چکے
ہر نوکِ خارِ راہ سے
بندِ لحم سب کٹ چکے
اس کے بدن کی شرم پر
تقدیس کا سایہ نہیں
لیکن خدائے بحر و بر
ایسا کبھی دیکھا کہیں

فرمان تیرے سب روا
ہاں اس زنِ ناپاک کے
لب پر نہیں کوئی دعا!
سر میں کوئی سجدہ نہیں

قراردادِ وفا

شبنم رومانی —

یہ وہی بہشت گلاب ہے
یہ وہی کنجِ وادیٔ خواب ہے

کل اسی بہشتِ گلاب میں
اسی کنجِ وادیٔ خواب میں
مرے دل کا درد غزل ہوا
مرے حرف حرف میں دل ہوا
مرا مسئلہ، ترا مسئلہ، مری آرزو، تری آرزو
وہ نظر نظر کے محاورے، وہ نئی زبان میں گفتگو

اسی نو بہشت گلاب میں
مری روح سے تری روح تک
وہ وفا کی اک نئی رہ گذر
وہ یقیں کا یک نیا سفر

اسی کنج وادیٔ گلاب میں
انھیں سرخ پھولوں کے درمیاں
اسی فرشِ سبزہ پہ بیٹھ کر

انھیں آنسوؤں کے نجوم میں
انھیں طایروں کے ہجوم میں
سرِ شام عہدِ وفا ہوا
ترا حسن اور سوا ہوا
مجھے کیا خبر تھی کہ خواب سے مرا کوئی رشتہ جاں نہیں
مجھے کیا خبر تھی کہ گلاب سے مرے دل کا رنگ عیاں نہیں
مری ہر بلا، ترے سر گئی
تری زلفِ ناز بکھر گئی
ترا ہاتھ ہاتھ سے چھٹ گیا
میں بڑے خلوص سے لٹ گیا

مرے دل سے محو ہوئی نہیں وہ عظیم یادِ وفا ابھی
مرا خواب، میرا گلاب ہے، وہ قراردادِ وفا ابھی

یہی خواب پھر سے سجاؤں گا
تری نرم پلکوں کی چھاؤں میں
یہ گلاب لے کے میں جاؤں گا
ترے شہر میں، ترے گاؤں میں

غزل

شبنم رومانی

لمحوں کا پتھراؤ ہے مجھ پر، صدیوں کی یلغار
میں گھر جلتا چھوڑ آیا ہوں، دریا کے اُس پار

کس کی روح تعاقب میں ہے، سائے کے مانند؟
آتی ہے نزدیک سے اکثر خوشبو کی جھنکار

تیرے سامنے بیٹھا ہوں، آنکھوں میں اشک لیے
میرے تیرے بیچ ہو جیسے شیشے کی دیوار

میرے باہر اُتنی ہی مربوط ہے بے ربطی
میرے اندر کی دنیا ہے جتنی پُراسرار

مشفق خواجہ

غزل

اے مشفقِ من اس حال میں تم کس طرح بسر فرماؤ گے
انجان بنے چُپ بیٹھو گے اور جان کے دھوکے کھاؤ گے

کیا دیکھتے ہو دیواروں کو، تم اپنے گھر کے اندھیرے میں
یہ شمع کی صورت جلنا کیا، آئے گی ہوا، بجھ جاؤ گے

جن جھوٹے سچے خوابوں کی تعبیر غمِ تنہائی ہے
ان جھوٹے سچے خوابوں سے تم کب تک دل بہلاؤ گے

ان دیدہ و دل کی راہوں پر تم کس کی تلاش میں پھرتے ہو
جو کھونا تھا سو کھو بیٹھے، کیا ڈھونڈو گے کیا پاؤ گے

چھوڑو بھی پرانی باتوں کو جو دل پر بیتی بیت گئی
افسردہ دلی سے تم کب تک ہر محفل کو گرماؤ گے

تم خلوتِ غم سے نکلو تو اس شہر میں ایسے لوگ بھی ہیں
اک بار جو اُن کو دیکھو گے تو دیکھتے ہی رہ جاؤ گے

کچھ گردِ سفر کے رشتے سے کچھ نقشِ قدم کے ناتے سے
جس راہ سے گزرو گے یارو ہم کو بھی وہیں تم پاؤ گے

ممکن ہی نہیں ہے لفظوں میں اس حسن کی ہو تفسیر کوئی
جب آنکھ کھلے خاموش رہو، کیا سمجھو گے، سمجھاؤ گے

جو پہلے تھے ہم آج بھی ہیں، پہچان ہماری آساں ہے
تم روپ بدل کر لاکھ پھرو، پر کس کس کو جھٹلاؤ گے

غزل

اطہر نفیس

دھوپ سر پر ہے تو پھر بے سائباں زندہ رہو
اے مرے اطہر نفیس اے جانِ جاں زندہ رہو

وسعتِ صحرا کو دیکھا، ہو سکے تو آج سے
آپ اپنی وسعتوں کے درمیاں زندہ رہو

کشتِ دل کی آبیاری اس قدر آساں نہیں
ہو سکے تو صورتِ موجِ رواں زندہ رہو

برف جیسی ساعتیں جذبات کے اطراف کیوں
زندگی کے نام پر شعلہ بجاں زندہ رہو

آج کا ہر نقش، کل کی دھوپ میں گھل جائے گا
دیر تک رہتا نہیں کوئی سماں زندہ رہو

خواب کا منظر سہی، آنکھوں میں اک منظر تو ہے
چند لمحے اس دھنک کے درمیاں زندہ رہو

ہم تو وہ ہیں جن کے ہاتھوں میں کوئی تیشہ نہیں
کاٹنا پھر بھی ہے، یہ کوہِ گراں زندہ رہو

ویت نام اتحاد کے بعد

محمد رئیس

جلے ہوئے جنگلوں میں دھیرے سے سرگوشیاں کرتی
سبز کونپلیں سر نکالتی ہیں
بھٹکتی ہوئی، بے خیال آنکھوں کے، گول چہروں کے زرد بچے
جو شاہ راہوں پہ بھاگتے، بھوک سے بلکتے
نڈھال، حیرت زدہ، ہراساں کہ جاں بچانے کدھر کو جائیں
نہ جانتے تھے
ٹھہر گئے ہیں
جہاں کے ساحل پہ جنگ جو جہازوں نے پانیوں کو گدلا دیا تھا
اب وہاں پہ
سنہری صبحوں کے سبز پانی میں سرمئی مچھلیاں تازہ دم
مچھیروں کے گیت سننے کو صندلی کشتیوں کے نزدیک
بے قراری میں گھومتی ہیں
جہاں کے کھیتوں پہ، مدرسوں پہ
سمندر پار، اجنبی زمینوں کے آہنی طائروں نے یلغار کی
تھی ـــــ آتش فشانیاں کی تھیں

زمیں کے سینے پہ گھاؤ گہرے تھے آسماں کے!
مگر کسانوں نے، عزم و ہمت کے پیکروں نے
مغلوں نے ـــــ نگاہ و دل کے محافظوں نے!
نئے افق کے مسافروں نے!
گرجتے بادل، چمکتی بجلی، لپکتے شعلوں کو، دلدلی زمینوں کو
موسلا دھار بارشوں کو شکست دی ہے،
زمیں کے اس زخم زخم سینے سے آج پودے نئے اُگے ہیں
جنوب مشرق کے رہنے والو
تمہاری جانباز محنتوں کو، مشقتوں کو
سلام میری محبتوں کا، روایتوں کا

اشعار

پروین شاکر

بادل کو کیا خبر ہے کہ بارش کی چاہ میں
کیسے بلند و بالا شجر خاک ہو گئے
جگنو کو دن کے وقت پکڑنے کی ضد کریں
بچے ہمارے دور کے چالاک ہو گئے
ساحل پہ جتنے آب گزیدہ تھے سب کے سب
دریا کا رخ بدلتے ہی تیراک ہو گئے
جب بھی غریب شہر سے کچھ گفتگو ہوئی
لہجے ہوائے شام کے نم ناک ہو گئے

ریت ابھی پچھلے مکانوں کی نہ واپس آئی تھی
ساحلوں پر پھر گھروندا کر گیا تعمیر کون
سارے رشتے ہجرتوں میں ساتھ دیتے ہیں تو پھر
شہر سے جاتے ہوئے ہوتا ہے دامن گیر کون
دشمنوں کے ساتھ میرے دوست بھی آزاد ہیں
دیکھنا ہے پھینکتا ہے مجھ پہ پہلا تیر کون

محمد حسن

اردو ناول : پاکستان میں

ناول کو صنعتی دور کا رزمیہ کہا گیا ہے کہ قدروں کی جس شکست و ریخت آویزش اور آمیزش پر ناول کی بنیاد قایم ہے وہ صنعتی دور ہی میں بنتی ہے۔ ناول کے لئے تہذیبی استقامت کسی قدر لازمی ہے جب مشین ابھرتی ہے اور شہروں کی مصروف سماج بنانے کے لئے قصبوں اور قدیم بستیوں کی وفاداریوں کو توڑتی اور اجتماعی دیومالاؤں اور سماجی طور پر قبول کئے ہوئے قصوں کو کھلتی نئے فرد کی تشکیل کرتی ہے تو اس توڑ پھوڑ میں وہ پیکر بھی ابھرتا ہے جو نئی بنیادوں پر قایم کئے ہوئے کسی قدر یک رنگ اور ہم آہنگ سماج کی شکل لے لیتا ہے۔ پاکستان ہو یا ہندوستان دونوں ملکوں میں اس قسم کا صنعتی سماج ابھی پوری طرح ابھرا نہیں ہے بلکہ وہاں کے معاشرے نے ہنوز اپنا رشتہ سامنتی نظام سے بھی پوری طرح توڑا نہیں ہے۔ صنعتی اعتبار سے پاکستان ابھی ہندوستان سے بھی پیچھے ہی ہے اس لئے پاکستان میں اردو ناول کا فروغ نہ پانا کوئی حیرتناک بات نہیں۔

پھر پاکستان میں جو اردو ناول لکھے گئے ان میں پاکستان بہت کم نظر آتا ہے یعنی ان ناولوں کی عقبی زمین پاکستان میں شامل علاقوں کی اپنی تہذیب کی نہیں ہے۔ اگر کوئی ان ناولوں کی مدد سے پاکستان کی تہذیبی صورت حال کو سمجھنا چاہے تو اسے زیادہ کامیابی حاصل نہ ہوگی۔ ان ناولوں میں سندھ ہے نہ بلوچستان، پنجاب تھوڑا بہت ہے مگر بہت بھرپور انداز میں موجود نہیں ہے۔ اور اس تہذیب کا تو بہت ہی ہلکا عکس ہے جو ان تمام تہذیبوں سے مل کر بنی ہو اور سب کو ایک رنگ میں ڈھال کر پاکستانی تہذیب ادیا جاسکے۔

پاکستان کے اردو ناولوں میں سب سے پہلے وہ معروف ناول ہیں جو یا تو تقسیم ہند کے موضوع پر لکھے گئے یا پھر ہندو پاک کی زندگی کی عکاسی کرتے ہیں ان میں سب سے پہلا نام

عبداللہ حسین کے ناول "اداس نسلیں" کا ہے جس کا کینوس بڑا وسیع ہے اور پاکستان بننے تک پھیلا ہوا ہے۔ یقیناً یہ اس دور کا اہم ترین اردو ناول ہے۔ لیکن زمان و مکان کے اعتبار سے اسے پاکستان کے اردو ناولوں میں شمار کرنا زیادہ مناسب نہیں۔ دوسرا نام قرۃ العین حیدر کے ناول "آگ کا دریا" کا ہے۔ یہ بھی اردو کے اہم ناول میں ہے مگر پاکستان کے قیام کے فوراً بعد کے واقعات پر ختم ہوتا ہے اور.... تقسیم ہند اور متعلقہ مسایل سے آگے نہیں بڑھتا یہی حال تیسرے اہم ناول خدیجہ مستور کے "آنگن" کا بھی ہے۔ پاکستان یہاں بھی کہیں نہیں ہے۔ ان سبھی ناولوں میں وہ سوال البتہ بکھرے ہوئے ہیں جنھیں تقسیم ہند حل نہیں کر سکی ہے۔ اسی ضمن میں انتظار حسین کے ناول "چاند گہن" کا ذکر بھی مناسب ہوگا۔

ان سبھی ناولوں کا مطالعہ تین جہات سے ہو سکتا ہے۔ ایک سیاسی دوسری تہذیبی اور تیسری فلسفیانہ۔ سیاسی سطح پر ان میں سے کوئی ناول بھی تقسیم کا کوئی جواز پیش نہیں کرتا۔ تقسیم ہند ایک اچانک حادثے کے طور پر ظہور میں آتی ہے اور اس کے اسباب و محرکات کی کڑیاں ہماری سماجی اور سیاسی زندگی میں پھیلی نظر نہیں آتیں۔ تہذیبی سطح پر ان سبھی ناولوں میں رومانیت اور ناسٹلجیا کی گہری تہیں چڑھی ہوئی ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے تقسیم سے قبل دنیا میں سب خیریت تھی اور جاگیردارانہ نظام خیر و برکت کا ایک کبھی نہ ختم ہونے والا ذخیرہ تھا۔ قرۃ العین حیدر کو فرقہ وارانہ اتحاد کی مثالی صورت حال بھی اسی دور میں نظر آتی ہے۔ تہذیبی اور معاشرتی سطح پر مشترکہ ہند و مسلم تہذیب یا قدیم ہندوستانی مسلمانوں کی تہذیب سے لگاؤ بہت نمایاں ہے۔ یہی نہیں عہد وسطیٰ کی فضا سے والہانہ دل بستگی بھی ان سبھی ناولوں میں موجود ہے "اداس نسلیں" البتہ اس کمزوری سے محفوظ ہے۔

فلسفیانہ سطح پر یہ فرد اور وقت کے درمیان مفاہمت تلاش کرنے کے موضوع پر بہت زور دیتے ہیں اور وہ سوال جسے فرد اب تک اپنی ذات کے سیاق و سباق میں حل کرنے کے بجائے وسیع تر اجتماعی پس منظر میں حل کرنا چاہتا تھا۔ باطنی سطح پر حل کیا جانے لگا۔ سوال یہ تھا کہ فرد کے لئے مسرت اتنی دور کیوں ہو گئی تھی اور کیا اس کے لئے مسرت کے حصول کی ساری کشمکش، ساری دوڑ دھوپ محض وقت کے ایک بے رحم چکر کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ کیا ہر زمانے اور ہر سماج میں اس کا مقدر محض شہادت ہے اور وہ وقت کو اپنے سانچے میں ڈھالنے کے بجائے محض وقت کے ہاتھ کا ایک بے جان کھلونا ہے۔

فرد اور سماجی مطابقت کے اس موضوع کو لے کر شوکت صدیقی کا ناول "خدا کی بستی" لکھا گیا اور یہ شاید اس اعتبار سے منفرد ناول تھا کہ پہلی بار پاکستانی سماج کی ناہمواریوں کی بھرپور تصویر کشی کی گئی اس سماج میں مطابقت اور ہم آہنگی تلاش کرنے والا وہی دربدر بھٹکنے والا مہاجر تھا جو مملکت خداداد میں اپنی شناخت کے لئے سرگرداں تھا۔ "خدا کی بستی" پاکستان کے معاشرے کی عکاسی بھی ہے اور اس کا نیا امکان بھی۔ عکاسی ان معنوں میں کہ جس سماجی ناہمواری، کرپشن اور نودولتیے پن پر "خدا کی بستی" میں چوٹ کی گئی ہے وہ پاکستان کے اکثر ناولوں کا بعد میں موضوع بنے بلکہ اگر ایک جملے میں پاکستان کے اردو ناول نگار کا سماج کے خلاف شکایت نامہ مرتب کرنا ہو تو یہی ہوگا کہ اس سماج میں بے ایمانی اور کرپشن پھولتا پھلتا ہے اور نودولتیوں نے دنیا مول لے رکھی ہے۔ نیا امکان اس اعتبار سے کہ "خدا کی بستی" میں دبے کچلے طبقے محض ٹوٹتے بکھرتے ہی نہیں بلکہ سماج کی کمزوریوں کو بے نقاب بھی کرتے ہیں اور اس کی تعمیر نو کی طرف اشارہ بھی کرتے ہیں یعنی جن طبقوں کو معاشرے کا کوڑا کرکٹ قرار دیا جاتا رہا ہے وہی دراصل اس کے معمار اور وہی اس کے امید ہیں۔

فضلی کے "خونِ جگر ہونے تک"، ممتاز مفتی کے "علی پور کا ایلی"، عزیز احمد کے تاریخی ناول "زریں تاج" اور احسن فاروقی کے "سنگم"، جمیلہ ہاشمی کے "تلاش بہاراں" "چہرہ بہ چہرہ روبرو" اور فصیح احمد کے "آبلہ پا" کے تذکرے سے پاکستان کے اردو ناول کا جائزہ کسی قدر نمایندہ ہو سکتا ہے احسن فاروقی کا ناول "سنگم" گویا قرۃ العین حیدر کے "آگ کے دریا" میں پیش کردہ تاریخی تسلسل کے جواب میں مذہب کی بنیاد پر تہذیبی تسلسل کا تصور پیش کرتا ہے مگر فنی اعتبار سے کامیاب نہیں۔ فضلی کا ناول موثر اور فنی اعتبار سے کامیاب ہے اور پاکستان کے ایک علاقے کے واقعات اور تہذیبی شناخت کو اپنے ڈھنگ سے پیش کرتا ہے۔

ممتاز مفتی کا ناول اس اعتبار سے انوکھا ہے کہ اس میں نفسیات اور اس کی سماجی عقبی زمین کے امتزاج سے ناول کا تانا بانا تیار کیا گیا ہے۔ "شیکھر ایک جیونی" میں جس طرح اگیے نے ایک فرد کے باطن کو سمجھنے کی کوشش کی ہے اور اس کوشش میں دروں بینی کے سہارے خارج کے مختلف مظاہر تک پہنچتے ہیں اسی طرح ممتاز مفتی نے ایک نئی جہت سے انسانی نفسیات کو پہچاننا چاہا ہے۔ عزیز احمد کے تاریخی ناول یقیناً نہایت کامیاب ہیں۔ عزیز احمد کا تخیل ایسا شاداب ہے کہ

کہ دورِ قدیم کو تمام تر جزئیات کے ساتھ آنکھوں کے سامنے لا کھڑا کرتا ہے اور تاریخ قاری کے تجربے کا حصہ بن جاتی ہے لیکن اس کامرانی کے باوجود یہ ناول اردو میں تاریخی ناول کی روایت کا عظیم الشان حصہ تو ہیں لیکن پاکستانی زندگی کی عصری دستاویز نہیں ہیں۔

جمیلہ ہاشمی کا ناول "تلاشِ بہاراں" اس اعتبار سے کامیاب ہے کہ علاقائی تہذیب سے وابستگی اور پاکستان میں اُبھرنے والی نئی تہذیبی حقیقتوں کی عکاسی ہوتی ہے۔ جمیلہ ہاشمی کا نیا ناول "چہرہ رو برو" ان کے پہلے ناول سے کہیں آگے ہے۔ یہ تاریخی ناول بابی 'پیغمبرہ' قـرۃ العین کی سوانح سے متعلق ہے لیکن اس تاریخی شخصیت کو مصنف نے عصری معنویت بخشنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ قرۃ العین کی جنگ صرف عورتوں کے انسانی حقوق کی بازیافت کی جنگ نہیں ہے بلکہ انسانی وجود کی تکمیل اور خود شناسی کی جنگ ہے۔ جمیلہ ہاشمی ایک طرف تو علاقائی تہذیبوں سے اپنا ذہنی اور جذباتی رشتہ استوار کرنے کی کوشش میں نظر آتی ہیں تو دوسری طرف مغربی اور وسطی ایشیا کے مسلم ممالک سے مطابقت اور ہم آہنگی پیدا کرنے کی بھی سعی کر رہی ہیں جو شاید پاکستان کے ادب کی باطنی آویزش اور کشمکش کو ظاہر کرتا ہے۔

رضیہ فصیح احمد کا ناول "آبلہ پا" دراصل ٹیگور کے ناول "گورا" سے متاثر ہے اور اس ناول میں بھی انسان کے آزادانہ وجود اور علاقہ، نسل اور قوم کے خانوں سے اس کے ٹکرانے کا قصہ ہے۔ ہیرو ایک پیارے بچے کو صرف اس لئے مدتوں لادے لادے پھرتا ہے کہ وہ اسے اپنا بچہ سمجھتا تھا اور جس لمحے اسے یہ علم ہوتا ہے کہ وہ اس کا اپنا..... نہیں ہے وہ اسے گلا گھونٹ کر مار ڈالتا ہے۔ انسان شاید آج بھی اپنی مسرت کو علاقہ، نسل، مذہب اور قوم کی فرضی قربان گاہوں پر اسی طرح گلا گھونٹ کر بھینٹ چڑھا رہا ہے۔

ادھر ایک مدت سے پاکستان کسی قابل قدر اردو ناول سے محروم ہے یا کم سے کم ایسا کوئی ناول سامنے نہیں آیا جس کی گونج ہندوستان کے ادبی حلقوں میں سنائی دے۔ گو اس ملک میں عصـری حقیقتوں کی آویزش کی دھوپ چھاؤں اپنے داستان گو کی شدت سے منتظر معلوم ہوتی ہے۔

محمد حسن

پاکستان میں طنز و مزاح

پاکستان میں طنز و مزاح کے سبک، شایستہ اور شگفتہ اسلوب کا ارتقا معجزے سے کم نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ متناسب اور خوش آہنگ سماج کو شایستگی حس مزاح کا تحفہ دیتی ہے بظاہر تو پاکستانی سماج ایسا متناسب اور خوش آہنگ نظر نہیں آتا کہ اسے شفیق الرحمٰن، ابن انشا، مشتاق یوسفی، محمد ابراہیم جلیس، مجید لاہوری، اور سید محمد جعفری جیسے صاحب طرز مزاح نگار نصیب ہوں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ دستور زبان بندی جب کھل کر بات نہیں کرنے دیتا تو طنز و مزاح کے پھول کھلنے لگتے ہیں۔

وجہ کچھ بھی ہو حقیقت یہ ہے کہ نثری اسلوب کی جو رعنائی اور صلابت پاکستان میں طنز و مزاح کو میسر آئی اس کی نظیر سے کچھ کم اردو ادب کی تاریخ خالی ہے۔ یہ مانا کہ پاکستان بننے سے پہلے بھی یہ سرزمین امتیاز علی تاج، سندباد جہازی، عبدالمجید سالک اور پطرس بخاری کو جنم دے چکی تھی مگر طنز و مزاح کا جو نیا عہد جدید سے ہم آہنگ لہجہ شفیق الرحمٰن کے نام سے منسوب ہوا وہ اس روایت سے بالکل مختلف تھا اس میں نئی زندگی کا پورا ماڈرن لہجہ موجود تھا اور مزاح میں تاریخ سے لے کر فکر و فن کی گہرائیوں تک جن رموز و اسرار سے کام لیا گیا تھا انھوں نے مزاح کو تہہ داری اور توانائی بخشی تھی جس کی اعلیٰ ترین مثال "تزک نادری" ہے۔

مشتاق احمد یوسفی نے اس کوچے میں بقول جوش ملیح آبادی "خورشید پہ بڑھ کے ہاتھ ڈالا"۔ یہاں معاملہ زندگی میں اس طرح پیر جانے کا تھا کہ کوئی کوچہ اجنبی اور کوئی راہ ناشناسا نہ رہے اور پھر اس 'رہ وادی خیال' کو احساس کی پوری تابناکی اور ادراک کی پوری باخبری کے ساتھ اس طرح طے کیا جائے کہ زندگی خود ایک اسلوب معلوم ہونے لگے۔ بے شک یوسفی نے پطرس اور رشید احمد صدیقی سے بہت کچھ سیکھا ہے وہ کتنا ہی انکار کیوں نہ کریں مرزا کا کردار اور مترادفات کی صوتی جھنکار ان دونوں قدآوروں کے اثراندازی کا ثبوت فراہم کرنے کو کافی ہے لیکن ان کے

باوجود مشتاق یوسفی کے مضامین میں ان کا اپنا اتنا کچھ رہ جاتا ہے کہ انھیں عہد آفریں اور عہد ساز ماننا ہی پڑتا ہے ان کا احساس آفاقی اور طرز بیان ایسا قاموسی ہے کہ ان کی بہترین تحریروں کو پڑھ کر وہی حیرت اور بے زبانی طاری ہوتی ہے جو اہرام مصر یا روم کے کلیسا پر مائیکل انجلو کے شاہکاروں کو دیکھ کر ہوتی ہے. مزاح نگاری ان کے لئے بہت چھوٹا لفظ ہے اگر وہ مزاح نگار ہیں تو ان کی سطح اور وہ پہنچ کی نہیں برنارڈ شا کی ہے جس کے ہاں طنز و مزاح زندگی کے بہتر فکری عرفان سے پیدا ہوتا ہے. (یہاں مثالیں اس لئے بے کار ہیں کہ یوسفی صاحب کی تحریریں ہندوستان کے ہزار دو رسالے نے نقل کر کر کے عام کر دی ہیں.)

ابن انشا کے مزاح کا بالکل جداگانہ رنگ ہے جس میں قاموسی رنگ نہیں ریشم کے رومال کو تلوار کے ایک وار سے کاٹ کر رکھنے کی حریر و پرنیاں والی کیفیت ہے یہاں جادو نہ کرداروں کا ہے نہ مشاہدے کا اپنی ذات کے کھلے ڈلے پن کا ہے جو ہوا کے جھونکے کی طرح بے محابا اور فرحت بخش ہے وہ دوستوں کا دوست ہے اور اپنی ذات کے ہر ورق کو کھلی کتاب کی طرح سامنے رکھ دینے کے لئے بے قرار، سفر ناموں میں یہ خوبی اور بھی کھل کر سامنے آئی ہے یہ خوشگوار زود ہضم اور فرحت بخش رنگ جو ذرا دوسرے رخ سے دیکھئے تو شاید غالب سے شروع ہوا تھا ابن انشا پر ختم ہوا۔

محمد خاں نے کمال کیا کہ فوجی زندگی کو مزاح کا موضوع بنایا اور اپنے اوپر جی بھر کر ہنستے ہنساتے "بجنگ آمد" کا کارزار سجا دیا یہاں تو خیر سے کردار بھی ہیں اور واقعات بھی، مگر ان کے بیان میں وہ لطافت اور شائستہ احتیاط ہے جو اسے خاصے کی چیز بنا دیتی ہے. معمولی سے معمولی بات محمد خاں کے انداز بیان سے ایک لطیف تجربہ اور ایک فن کارانہ شاہکار کی شکل اختیار کر لیتا ہے. یہ انداز بیان کا معجزہ نہیں انداز نظر کی بوقلمونی اور احساس کی رنگارنگی کا کمال ہے یہاں ایک فوجی کرنیل کے بنگلے کا بیان اور اس کے پیرایے اور پینترے ملاحظہ ہوں۔

"الغرض ہمارے بنگلے کا مزاج ہر زاویے سے امیرانہ تھا مقابلے میں ہمارے اثاثے کے تیور ہر چند کہ خاکسارانہ تھے تاہم اپنے مکان کی شان کے پیش نظر ہم نے جوں توں کر کے ہر کرے کے لئے ایک قالین یا دری پیدا کر لی ہر چند کہ اس کار خیر کا بیشتر اجر مقامی کباڑیے کو ملا. علاوہ ازیں

مناسب فرنیچر بھی حاصل کر لیا، کچھ اپنا کچھ ایم ای ایس کا۔ کھانے کے کمرے میں کرایے کا ریفریجریٹر بھی رکھ دیا جو خریدے ہوئے ریفریجریٹروں سے کسی طرح مختلف نہ تھا سوائے اس کے کہ نصف پیری سے اس کا ذوق برودت کسی قدر سست ہو گیا تھا اور شاید اسی لئے عدی کو ذرا تیز لے میں پڑھتا تھا بہرحال یہ ہمارا اور ریفریجریٹر کا اندرونی معاملہ تھا۔ ہمارے گول کمرے میں لفٹینی کے زمانے کا ریڈیو تو تھا ہی ــــ جو نئے ریشمی غلاف میں خاصہ کم عمر نظر آتا تھا ــــ شہر میں ٹیلی ویژن آیا تو ہم ایک ٹیلی ویژن سیٹ بھی لے آئے جسے دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ قسطوں پر خریدا گیا ہے۔ الغرض ہمیں تو نہیں ہمارے ملنے والوں کو ہماری فارغ البالی کا رشک آور احساس ہوتا تھا۔"

اس احساس کے پیچھے کیسی خود شناسی، کیسا کرب آمیز مزاح اور کیسی اسلوبیاتی تہہ داری چھپی ہے ریفریجریٹر کے شور کو عدی خوانی سے تعبیر کرنا اور اس کی سن رسیدگی کو ذوق برودت کی سستی قرار دینا کیسا لطیف پیرایہ ہے۔

ابراہیم جلیس کے کالم مدتوں پاکستانی صحافت میں دھوم مچاتے رہے۔ اب جبکہ ان کا قلم ساکت ہے ان کے طنز کی کاٹ اور ان کی مزاح کی شگفتگی اور روانی یادگار بن گئی ہے۔ سماجی ناہمواریوں پر شگفتہ اور شائستہ انداز میں طنز، عصری زندگی کی زہرناکیوں اور بوالعجبیوں پر سوچے سمجھے قہقہے اور خوش دلی کا وہ سجیلا اور رنگیلا اسلوب جو ہر بات میں ایک بات پیدا کر دیتا تھا۔ اسی سے ابراہیم جلیس اور ان کے مزاحیئے پہچانے جاتے تھے۔

نظم میں مجید لاہوری صحافتی اسلوب سے دامن چھڑا نہ سکے اور اسی لئے ان کی تحریروں میں فکری گہرائی اور توانائی پیدا نہیں ہو سکی قہقہے تو ابھرے لیکن قہقہوں کے بین السطور میں احساس و ادراک کی تابناکی ایسی نہیں جو ہنسی ہنسی میں لطف سخن کو عرفان کائنات بنا سکے۔ سید محمد جعفری کا جو ہر پیروڈی میں کھلا۔ بلا مبالغہ وہ ہمارے سب سے بڑے پیروڈی نگار شاعر ہیں نہایت نازک اور مشکل تخلیقات بھی ان کی توجہ سے نہیں بچ سکیں۔ اقبال کی مشہور 'لا الٰہ الا اللہ' والی ردیف کی غزل کی پیروڈی کا ایک شعر ہے: خودی کو پال کے دنبہ بنا دیا ہم نے چھری ہو اس پہ رواں لا الٰہ الا اللہ

طنز و مزاح نے پاکستانی اردو ادب کو نئی توانائی اور تابناکی بخشی ہے اور اس اعتبار سے سرحد کے اُس پار کی انگلی تحریروں نے ہندوستان کے اردو لکھنے والوں میں بھی افتخار کا احساس بیدار کیا ہے۔

٭

محمد حسن

نئے پاکستانی افسانے کے چھ رنگ

۱۔ غلام عباس کو نیا کہنا مشکل ہے مگر ان کے نئے افسانے جدید عصری حسیت کے عکاس ہیں۔ غلام عباس اپنے افسانوں میں سماجی احتجاج کی زیریں لہر کو فن کے رموز وآداب میں ایسا سموتے ہیں کہ ان کے افسانے مدتوں ذہن پر نقش رہتے ہیں۔ وجہ بتانا مشکل ہے شاید سماجی زندگی کی ناہمواریوں پر ان کی بے مثال گرفت، شاید پیرایۂ اظہار کی نرمی اور شائستگی شاید ان کی تجزیاتی بصیرت ؟ 'دھنک' اس کی منفرد مثال ہے۔

۲۔ احمد ندیم قاسمی پنجاب کے دیہاتوں کی تصویر کشی کرنے والے تنہا فن کار جس نے پاکستان میں ابھرنے والی نئی تہذیبی اکائیوں کو بھی کھلی آنکھوں دیکھا۔ احمد ندیم قاسمی کے افسانے عام پاکستانی دیہات اور قصبوں، خاندانوں اور شہروں کی زندگی کی داستانیں کہتے ہیں ان افسانوں کے آئینے میں پاکستانی معاشرے کے روپ رنگ پہچاننا آسان ہے۔

۳۔ انتظار حسین نے افسانے کا رشتہ داستان اور دیومالا سے جا ملایا۔ دراصل وہ فسانے کا رشتہ قصبات کے اس قبل تقسیم والے کلچر سے ملانے چلے تھے جو ہندوستانی مسلمانوں کے نچلے متوسط طبقے کے لئے مخصوص تھا مگر اس تہذیبی بازیافت کے پھیر میں وہ کچھ زیادہ پیچھے چلے گئے۔ اس تمام دیومالائی اور طلسماتی 'فارم' کو بھی انھوں نے اپنا لیا جو قصبات کے ان طبقوں میں عام تھا۔ وہی داستانوں والی فضا، وہی جادوگرنیاں اور چھل پیریاں، وہی پرانے اساطیری کردار جن پر ایک لمحے کے لئے یقین کر لیجئے تو زندہ ہو جائیں۔ انتظار نے ان اسالیب سے کام لیا اس معاشرے کی بے چینی ظاہر کرنے کا جو مشینی اور صنعتی شہروں کی بے سمتی سے ہراساں ہے اور

سامنے کا راستہ دشوار گزار پاکر گردش ایام کو پیچھے کی طرف دوڑنے کا حکم دینے لگتا ہے۔ انتظار کا افسانہ کھوئے ہوئے یقین کی تلاش کا افسانہ ہے اور یہ تلاش وہ ماضی کے انبار میں اس طرح کر رہے ہیں کہ اس سے مستقبل پر روشنی پڑ سکے گو اس یقین سے انھوں نے جو رشتہ قایم کیا ہے وہ عقل سے بیزاری اور ANTI-RATIONALISM کے ذریعہ قایم ہوا ہے اور اس پر سریت اور تصوف کی چھوٹ پڑتی ہے۔ بایں ہمہ انتظار نے اردو افسانے کو دیومالائی یا اساطیری جہت دی اور بڑی بات یہ ہے کہ کئی اچھے افسانے لکھے ہیں۔

۴۔ انور سجاد: "کونپل"، "گائے" والے انور سجاد بھرپور احتجاج کی آواز کے ساتھ آئے اور علامتوں کا دروبست "استعارے" کی اکثر کہانیوں میں ایسی خوبی اور انوکھے پن سے ابھرا کہ افسانہ انقلابی رزمیہ بن گیا۔ ان کی کہانیوں میں دبے کچلے انسان اپنی کھوئی ہوئی آواز پاتے ہیں ان کی آنکھیں بے خوف ہیں اور ان کا قلم ہمدرد۔ ان کے استعارے جب کبھی سماجی حقیقت سے منور ہو جاتے ہیں تو ان کی معنویت کی روشنی دور تک پھیلتی ہے ورنہ چیستاں بن کر رہ جاتے ہیں۔ انور سجاد نے بہر حال اردو افسانے کو علامتی تہہ داری کا فن دیا اور ابھی تک اس کوچے میں اس کے نقوشِ قدم سب سے آگے ہیں۔

۵۔ رضیہ فصیح احمد: پاکستان کے اردو افسانے میں احتجاج کی سنبھلی ہوئی آواز، علامتی پیرایے کے تخلیقی استعمال کی علمبردار، فرد کی نفسیات اور سماجی استحصال کے رشتوں کی نئی سرحدیں افسانہ لکھنے والی تنہا فن کار عورتوں کے استحصال اور ان کی فطری صلاحیتوں کے بے محابا قتل پر "جب بھوپی کھوئی گئی تھی" اور آزادیٔ اظہار پر "بارش کا پہلا قطرہ" جیسے خوبصورت اور لازوال افسانوں کی اس مصنفہ نے انسانی استحصال کی داستان کو علامت کی زبان دے دی۔

۶۔ افسر آذر: نے اگر صرف ایک افسانہ "آنے والے لوگ" ہی لکھا ہوتا جو اسے زندۂ جاوید کرنے کو کافی تھا مگر افسر آذر ایک افسانے کا نہیں ایک افسانوی روایت کا نام ہے جس میں احساس کا چٹیلا پن، اظہار کی زہرناکی اور احتجاج کی مقدس آگ شامل ہے اور پھر اس کا افسانہ احتجاج سے آگے اثبات تک جاتا ہے۔

سچی کہانیاں۔۱

اسحاق محمد

ایک انقلابی کی سرگزشت

۱۹ر نومبر ۱۹۶۰ء

("حسن ناصر کی شہادت" اردو ادب میں ایک انوکھی تصنیف ہے۔ یہ کتاب اسحاق محمد نامی ایک وکیل نے مشہور پاکستانی کیمونسٹ نوجوان رہنما حسن ناصر کی شہادت کے سلسلے میں ہونے والی اس قانونی کارروائی سے متعلق ہے جو اسحاق محمد صاحب نے ایک عام شہری کی حیثیت سے شروع کی تھی اور جس کارروائی کے نتیجے کے طور پر حسن ناصر کے مقدمے نے پاکستان کی رائے عامہ کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ انقلابیوں کو نیا حوصلہ دیا اور حکومت کے جبر و تشدد کا بھانڈا پھوڑ دیا۔ اس کے علاوہ اس کتاب کی خوبی یہ ہے کہ بھیانک حقیقتوں اور واقعات کا نہایت موثر اور دل دوز اظہار ہے جو اس کی ادبیت کا ضامن ہے۔ ہم اس اہم ادبی تصنیف کا ایک اقتباس شائع کر رہے ہیں۔ ادارہ)

لاہور کی سردیوں کی سنہری دھوپ بڑی لطیف شے ہے اور بڑا ہی لطف دیتی ہے۔ لاہور میں رہائش کے دنوں میں میں اکثر سہ پہر کو مال روڈ پر چہل قدمی کو نکل جاتا تھا۔ نومبر ۱۹۶۰ء کے وسط میں سہ پہر کو میں یونہی فٹ پاتھ پر ادھر مال کی طرف چل پڑا۔ مال پر بڑی رونق تھی۔ یہ کھاتے پیتے پنجابیوں کی گزرگاہ ہے۔ جو گندم کی زیادتی اور فکر کی کمی کی بدولت اپنی زندہ دلی کے لئے مشہور ہیں جگہ جگہ سنہری پھلوں سے بھری ہوئی چھابڑیاں ان کی خوش خوراکی کی داد دے رہی تھیں۔ میں یوں چل رہا تھا گویا قدموں میں اسپرنگ لگے ہوں۔ میں خوش تھا، میری دنیا خوش تھی۔ آرٹس کونسل کے

گیٹ پر پہنچا تو اس میں گھوم گیا۔ فیض صاحب کے کمرے میں داخل ہوا تو ایک دھچکا سا لگا۔ جیسے کہ بے اطمینانی کا تھپڑ سینہ پر لگا ہو۔ فیض کے چہرے پر انتہائی ملال نمایاں تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اُٹھ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے چلو کہیں چائے پیتے ہیں۔ میں پریشان ہو گیا۔ بالکل لڑکھڑا سا گیا۔ فیض کو غم میں ڈوبے اکثر دیکھ چکا تھا۔ چار سال کی قید کے دوران ابتلا کے کئی مقام آئے تھے مثلاً مقدمے کی کارروائی جاری تھی کہ ان کے بھائی کی اچانک موت کی خبر آئی تھی۔ یہ بھائی لاہور سے ایک پیر صاحب کی بشارت لیکر حیدرآباد آئے تھے کہ نماز میں خود ہی سجدے سے نہ اُٹھے تھے۔ جیل کی بے بسی نے غم والم میں اتنا اضافہ کر دیا تھا لیکن فیض کو اُس دن بھی ایسا نہ پایا تھا جیسا آج دیکھ رہا تھا۔ وہ مشیت ایزدی کا معاملہ تھا۔ آج یقیناً فیض کو کسی شخص نے دکھ دیا ہو گا۔ پس ماندہ سوسائٹیوں میں مشیت ایزدی کی بے پناہ مار دھاڑ انسانوں کو اس کا خوگر بنا دیتی ہے۔ انسانوں سے انتقام لینے کا جذبہ البتہ ابھی تک زندہ ہے میں ایسے ہی خیالات میں غلطاں تھا کہ ہم قریب کے ایک ریسٹوران میں داخل ہو گئے۔

ریسٹوران سنسان پڑا تھا اس کے آباد کار دفتروں میں بند تھے۔ لیکن فیض نے اس وقت تک منہ نہ کھولا جب تک بیرا چائے کا سیٹ رکھ کر دور نہیں ہٹ گیا۔

"تمہیں معلوم ہے کہ قلعہ میں ہمارا کون آدمی بند ہے؟" فیض نے دہشت زدہ انداز میں سرگوشی کی۔

"نہیں تو۔ حسن ناصر؟"

"ہاں۔"

"پچھلے مہینے میں وہاں بند تھا تو مجھے شک پڑا تھا کہ وہ وہاں ہے یا ہو کر گیا ہے میں نے ایک سی آئی ڈی والے سے پوچھا تھا۔ تو اس نے انکار کیا تھا۔ کہتا تھا وہ کراچی سے متعلق ہے۔ ایک صاحب نے البتہ کچھ دن ہوئے مجھے بتایا تھا کہ وہ قلعہ میں نظر بند ہے۔ اس پر تشدد ہو رہا ہے۔ بے پناہ تشدد۔"

فیض نے چائے سے بھری ہوئی پیالی کو ہاتھ نہیں لگایا تھا البتہ سگریٹ کے تیز تیز کش لگا رہا تھا۔ میرے ہاتھ میں تھمی ہوئی پیالی پرچ پر گر سی پڑی۔ بیرا چونک کر قریب آ گیا۔ فیض نے اشارے سے اسے پرے بھیجدیا۔

"بے پناہ تشدد؟" میں نے سسکی بھری۔

"ہاں حمید اختر نے بتایا ہے۔ دوسرے ذرائع سے بھی یہ بات مجھ تک پہنچی ہے۔ تمہیں خبر

نہیں ؟ میں تو سمجھتا تھا کہ سارا شہر جانتا ہے۔

"آپ کے تو زندگی کے ہر شعبہ میں عقیدت مند موجود ہیں۔ دشمنوں کے ساتھ کبھی میری مروت نہیں رہی، دوستوں کا مدارا آج کل مدھم ہے۔ خود ڈھونڈ نکالوں تو برداشت کر لیتے ہیں۔"

"حمید اختر کے محلے کی ایک عورت کا خاوند قلعہ میں بند ہے۔ حمید اختر کی انٹیلی جنس کے سید اعجاز حسین شاہ کے ساتھ یاد اللہ ہے اس کی سفارش پر اس عورت کو اپنے خاوند تک کھانا لے جانے کی اجازت ملی ہوئی ہے اس کا کہنا ہے کہ قلعہ میں ایک سیاسی قیدی پر تشدد ہو رہا ہے۔ اس کی کربناک دھاڑوں سے قلعہ کے دوسرے باسی سہم گئے ہیں۔ عورت نے کہا ہے کہ تین دن تک قلعہ بند رکھا گیا ہے اور وہ خاوند تک نہیں پہنچ سکی۔"

"کب کی بات ہے؟"

"پوری خبر نہیں، یہی تین چار دن ہوئے حمید اختر ملا تھا۔ تعجب ہے تمہیں خبر نہیں ہوئی میں تمہارے پاس آنے کی سوچ رہا تھا۔ حسن ناصر حیدر آباد دکن کے ایک متمول خاندان کا فرد ہے اس کے رشتہ دار پاکستان میں موجود ہونے چاہئیں۔"

"کراچی میں ہوں گے۔ آپ نے کسی کو ٹیلی فون کر لیا ہوتا۔"

"میں کسی کو جانتا نہیں ہوں۔"

"عطا کو ٹیلی فون کرتا ہوں۔ شاید وہ کسی کو ڈھونڈ نکالے۔" زیادہ وقت ضائع کرنے کی گنجائش نہیں تھی اس لئے ہم وہاں سے نکل آئے۔ فیض آرٹس کونسل واپس ہو گئے میں اپنے دفتر روانہ ہو گیا۔ مال روڈ بدستور زندہ دلی کا مرقع تھی۔ لیکن یہ سین مجھے ایک آنکھ نہیں بھا رہا تھا میں غم زدہ بھی تھا اور بڑے غصے میں بھی۔ ایک غصہ تو مجھے فیض پر آ رہا تھا کہ محض تساہل کی وجہ سے اتنا بڑا پتھر سینے پر رکھے پھرتا تھا، ذکر تک نہیں کیا۔ ساتھ ہی خود پر غصہ آ رہا تھا کہ فیض بتا بھی دیتے تو میں کیا کر لیتا۔ اب کیا کر لوں گا۔ مال روڈ پر قہقہے بکھیرنے والی مخلوق سے بھی زچ ہو رہا تھا کہ ڈھگوں کی طرح دنیا کے غم کو سمونے کی قدرت نہیں رکھتے اور زر، زن، زمین کے لئے سیکڑوں ہزاروں قتل کرنے سے دریغ نہیں کرتے۔ قلعہ کے سی آئی ڈی والوں کو کوس رہا تھا کہ ایک غریب شہر پر درندوں کی طرح جھپٹ رہے تھے۔ حکمران طبقوں پر لعنت بھیج رہا تھا کہ حسن ناصر جیسا انسانیت کا شاہکار ان کی ہوس

اور خوف کے ہاتھوں کربناک اذیت کا نشانہ بنا تھا۔ ہر قدم پر جی چاہ رہا تھا کہ اپنا گریبان پھاڑلوں اور ان کی اسپرنگوں پر تیرتی ہوئی کاروں پر پتھراؤ کروں اور پنجابی میں زور زور سے گالیاں دوں۔ اسی وحشت زدگی کی حالت میں لڑھکتا پھرتا اپنے دفتر پہنچا۔ سید اخلاق حسین کے ٹیلی فون سے کراچی کے لئے کال بک کرائی۔ کراچی کا ٹیلی فون ملا تو معلوم ہوا کہ عطا شام کو ملیں گے۔ ان کے لئے پیغام دیا کہ جوں ہی آئیں مجھے ارجنٹ ٹیلی فون کریں۔ خود انتظار میں وہیں بیٹھ گیا۔

دفتر خالی تھا کئی گھنٹے اندیشہ ہائے دور دراز غلطاں رہا۔ تخیل کی آنکھ مجھے طرح طرح کے بھیانک سین دکھاتی رہی۔ کبھی دیکھتا تھا کہ حسن ناصر اندھیرے تہہ خانے میں پڑے پڑے اندھا ہو گیا ہے اور پولیس والے اس تذبذب میں ہیں کہ رحم دلی کر کے اسے زندہ چھوڑ دیں اور اس طرح اپنی بہیمیت کا چلتا پھرتا ثبوت دنیا کو دے دیں۔ یا پھر اس کا قصہ تمام ــــ یہاں سے آگے میرے تخیل کو جانے کا یارا نہیں تھا جنگ کے دنوں میں میں برما اور ملایا رہا تھا۔ وہاں جاپانیوں کے تشدد کرنے کے طریقوں کے بارے میں بڑی تفصیلی معلومات حاصل کی تھیں۔ کبھی حسن ناصر کو اسی طرح کے تشدد کا نشانہ ہوتے دیکھتا۔ شاہی قلعہ کے بارے میں بھی بہت سی داستانیں سن رکھی تھیں۔ خود مجھے دو دفعہ وہاں رکھا گیا تھا۔ اندھا ہو جانے کی بات اپنے تجربے سے حاصل کی تھی۔ کوئی مہینہ بھر پہلے میں ایک مہینے کی قید کاٹ کر قلعہ سے رہا ہوا تھا۔ مجھے جس کوٹھری میں رکھا گیا تھا اس میں ایک ہی سوراخ تھا۔ جو اس کا دروازہ تھا یا پاخانے کی موری تھی۔ جو دروازے کے پہلو میں تھی۔ دروازہ شمال کو کھلتا تھا اس لئے سورج کی شعاعیں کمرے میں داخل نہیں ہوتی تھیں۔ مہینہ بھر میں سورج نہیں دیکھ سکا تھا۔ چنانچہ جس دن رہا ہوا ہوں اس دن سورج دیکھا تھا۔ میں کئی دن اپنے گھر کی ایک اندھیری کوٹھری میں پڑا رہا تھا کیونکہ معمولی سی روشنی سے بھی آنکھوں میں درد کی بھٹی گرم ہو جاتی تھی۔ ٹیلی فون کے پاس بیٹھے ہوئے بھی میں آنکھوں میں کسک محسوس کر رہا تھا (بعد میں مجھے بینائی کے چشمے لگوانے پڑے تھے۔)

حسن ناصر کے کسی قریبی رشتہ دار کی تلاش اس لئے تھی کہ قلعے کے نظر بندوں کو صرف ان کے رشتہ دار مل سکتے تھے۔ میں چاہتا تھا کہ اس کا کوئی رشتہ دار آ کر ملاقات کرنے کے لئے سلسلہ جنبانی شروع کر دے ہم بھی اس کی امداد میں افسروں کے دروازے کھٹکھٹائیں۔ ممکن ہے ظلم کے لئے اٹھتے ہوئے ہاتھ سمٹ جائیں یا اندھیرے کی الائیں بلائیں روشنی کی کرن کو بڑھتے ہوئے دیکھ کر ادھر اُدھر ٹل جائیں یا کم

الغرض ہمارے دوست کی ڈھارس بندھے اور وہ ابتلا کی گھڑیاں زیادہ پامردی سے برداشت کر سکے اور بقول فیض اس قسم کا احساس اس میں پیدا ہو سکے کہ ؎

ہو نہ ہو اپنے قبیلے کا بھی کوئی لشکر   منتظر ہو گا اندھیرے کی فصیلوں کے اُدھر

لاہور کے شاہی قلعہ کے بندیخانے کا سرکاری درجہ ایک چھوٹی جیل کا ہے جو ڈپٹی انسپکٹر جنرل سی آئی ڈی کی تحویل میں ہے۔ عقبی دروازے سے قلعہ میں داخل ہو کر سڑک پر چڑھتے جائیں اور دیوان عام کے سامنے والے میدان کی سطح پر پہنچتے ہی دائیں کو گھومیں تو سامنے اسی بندیخانے کا پھاٹک ہے۔ پھاٹک کے اندر ساتھ ہی بائیں کو نئی بنی ہوئی کوٹھریوں کی ایک قطار ہے۔ سنا جاتا ہے کہ یہ اسمگلروں وغیرہ غیر سیاسی لوگوں کے لئے ہیں۔ اس کے ذرا سا آگے بائیں طرف کو ہی ایک مغلوں کے وقت کی دیوار ہے جس میں ایک معمولی سا دروازہ ہے۔ اس احاطے میں چھ کے قریب علیحدہ علیحدہ کوٹھریاں ہیں۔ ان کو اس ترتیب سے بنایا گیا ہے کہ ایک کوٹھری کے اندر سے دوسری کوٹھری میں نہیں جھانکا جا سکتا۔ پھاٹک کے اندر دائیں کو ایک راستہ دیوار کے ساتھ ساتھ نیچے اتر جاتا ہے۔ وہاں بھی قیدیوں کے لئے تہہ خانے ہیں۔ پھاٹک کے عین سامنے دو منزلہ عمارت ہے جس کی نچلی منزل حقیقت میں آدھی زمین دوز ہے۔ دوسری منزل میں دفتر ہے۔ اس سے ملحقہ دو کوٹھریاں ہیں۔ یہ قید خانہ دراصل سی آئی ڈی کا تفتیشی مرکز ہے۔ ایک وقت میں یہاں بیس کے قریب قیدی رکھے جاتے ہیں جن کو پوچھ گچھ مکمل ہونے پر عام جیل میں بھیج دیا جاتا ہے۔ اس مرکز کو انگریزوں نے ترتیب دیا تھا اور ان کے زمانے میں بعض سرکردہ سیاسی رہنما یہاں رکھے جا چکے تھے۔

اس جگہ کو جیل کہنا جیل کی بھی تضحیک ہے۔ یہ تو دہشت گردی کا کولہو ہے جس میں حکمراں طبقے کے مخالفوں کو جسمانی اور روحانی طور پر پیلا جاتا ہے۔ ہر کوٹھری کے دو طرح کے دروازے ہوتے ہیں۔ لوہے کا جنگلہ اور لکڑی کے کواڑ۔ عام طور پر لوہے کے جنگلے پر ہمہ وقت تالا لگا رہتا ہے۔ سامنے رائفل پر سنگین چڑھائے سنتری ٹہلتا رہتا ہے۔ لکڑی کے کواڑ اس وقت بند کر دیئے جاتے ہیں جب قیدی کو باہر جھانکنے سے روکنا مقصود ہو۔ مثلاً جب سامنے سے کسی دوسرے قیدی کو گزارنا ہو۔ قیدی کے سونے کے لئے سیمنٹ کا پختہ تھڑا ہوتا ہے۔ دو مٹی کے گھڑے ہوتے ہیں جن میں ماشکی اکثر باہر ہی سے پانی بھر جاتا ہے۔ روٹی بھی باہر ہی سے لوہے جنگلے سے گزار دی جاتی ہے۔ کوٹھری کی ایک دیوار میں

سوراخ کر کے پاخانہ بنایا ہوتا ہے جس کو بھنگی اکثر باہر سے ہی آکر صاف کر جاتا ہے۔

مجھے دو دفعہ قلعوں میں لے جایا گیا۔ مارچ ۱۹۶۹ء میں کوئی دس دن کے لئے جب مجھے جیل گئے کوئی پانچ مہینے ہو چکے تھے اور ۲۲ ستمبر ۱۹۶۰ء کو مجھے گھر سے پکڑ کر سیدھا قلعہ میں لے جایا گیا اور ایک مہینے کے بعد چھوڑ دیا گیا۔ دونوں دفعہ دفتر میں بلا کر مجھ سے سرسری سی پوچھ گچھ کی گئی۔ میں ایک کھلم کھلا زندگی گزار رہا ہوں۔ ظاہر ہے میرے بارے میں کوئی بات خفیہ نہیں تھی حسن ناصر کا معاملہ کچھ اور تھا وہ تقریباً دو سال رو پوش رہا تھا اس کے رابطے دریافت کرنا ہی بڑا پوچھ گچھ کا کام تھا۔

۱۹۵۹ء میں میرے ساتھ کافی نرمی برتی گئی۔ اس کی بڑی وجہ غالباً یہ تھی کہ میری گرفتاری ۱۵ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو شیخ منظور قادر کے دفتر سے ہوئی تھی جہاں میں ان سے وکالت سیکھ رہا تھا۔ شیخ صاحب نے اس پر سرکاری حلقوں میں بڑا احتجاج کیا تھا۔ اس وقت نیا نیا مارشل لا لگا تھا۔ ملک میں دہشت پھیلی ہوئی تھی۔ شیخ صاحب کی اس حرکت پر لوگ دم بخود تھے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ جلد ان کو کراچی سے سرکاری بلاوا آیا تو ان کے گھر والے گھبرا گئے کہ شاید ان کے خلاف کارروائی ہوگی لیکن ہوا الٹ انھیں وزارت خارجہ تھوپ دی گئی تھی۔ حال ہی میں وزیر اعظم مسٹر ذوالفقار علی بھٹو نے مجھے بتایا کہ مسٹر منظور قادر نے مرکزی کابینہ میں بھی میری گرفتاری کا مسئلہ اٹھایا تھا تو فیلڈ مارشل ایوب خاں ان پر برس پڑا تھا کہ؛ "O, THAT BLOODY COMMUNIST

HE SHOULD BE EXECUTED. IF I WERE

YOU. I SHOULD KEEP AWAY FROM HIM."

"اوہ تم اس ناہنجار کمیونسٹ کی بات کر رہے ہو میرے خیال میں وہ تختۂ دار کا مستحق ہے میری مانو تو اس سے دور ہی رہو۔" (یہ نہیں کہا جا سکتا کہ مسٹر بھٹو نے خوش گپی میں یہ واقعہ بیان کیا ہے یا اپنی بات از حدیث دیگراں مجھ تک پہنچائی ہے) پولیس والوں کو ایوب خاں کی اس بات کی خبر شاید نہ ہوئی ہو۔ بہرحال میرے ساتھ متوقع سلوک نہ کیا گیا بلکہ شام کو ٹہلائی کے وقت وہاں کا انچارج انسپکٹر شیخ اکرام بھی میرے ساتھ ٹہلنے لگا تھا اور مختلف علمی موضوعات پر گفتگو کرتا تھا۔ ممکن ہے یہ بھی پوچھ گچھ کی ایک صورت ہو۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ دیکھئے میجر صاحب ہم قومی معاملات میں اختلاف رائے رکھ سکتے ہیں لیکن ہم پاکستان کے وفادار ہیں (ایک کوٹھڑی کی طرف اشارہ کر کے) لیکن آپ اس ہندو

کے بارے میں یہ نہیں کہہ سکتے۔ میں یہ کہتا کہ بھائی یہ آدمی پرنصر ہے اور اس کے مفادات پرو ہندو سے مراد اس کی کامریڈ سوبھو گیان چندانی تھے جو سندھ کے مشہور ترقی پسند ہیں۔ اس موقعہ پر مجھے صرف رہائی پر قلعہ کے دفتر سے ٹیلی فون کرنے دیا گیا بلکہ سوبھو سے ملاقات بھی کرنے دی گئی۔ جن سے ضروری کاغذات حاصل کر کے میں نے ہائی کورٹ میں ان کی رہائی کے لئے رٹ کی درخواست دائر کی تھی۔

۱۹۶۰ء میں میں نے حالات کو یکسر بدلا ہوا پایا۔ تمام پولیس والوں کے چہرے چڑھے ہوئے تھے اور یہ نہیں معلوم ہو رہا تھا کہ وہ خود ڈرے ہوئے تھے یا مجھے ڈرانا چاہتے تھے۔ ایک مہینہ میں مجھے صرف ایک آدھ بار دفتر میں پوچھ گچھ کے لئے بلایا گیا۔ میں نے پولیس ایس پی شہزادہ حبیب احمد کو صاف صاف کہہ دیا کہ میرے پاس نہ چھپانے کے لئے کچھ ہے اور نہ بتانے کو۔ لیکن قید کے دوران میں زبان نہیں کھولوں گا۔ یہ کہہ کر میں اس کے ردعمل کا منتظر رہا۔ لیکن مجھے واپس کوٹھری میں بھیج دیا گیا اور کوئی ردعمل ظاہر نہ کیا گیا اس سے مجھے اندازہ سا ہوا کہ پولیس والے کسی بڑی الجھن سے دوچار ہیں۔

حسن ناصر کے مقدمے کے دوران بار بار میرا دھیان قلعہ کے اس ہولناک اور پراسرار ماحول کی طرف جاتا تھا۔ حسن ناصر کا مقدمہ ختم ہونے کے کچھ روز بعد میرا راولپنڈی جانا ہوا۔ میرے دوست رضا کاظم مجھے شیخ منظور قادر کے پاس کھینچ کر لے گئے۔ باتوں باتوں میں حسن ناصر کے مقدمے کا ذکر آیا۔ شیخ صاحب مجھ سے مخاطب ہو کر کہا کہ "تمہیں شہید بننے کا شوق ہے۔ اب تو غیر ملکوں میں اس واقعہ سے پاکستان کی بدنامی ہو رہی ہے۔ غالباً ہوا صرف یہ ہے کہ تفتیش کے دوران کسی پولیس والے نے حسن ناصر کے پیٹ میں ٹھڈا مار دیا ہوگا وہ لاغر آدمی تھا شاید تلی پھٹ گئی ہو۔ گویا جب تلی پھٹ گئی تو خفیہ علاج کرانے کی کوشش کی گئی ہو۔ جب یہ کامیاب نہ ہوا تو خودکشی کا ڈھونگ رچایا گیا ہو یا گلا گھونٹنے کو خودکشی کا نام دے دیا گیا ہو۔ بدنامی کے ڈر سے لوگ اپنی بیٹیوں کا گلا گھونٹ دیتے ہیں ایک غریب الدیار کس کھیت کی مولی ہے۔

قلعہ کی سب سے بڑی دہشت گردی یہ ہے کہ قیدی کو اس حقیقت کا شدت سے احساس دلایا جاتا ہے کہ وہ بے یار و مددگار ہے سنگین چڑھی بندوق والا سپاہی اس کے سر پر چڑھا رہتا ہے لیکن بالکل خاموش۔ آدمی کی آدمی کے ساتھ اس سے بڑھ کر مخاصمت کا اور کیا اندازہ ہو سکتا ہے۔ ہفتے گزر جاتے ہیں اور کسی "انس" والے چہرے کا دیدار نصیب نہیں ہوتا۔ قلعہ کی قید کا تصور زیادہ ہولناک ہوتا جاتا ہے

کبھی کبھی آدھی رات کے وقت ایک طرف سے ایک دردناک ہوک فضا کو چیرتی ہوئی اٹھتی ہے اور قیدی کا کلیجہ منہ کو آجاتا ہے۔ کچھ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ پولیس والے خود ہی ایک خاص ماحول پیدا کرنے کے لئے یہ ڈرامہ کھیلتے ہیں یا واقعی کوئی درد مند اپنی برداشت کی قوت کھو بیٹھتا ہے اور دہائی دے اٹھتا ہے جس کو سننے والا اگر کوئی ہوتا بھی ہے تو اس کی بھی جان ہوا ہو جاتی ہے جس معاشرے میں اس قسم کے ناسور ہوں، جس قوم کو اس قسم کے اداروں کی ضرورت ہو اس کا استقلال سب دھوکا اور اس کا مستقبل معدوم۔

دوسری بار جو میں قلعہ میں بند ہوا تو پولیس والوں کی گھبراہٹ دیکھ کر گھبرا سا گیا جس طرح ایک کسان ایک دہشت زدہ بیل سے گھبراتا ہے کیونکہ اس کا رد عمل ڈرپوک بھی ہو سکتا ہے اور جارحانہ بھی۔ بیل کی جگہ ایک چیتا سمجھ لیا جائے تو میری صورت حال کچھ کچھ ذہن میں آسکتی ہے۔ کسان کے ہاتھ میں تو ڈنڈا ہو سکتا ہے اور وہ اِدھر اُدھر بھاگ دوڑ بھی سکتا ہے۔ یہاں چیتے کے ہاتھ میں سنگین جڑی بندوق تھی اور میں ڈربے میں بند تھا اور پوچھنے والا کوئی نہ تھا۔ چنانچہ میری سب سے پہلی کوشش یہ تھی کہ پوچھنے والا پیدا ہو۔ یہ پوچھنے والے ایک تو میرے خاندان کے لوگ ہو سکتے ہیں کیونکہ خاندان والے اپنے قیدی عزیز کو مل سکتے ہیں۔ چنانچہ میرے خاندان والوں کی یہ ایک ڈرل سی بن گئی ہے کہ جونہی میں جیل میں قدم دھرتا ہوں وہ ملاقات کے لئے دوڑ دھوپ شروع کر دیتے ہیں۔ قلعہ میں بھی میرا بھائی ڈاکٹر فتح محمد ملاقات کے لئے آیا۔ پھل فروٹ اور بہت سے انگریزی اور امریکی رسالے اور کئی کتابیں ساتھ لایا۔ ملاقات کے بعد میں پھر گمنامی کے اندھیرے میں چلا گیا یا باہر سے رابطہ کا دوسرا ذریعہ عدالت ہوتی ہے یعنی ہائی کورٹ میں ہیبئیس کارپس کی درخواست۔ اس کا دائرہ کار بھی محدود ہوتا ہے۔ اس کے ذریعہ ایک آدھ دفعہ ہی باہر آنے کا موقعہ مل سکتا ہے۔ اس کے بعد ایک لمبا اندھیرا۔ تیسرا ذریعہ یہ ہے کہ قیدی کے ساتھی اور دوست اخباری بیانوں اور قراردادوں کے ذریعہ ایک فضا بنائیں۔ چوتھا ذریعہ یہ ہے کہ حکمران ادارے کے اندر اپنا کوئی رابطہ ڈھونڈا جائے۔ لیکن ان ساری باتوں کی کامیابی کا انحصار بڑی حد تک خود قیدی پر ہوتا ہے کہ وہ کہاں تک خاطر جمعی قایم رکھ سکتا ہے۔ خاطر جمعی کی سب سے بڑی دشمن تنہائی اور الگ تھلگ ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ اس کو دور کرنے کا طریقہ کتابیں ہیں یا تاش وغیرہ کے کھیل جو قیدی اپنے ساتھ ہی کھیل سکتا ہو۔ عام جیل میں شطرنج کے شوقین جیلرس جاتے ہیں۔ وہاں آدمی

پھول اور سبزیاں اُگا سکتا ہے یا مرغیاں پال سکتا ہے۔ درود وظیفے اور عبادت کے دوسرے طریقے DISCIPLINE بھی مددگار ہوتے ہیں کہ ان کے ذریعہ طبیعت پر قابو پانے میں مدد ملتی ہے۔ بعض لوگ یوگا کی مشقیں کرتے ہیں۔ اسٹالین کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ایک ابتلا کی گھڑی میں اس نے اپنے ذہن کو انقلاب کے مسئلہ پر اس سارا سخ کیا کہ اذیت کا احساس تک نہ ہوا۔ شاعروں کے پاس اپنی طبیعت بہلانے کا ہنر ہوتا ہے اچھا گانے والا بڑا فائدے میں رہتا ہے۔ اہلیت رکھنے والے لوگ جیلروں کی ضعیف الاعتقادی کا فائدہ اٹھا کر ٹونے ٹوٹکے کا بھی دھندا کر سکتے ہیں لیکن پولیس والے کم ہی جھانسے میں آتے ہیں۔ ایک اور طریقہ جیلروں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کا ہوتا ہے ان پر مطالبات کی بھرمار ہوتی ہے لیکن اس میں بڑا خطرہ ہوتا ہے اور اس کو خوباں کے ساتھ چھیڑ سے مشابہ ہرگز نہیں سمجھنا چاہیئے۔

اس دفعہ قلعہ میں میں نے پولیس والوں کے ساتھ پوری منافقت برتنے کی کوشش کی۔ یہ صفت میری طبیعت کے بالکل اُلٹ بیٹھتی ہے۔ لیکن مرتا کیا نہ کرتا۔ بعض اوقات سوانگ اصلیت سے بھی زیادہ کارگر ہوتا ہے۔ جیسا کہ ایک ایکٹریس کے رونے کا مقابلہ گھر گھرہستی عورتوں کے بس میں نہیں ہوتا۔ خواہ غم سے ان کا کلیجہ پھٹا جاتا ہو۔ بظاہر میں پولیس افسروں کی موجودگی میں بڑا خوش وخرم رہتا تھا جب وہ آتے تو ان کے ساتھ خوش گپیاں کرتا، بے فکری کا تاثر دیتا۔ ان سے اخبار وغیرہ مانگتا۔ لیکن اس پردے کے پیچھے میرا رواں رواں ریڈیو کے ائریل کی طرح ان کے موڈ اور ارادوں کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا۔ اس سلسلے میں چھوٹے ملازموں کے ساتھ بڑی احتیاط برتنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان کے ساتھ شفقت سے پیش آنا چاہیئے لیکن ان کے ساتھ کھلنا نہیں چاہیئے کیونکہ یہ بھی مدمقابل کے کسی پلان کا حصہ ہو سکتے ہیں۔ ایک دن ایک سنتری نے مجھے بتایا کہ وہ میری پلٹن کا آدمی ہے اور اس پر کئے ہوئے میرے احسان اس کو سب یاد ہیں اور وہ میری ہر طرح کی خدمت بجا لانے کے لئے تیار ہے۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ صاحب خدا سے پناہ مانگئے یہاں بڑا ظلم ہوتا ہے۔ ہم نے اتنی سی سرگوشیاں کی تھیں کہ دور سے کسی نے اس کو جھاڑ پلا دی۔ میں یہ معلوم نہیں کر سکا کہ کس شخص نے اس کے ہونٹ ہلتے بھانپ لئے تھے یا یہ اعتماد حاصل کرنے کا بہلاوا تھا۔

قلعہ میں تین ہفتے گزر گئے تو میں نے ہائی کورٹ کے نام درخواست لکھ کر قلعہ والوں کو دے دی لیکن ساتھ ہی شیخ منظور قادر کے نام ایک لمبا سا خط لکھنا شروع کر دیا جس کو طول دینے کے لئے

طرح طرح کے مسائل اٹھائے۔ کہیں سارتر کا حوالہ دیا، کہیں والٹیئر کا۔ اس خط کے کچھ حصے کا ترجمہ درج ذیل ہے اس سے معلوم ہو جائے گا کہ اس دفعہ میرے دل میں کس قسم کے وسوسے پیدا ہو رہے تھے۔ (یہ خط انگریزی میں ہے)

مجھے اس حقیقت کا احساس ہے کہ میرے موجودہ مسکن سے خطوں کا مکتوب الیہ ہونا کچھ مناسب بات نہیں ہے۔

میں اس بارے میں کافی دنوں تک سوچا ہے اور اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ یہی وہ واحد صورت ہے جو ممکن ہے مجھے سکون سے زندگی بسر کرنے کا موقعہ فراہم کرے۔ فوج میرے متعلق تذبذب میں ہے بلکہ مجھے کہنا چاہیئے کہ تشویش میں ہے۔ کیونکہ ملازمت کے ایک اچھے ریکارڈ کے بعد میں نے مقدمہ سازش میں کسی حد تک ایک جارحانہ موقف اختیار کیا۔ اور اس کے بعد روایت سے مختلف سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ میری خواہش ہے کہ میرا یہ اندازہ غلط ہو لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ پولیس کا آج کل جس قسم کا مزاج ہے اس کے ہوتے ہوئے وہ میری طرف سے ایک رضا کارانہ بیان میں میرا اقبال جرم ڈھونڈیں گے۔ بہر حال اقتدار ایک ایسا گھڑیال ہے جو کہ اس کے بجانے والے کو بہرا اور سننے سے معذور کر دیتا ہے۔ آپ سے میری گذشتہ دوستی البتہ وہ چھوٹا سا سوراخ ہے جس میں سے میں آواز کی اس دیوار میں سے آپ تک اپنی بات پہنچا سکتا ہوں۔ میں خلوص دل سے اس سراسیمگی کے لئے معافی چاہتا ہوں جو آپ کو یقیناً پیش آئیگی کل مجھے ہائی کورٹ کے چیف جسٹس صاحب کے سامنے پیش ہونا ہے تا کہ ان الزامات کا جواب دے سکوں جو مجھ پر لگائے گئے ہیں چیف جسٹس صاحب غالباً مجھے رہا کر دیں گے۔ میں نے ان کے پاس درخواست اس لئے گذاری تھی کہ قانون ساز ادارے نے اپنی فہم و فراست کے حساب سے ہر شہری کو یہ حق دیا ہے لیکن اس سے مجھے کوئی اطمینان نہیں ملا۔ ایک انقلابی دور حکومت میں قانون کی باریک بینیاں کچھ ایسی اہمیت نہیں رکھتیں۔ اگر کوئی پھٹنے والا آتش گیر مادہ ہوگا تو اسے لازمی طور پر ہٹا دینا چاہیئے یا بجھا دیا جائے گا۔

اس خط میں میں نے مندرجہ ذیل پیرا بھی لکھا تھا لیکن میرے پاس خط کی جو نقل ہے اس میں اس پر لکیر پڑی ہوئی ہے۔ ممکن ہے اسے میں نے منظور قادر صاحب کو نہ بھیجا ہو۔

آج یہ کہنا ایک ہلکی اور عامیانہ سی بات ہے کہ پس ماندہ ملکوں میں حزب اختلاف پر بلا وجہ تشدد سے حکومتیں دنوں میں ختم ہو جاتی ہیں۔ لاطینی امریکہ، مشرقی وسطی، جنوبی ایشیا اور اب افریقہ کی تواریخ نے اس حقیقت کو بڑا واضح کر دیا ہے۔ نیک اور پدرانہ طبیعت کے مالک لوگوں نے اقتدار پکڑ کر رشوت ستانی، بلیک مارکیٹ، سیاسی دھینگا مشتی کو سختی کے ساتھ ختم کیا لیکن بدقسمتی سے وہ لوگوں کے معاشی حالات کو بہتر نہ بنا سکے بلکہ یہ پہلے سے بھی بدتر ہو گئے۔ لوگوں نے کھسر پھسر شروع کر دی کہ اگر حالات بہتر نہیں کئے جا سکتے تو ان پر ڈر اور خوف کیوں مسلط کیا گیا ہے۔ بیمار آدمی دکھ سے کراہنا چاہتا ہے۔ اس کے ردعمل کے طور پر عدالتی کارروائی کے بغیر نظربندیاں شروع کر دی گئیں۔ لوگوں پر جھوٹے مقدمے کھڑے کئے گئے۔ اس کے بعد لوگ راتوں کو اپنے گھروں کو نہ لوٹ سکے، اس کے بعد لوگوں کو ان کے اپنے گھروں کی دہلیزوں پر گولی مار دی گئی، اس کے بعد ایسی لاشیں ملنے لگیں جن کی تمام ہڈیاں چکنا چور کر دی گئی تھیں۔ اور آخر کار حکومت کی خرابی کو کوئی چیز بھی نہ روک سکی۔ تشدد جنم دیتا ہے تشدد کو۔ اور اس طرح ساری قوم کو ناقابل تلافی نقصان پہنچتا ہے لہٰذا دانش مندی کا تقاضہ ہے کہ لوگوں کو محض اس لئے قید خانے میں نہ ڈالا جائے کہ ان سے کچھ سوال پوچھنے ہیں۔ ۱۹۵۹ء میں بلکہ اسی سال کے شروع میں میرا قلعہ میں آنا ہوا تو میں نے دیکھا کہ نظربندی کا مرکز خالی پڑا ہے۔ آج یہ حد سے زیادہ بھرا ہوا ہے اور یہاں کا اسٹاف بھی مضمحل نظر آتا ہے۔ ایک حکومت کے لئے لازمی ہے کہ اپنے ہی عوام کی نظروں میں غیر نہ ہو جائے وگرنہ یہ جتنی سختی سے اپوزیشن کو دبائے گی اس کا استحکام اتنا ہی محدود ہو جائے گا۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ میرے ذہن میں اس قسم کے خیالات کیوں آئے کیا حسن ناصر پر ہونے والے تشدد نے وہاں کی فضا میں اس قسم کا ارتعاش پیدا کر دیا تھا کہ میرے حساس ایریل نے اسے ریکارڈ کر لیا تھا۔

عطا کے ٹیلی فون کا انتظار مجھے رات گئے تک کرنا پڑا۔ جب وہ آیا تو میں نے بڑے محتاط انداز میں اس کے ساتھ بات کی کیونکہ میں جانتا تھا کہ میرا اور غالباً اس کا ٹیلی فون بھی ٹیپ ہو رہے تھے۔ میں نے اس سے کہا کہ حسن ناصر قلعہ میں نظربند ہے اور بڑا بیمار ہے وہ اس کے کسی قریبی رشتہ دار کو ڈھونڈھ

اسلے اور اس سے کہے کہ ڈاکٹر حسن ناصر سے ملاقات کرے۔ اس نے مجھے بتایا کہ کچھ سال گزرے وہ اس کے ماموں کے متعلق جانتا تھا کہ ڈاکٹر ہے اور کراچی میں مقیم ہے۔ وہ اس کا پتہ چلانے کی کوشش کرے گا۔ عطا نے اگلے دن شام کو ٹیلی فون کرنے کا وعدہ کیا۔

۲۰ نومبر ۱۹۶۰ء

اگلے چوبیس گھنٹے میں گویا دہکتے کوئلوں پر لوٹتا رہا۔ اس ساری کارروائی کو خفیہ رکھنا بہت ضروری تھا کیونکہ پنجاب پولیس کے ہاتھ بڑے لمبے ہیں۔ میں چاہتا تھا کہ کسی نہ کسی طرح حسن ناصر کا کوئی رشتہ دار لاہور پہنچ جائے تاکہ ایک دم بچاؤ کی مہم کا آغاز کر دیا جائے۔ وقت سے پہلے اگر میری اس 'ٹکر توڑ' کا پتہ پولیس کو چل جائے تو مجھے بے ضرر کرنے کے لئے ان کے لئے مجھے قلعہ میں پھر سے بند کرنا زیادہ وقت طلب نہ تھا۔ کچھ دن پہلے ہی تو مجھے بلا وجہ وہاں لے جا چکے تھے۔

رات گئے عطا کا ٹیلی فون آیا۔ اس نے ایک عجیب سی حالت کا نقشہ کھینچا۔ اس نے بتایا کہ وہ ڈاکٹر مہدی حسن کے گھر پہنچا تو ڈاکٹر صاحب کو بڑا پریشان پایا۔ انھوں نے خیال کیا کہ عطا کوئی خفیہ پولیس کے آدمی ہیں، ان کی بڑی خاطر مدارات کی اور بڑی لجاجت سے باتیں کرتے رہے۔ کہنے لگے میں دل کا مریض ہوں۔ آپ کے حسب منشا میرا اجازت نامہ آپ کو مل گیا ہوگا۔ عطا نے اس بات سے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا اور میرا پیغام ان تک پہنچایا۔ وہ اور بھی افسردہ خاطر ہو گئے اور سسکی سی لے کر کہنے لگے اب کچھ نہیں ہو سکتا اب کچھ نہیں ہو سکتا اور اٹھ کر اندر چلے گئے۔ اندر سے تھوڑی ہی دیر کے بعد ان کی بیگم دیوانہ وار وارد ہوئیں اور چیخ چیخ کر عطا کو اپنے گھر سے نکال دیا۔ عطا سراسیمہ ہو کر باہر سڑک پر نکلے آئے اور ادھر ادھر سے دریافت کرنے لگے کہ ڈاکٹر صاحب کو کوئی صدمہ تو نہیں پہنچا۔ ان کو بس اتنا پتہ چلا کہ ہفتہ بھر سے ڈاکٹر صاحب نے اپنے کام پر جانا چھوڑ دیا ہے اور گھر سے باہر نہیں نکلتے۔ جب کہ کئی دفعہ پولیس کی گاڑیاں آئی گئی ہیں۔ محلے والے خود پریشان تھے۔ عطا سے میں نے پوچھا کہ کیا معاملہ ہو سکتا ہے۔ اس نے کہا کہ ڈاکٹر کے پاس کوئی بہت بری خبر آئی معلوم ہوتی ہے۔ ان کی بیگم کی گھبراہٹ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کو کوئی بڑا خطرہ درپیش ہے شاید پولیس نے دھمکایا ہو۔ عطا کا خیال تھا کہ حسن ناصر مرحوم ہو گئے ہیں۔ وہ ٹیلیفون پر زیادہ بات نہ کر سکا صرف اتنا کہا کہ میں جو کچھ بھی کروں، وہ میرا پورا پورا ساتھ دے گا۔

حسن ناصر کے مقدمے میں جس بات نے میرا حوصلہ برقرار رکھا وہ ابنائے وطن کی بے نظیر الفت تھی جس کا اظہار انھوں نے مقدمے کے ہر موڑ پر میری پوری پوری مدد کر کے کیا۔ مارشل لا کے دن تھے۔ ایوب شاہی عروج پر تھی۔ ملک میں کوئی دم نہیں مار رہا تھا پھر بھی لاہور ایسے لوگوں سے بھرا پڑا تھا جنھوں نے حسن ناصر کا نام تک نہ سنا تھا لیکن جب مقدمہ شروع ہوا تو ان کے ٹھٹ کے ٹھٹ عدالت کا کمرہ بھر دیتے تھے بلکہ بھیڑ برآمدوں تک پھیل جاتی تھی۔ خفیہ پولیس والے اپنے لاؤ لشکر سمیت موجود ہوتی تھی لیکن مرحبا ہے لاہوریوں کو کہ سینہ تان کر ان کو گھورتے رہے۔ میرے دفتر میں طالب علموں اور سیاسی کارکنوں کا ہر شام جمگھٹا ہوتا تھا۔ وکلا میں سے میاں محمود علی قصوری، میاں منظر بشیر، عابد حسن منٹو، چودھری فضل حسین، مس ندرت الطاف، سیف خالد اور دوسرے کئی وکلا نے امداد کی۔ ہائی کورٹ کے سابق جج میاں اخلاق حسین، ان کی بیگم ہما اخلاق حسین۔ ان کے صاحبزادے مدحت کاظم نے اس طرح اس معاملہ کو اٹھایا کہ گویا یہ مقدمہ ان کا ہے اور میں ان کا وکیل ہوں۔ سیاسی کارکنوں میں کامریڈ لال خاں مرحوم، اسلم اعوان بڑے چوکس رہے۔ میرے بھائی انور چودھری ان دنوں طالب علم لیڈر تھے جو طالب علموں کے ایک جم غفیر کے ساتھ عدالت میں موجود رہتے تھے۔ پاکستان ٹائمز، امروز، سول اینڈ ملٹری گزٹ اور دوسرے اخبارات بڑی تفصیل سے مقدمہ کی کارروائی شائع کرتے رہے۔ اس منظر سے گھبرا کر ایڈووکیٹ جنرل ایم انور عدالت میں بلبلا اٹھا تھا کہ "شرپسندوں کو اپنی سیاست کرنے کے لئے جب کوئی اور صورت میسر نہ آئی تو انھوں نے حسن ناصر کے بارے میں شوشا چھوڑا ہے"۔ کچھ عرصہ پہلے عطا اور حسن ناصر کی آپس میں ناراضگی ہو گئی تھی۔ حسن ناصر نے اس کا ذکر میرے پاس آکر کیا تھا۔ عطا نے کچھ نہیں کہا تھا اور نہ ہی میں نے اسے کچھ بتایا تھا۔ حسن ناصر ۶ اگست ۱۹۶۰ء کو گرفتار ہوئے۔ اس کے تھوڑے ہی دنوں کے بعد میرا کراچی جانا ہوا تو میری عطا سے ملاقات ہوئی۔ اس نے میرے پاس شکایتاً حسن ناصر کا ذکر کیا اور کہا کہ اسے اطلاع ملی ہے (ان دنوں عطا کی کراچی کے بعض اعلیٰ پولیس افسروں سے یاد اللہ تھی) کہ حسن ناصر نے پوچھ گچھ کے دوران بڑا غلط رویہ اختیار کیا ہے کہ پولیس کے پوچھنے پر جس بات کی اسے خبر ہوتی ہے کہہ دیتا ہے کہ معلوم ہے لیکن بتانے سے انکار کر دیتا ہے یہ تو تشدد کو دعوت دینا ہے۔ عطا نے کہا تھا کہ وہ حسن ناصر کو ایک عرصے سے جانتا ہے اور اسے معلوم ہے کہ حسن ناصر جان بوجھ کر ایسا نہیں کر رہا بلکہ وہ جھوٹ بول ہی نہیں سکتا۔ کچھ دنوں کے بعد جب مجھے پکڑ کر قلعہ لے گئے تو

اسی دن ایک پولیس والے نے مجھ سے پوچھا کہ بیجو صاحب آپ جھوٹ بول لیتے ہیں۔ میں نے جواب دیا
بالعموم کا انحصار اس پر ہے کہ مخاطب کون ہے۔ اس کے سوال سے میرے حافظے میں ایک گھنٹی سی بجی تھی
دوپہر میں نے پولیس والے سے پوچھا کہ کیا حسن ناصر بھی قلعہ میں ہے۔ اس نے جھوٹ بولا تھا کہ وہ کراچی کا
آدمی ہے وہیں ہوگا۔

۲۱ر نومبر ۱۹۶۰ء

رات بھر میں تذبذب میں رہا۔ یہ بات تو اب ثابت تھی کہ معاملہ کا بوجھ مجھے ہی اٹھانا تھا البتہ یہ سمجھ
میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں اور کیسے کروں۔ اب میں کئی دفعہ سوچتا ہوں کہ پولیس نے ستمبر میں لاہور میں
میرے سمیت پانچ گرفتاریاں اسی لئے تو نہیں کی تھیں کہ ہم ڈر جائیں اور حسن ناصر کا جو حشر کیا جانے والا تھا
اس کے بارے میں کوئی ہل چل نہ کریں۔ صبح میں ہائی کورٹ میں ایک مقدمے کی پیروی کر کے واپس اپنے
دفتر آ رہا تھا کہ دو سائیکل سوار قریب سے گزرے۔ میری شنوائی میں ایک نے دوسرے سے کہا کہ حسن ناصر
کی موت گت بنی۔ میرے لئے یہ بھانپنا مشکل نہیں تھا کہ یہ خفیہ پولیس کے آدمی تھے جو یوں بھی میرے
ساتھ سایہ کی طرح لگے رہتے تھے۔ گزشتہ دو دنوں کے کراچی کو کئے گئے ٹیلی فون کا ریکارڈ ضرور خفیہ
پولیس کو دستیاب ہوگا اور یہ فقرہ اس لئے کسا گیا ہوگا کہ میں ڈر جاؤں اور کسی قسم کی "شرپسندی" نہ کروں
مجھ پر اس کا الٹا اثر ہوا جو بات میں چھپا رہا تھا وہ ان تک پہنچ گئی تھی جن سے اسے چھپانا مقصود تھا چنانچہ
میں سیدھا میاں محمود علی قصوری کے دفتر چلا گیا اور ان سے بے کم و کاست سارا ماجرا کہہ سنایا۔
میاں صاحب سے رجوع کرنے کی تین وجوہات تھیں۔ اول شہری آزادیوں سے متعلق مقدمے لڑنے
میں ان کو بڑی مہارت اور شہرت حاصل تھی اور دائیں یا بائیں بازو کی تمیز کئے بغیر وہ بے شمار سیاسی
کارکنوں کے لئے عدالتی چارہ جوئی کر چکے تھے۔ دوسرے حسن ناصر وہ اور میں تینوں ایک ہی پارٹی یعنی نیشنل
عوامی پارٹی سے متعلق تھے۔ اپنے ایک ساتھی کی مصیبت کے وقت امداد کرنا ان کا بھی اتنا ہی فرض تھا
جتنا میرا تھا۔ تیسرے میں وکالت کے میدان میں بالکل نووارد تھا۔ ۱۹۵۵ء میں جیل سے رہا ہونے کے
بعد لاء کالج میں داخلہ لیا تھا۔ ۱۹۵۷ء میں وہاں سے قانون کی ڈگری تو لے لی تھی لیکن ہمہ وقتی سیاست
میں گم ہو گیا تھا۔ اکتوبر ۱۹۵۸ء میں مارشل لاء نے سیاست کی مشغولیت غصب کر دی اور میں جیل چلا گیا

مارچ ۱۹۵۹ء میں رہا ہو کر پھر وکالت کی طرف رجوع کیا تھا۔ گویا نومبر ۱۹۶۰ء تک بھی ڈیڑھ پونے دو سال وکالت سے واسطہ رہا تھا۔ اس دوران بھی ایک مہینہ قلعہ بند رہا تھا اس کے برعکس جن پر مقدمہ کرنا چاہتا تھا وہ ایوب شاہی کے چوکیدار تھے اور شاہی قلعہ کا بندی خانہ ایوب شاہی کا اہم برج تھا اس لئے ضروری تھا کہ اتنی بڑی بات کا آغاز ایک بڑے منہ سے ہو۔ کیچڑ میں دھنسی ہوئی گاڑی کو دھکا دینے کی بات تھی۔ ایک دفعہ گاڑی چل پڑے تو ممکن ہے اس کو دھکیلنا آسان ہو۔

قصوری صاحب نے عدالت کی طرف بھاگنے کی بجائے ایک صحیح وکالتی وطیرہ اختیار کیا اور لوگوں کی طرف رجوع کیا جن کی تحویل میں حسن ناصر تھے ان کی فہرست میں نے ان کو دے دی۔ سب سے پہلے انھوں نے شہزادہ حبیب احمد ایس پی کو ٹیلی فون کیا۔ انہی ایس پی نے میاں صاحب کو بتایا کہ حسن ناصر کا واسطہ کراچی سے تھا اس لئے اس کے پاس ان کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں تھی۔ مسٹر قصوری نے مجھے بتایا کہ حبیب احمد نے یہ بھی بتایا تھا کہ وہ اس کا بندوبست کرے گا کہ افواہیں پھیلانے والوں کے خلاف ضروری کارروائی کی جائے۔ اس بات سے میری تسلی نہ ہوئی۔ میں نے اپنے طور پر سید اعجاز حسین ڈپٹی سنٹرل انٹیلی جنس آفیسر (ڈپٹی آفیسر مرکزی محکمہ خفیہ اطلاعات) کو ٹیلی فون کیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس نے قلعہ تقریباً انہی تاریخوں کے لگ بھگ چھوڑ دیا تھا جب مجھے رہا کیا گیا تھا (یعنی ۲۲ اکتوبر) اس لئے وہ قلعہ کے بارے میں تازہ ترین اطلاعات دینے سے قاصر تھا اس نے وعدہ کیا کہ شہزادہ حبیب احمد سے مشورہ کرکے تقریباً ایک گھنٹے کے بعد مجھے ضروری اطلاع دے سکے گا۔ ایک گھنٹے کے بعد میں نے پھر ٹیلی فون کیا تو اس نے بتایا کہ ایس پی نے اسے بتایا ہے کہ وہ کراچی سے رابطہ پیدا کر رہا ہے اور اگلے دن صبح اس بارے میں کچھ کہہ سکے گا۔ میں نے تجویز کیا کہ میں اس کے دفتر میں پہنچ کر اس سے اس معاملے میں بات چیت کروں لیکن اس نے میری حوصلہ افزائی نہ کی اور بات کو اگلے دن صبح تک ملتوی کرنے پر اصرار کیا۔ اس طرح ایک اور قیمتی دن گزر گیا۔ اپنی بے چارگی پر اب بھی مجھے بہت غصہ تھا۔ طبیعت میں ہیجان کے طوفان اٹھتے تھے اور سسک کر بیٹھ جاتے تھے۔ میرا بھائی ظالموں کے پنجے میں تھا اور میں دن پر دن ضائع کر رہا تھا لیکن ہائی کورٹ جانے سے پہلے انتظامیہ سے تسلی کر لینا ضروری تھا۔ بہرحال قصوری صاحب کا بھی عندیہ معلوم ہوتا تھا قانونی معاملات میں انکی رائے کو میری رائے پر فوقیت تھی۔ اتنا ہوا تھا کہ حسن ناصر کے سیاہ خلیئے میں ایک چھوٹا سا روزن کھل گیا تھا جس سے توقع تھی کہ اس پر مزید تشدد رک جائیگا۔

۲۲ر نومبر ۱۹۶۰ء

۲۲ر نومبر کی صبح تھی۔ میں نے براہ راست ایس پی حبیب احمد کو ٹیلی فون کیا۔ اس نے کہا کہ چوں کہ حسن ناصر کراچی سے متعلق تھا اس لئے وہ اس معاملہ میں کسی قسم کی اطلاع دینے سے قاصر ہے۔ ساتھ ہی کہا کہ دو چار دن میں وہ مجھے اس بارے میں مطلع کر سکے گا۔ میں دوبارہ قصوری صاحب کے پاس گیا اور ان سے ہائی کورٹ میں ہیبئس کارپس کی درخواست دائر کرنے کے لئے کہا۔ چنانچہ اسی وقت درخواست ٹائپ کرا کر ہائی کورٹ میں دائر کر دی گئی قصوری صاحب اس کو دستی چیف جسٹس ایم آر کیانی مرحوم کے پاس لے گئے اور انھوں نے اس پر فوراً حکم جاری کر دیا۔

چنانچہ ہائی کورٹ کے ایک سپرنٹنڈنٹ کو لے کر میں سول سیکریٹریٹ پہنچا۔ میرا دل بلیوں اچھل رہا تھا ہنسنے کو بھی جی چاہتا تھا اور رونے کو بھی۔ ہنسنے کو اس لئے کہ بہر حال معاملہ پر جو پراسرار اور خطرناک پردہ پڑا ہوا تھا وہ اٹھ گیا ہے۔ اب اگر پولیس والے مجھے بھی دھر لیں گے تو قانون کی گاڑی خواہی نہ خواہی چلتی رہے گی۔ دل ڈوب اس لئے رہا تھا کہ فیض اور عطا سے میری جو بات چیت ہوئی تھی اور جس کا میں نے عدالت میں یا عدالت کے باہر کسی سے ذکر نہیں کیا تھا وہ بڑی ڈرا دینے والی بات تھی۔ کہیں تریاق آنے سے پہلے ہی سانپ کے کاٹے کا کام تمام نہ ہو گیا ہو۔ سیکریٹریٹ میں پہنچے تو ہمیں امور داخلہ کے ڈپٹی سکریٹری کے پاس بھیج دیا گیا۔ ان صاحب کو ہم نے ہائی کورٹ کا حکم دیا۔ انھوں نے کسی قسم کے ردعمل کا اظہار نہ کیا آرام سے اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ وہاں غالباً کسی کو ٹیلی فون کیا یا مشورہ کیا اور واپس آ کر ہائی کورٹ کے حکم کا دوسطری جواب لکھ دیا کہ سی آئی ڈی نے اطلاع دی ہے کہ حسن ناصر کو کراچی میں ۱۸ر اگست ۱۹۶۰ء کو قانون تحفظ پاکستان کے تحت ایک سال کے لئے نظر بند کر دیا گیا تھا۔ اطلاع کے مطابق اس نے ۱۳ر نومبر کو خودکشی کر لی۔

مجھ پر منوں پانی پڑ گیا۔ اسی دن صبح ہی سے میرے ذہن میں امریکہ کا روزنبرگ جوڑا ایتھل اور اس کا میاں جولئیس آ رہے تھے جن کو ان کے سیاسی عقیدے کی بنا پر پھانسی کی سزا ملی تھی۔ بظاہر مقدمہ یہ تھا کہ انھوں نے امریکہ کے ایٹمی راز چرا کر سوویت یونین کو دیئے تھے۔ جیل میں تھا تو مجھے ان کے خطوط پڑھنے کو ملے تھے جن کو ایک کتابی شکل دے دی گئی ہے۔ میں ان کی انسانیت سے محبت، حق پرستی اور خود اعتمادی کا

بڑا قایل ہوں۔ فیض نے جیل میں ان کے بارے میں ایک نظم بھی لکھی ہے جس کا عنوان ہے "ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے" نظم کا یہ بند زبان زدِ عام ہے "تیرے کوچے سے چن کر ہمارے علم ـــ اور نکلیں گے عشاق کے قافلے جن کی راہ طلب سے ہمارے قدم ـ مختصر کر چلے درد کے فاصلے۔

میرا دھیان بار بار ان کی طرف جاتا تھا کہ کس طرح امریکہ کا اٹارنی جنرل آخری وقت تک پھانسی گھر میں حاضر رہا کہ شاید ان میں سے کسی ایک کا پاؤں لڑکھڑا جائے، ایمان ڈگمگا جائے اور وہ جان بخشی کے پروانے پر دستخط کر سکے۔ لیکن یہ دونوں میاں بیوی اپنے بچوں کی یادیں اپنے سینوں کے ساتھ بھینچ کر "امن، روٹی اور گلاب" کا ورد کرتے ہوئے مرنے کے لئے بجلی کی کرسیوں پر جا بیٹھے تھے اور اس طرح امریکی سامراج کے ہاتھوں برباد ہونے والے لاکھوں بدنصیب انسانوں کا ایک عظیم نشان بن گئے اور اپنے جسم گنوا کر امریکی سامراج کی روح کی درندگی کو اجاگر کر گئے۔ میں کبھی حسن ناصر کو پنجاب پولیس کے چھوٹے موٹے تھانیداروں میں گھرا ہوا دیکھ رہا تھا کہ کس طرح یہ انگریز کے سدھائے ہوئے لوگ حسن ناصر کو ایک خوبصورت اور توانا شکار سمجھ کر اس کے جسم کو اذیت دے رہے ہوں گے۔ اس کی عزت نفس کو پاش پاش کرنے کے لئے کیسی کیسی ذلیل حرکتیں کر رہے ہوں گے۔ اس کا اعتماد جیتنے کے لئے منافقت کے کیسے کیسے پھندے لگا رہے ہوں گے اور وہ اسٹنٹ فلموں کے ہیرو کی طرح ان گھامڑوں کے چابکدستی کے ساتھ لتے لے رہا ہوگا لیکن جب اس رپورٹ کی طرف دھیان جاتا تھا کہ وہ کہتا ہے "مجھے معلوم ہے لیکن بتاؤں گا نہیں" تو پولیس کے کولہو کی اذیتیں اور تھانیداری ذہن کی سنگدلی اور انسانیت سے محرومی آنکھوں میں آ جاتی تھی اور میرے جسم میں جھرجھری آ جاتی تھی۔ اس پر بھی میری غیب کی آنکھ نے حسن ناصر کو دل برداشتہ نہ پایا۔ "امن روٹی اور گلاب" پر اس کے ایمان کو متزلزل نہ دیکھا آخری فتح پر اس کے یقین کو کمزور نہ دیکھا جس آدمی نے اپنی زندگی کے بہترین سال اس مخلوق کے اقتدار کے لئے وقف کر دیئے تھے جو کارخانوں، کھیتوں، گلیوں اور بازاروں میں رات دن محنت شاقہ میں پس رہی ہے۔ چیتھڑوں میں ملبوس ہے۔ گندی اور تاریک بستیوں میں پل رہی ہے وہ اپنی ذات پر کیسے اعتماد کھو سکتا ہے چنانچہ جب ڈپٹی سکریٹری نے کہا کہ حسن ناصر نے خودکشی کر لی ہے تو میں پھڑک اٹھا اور کڑک کر کہا بالکل بکواس ہے۔ حرامزادوں نے پھانسی پہلے دی ہے اور اب بعد میں بدنام کر رہے ہیں۔ اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور پھر اپنی فائلوں کی طرف متوجہ ہو گیا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ میرے اندر کا شعلہ بھی بھڑک کر فوراً ہی ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ اور اب مایوسی کی خنکی میں میرے گھٹنے کانپ رہے تھے۔

سچی کہانیاں۔۲

ڈاکٹر ایوب مرزا

ہم کہ ٹھہرے اجنبی

(فیض احمد فیض کی شخصیت اور ان کی نجی زندگی کی روداد ان کے ایک مداح ڈاکٹر ایوب مرزا کی کتاب "ہم کہ ٹھہرے اجنبی" سے ایک اقتباس) ادارہ

لاہور جو بارشوں سے نڈھال ہو چکا تھا اگست کے آخری دنوں میں مائل بہ صحت ہو رہا تھا لوگوں کے گھر اور گورنر ہاؤس نے ٹپکنا بند کر دیا تھا۔ اضافی بستیوں والوں کو بارش کے ریلے نے یوں پستیوں سے شاہراہوں کی بلندیوں پر پٹک رہا تھا جیسے کوئی عتاب نایاب لعل کو بچوں میں رلو چے اور چٹانوں کی بلندیوں پر پھینک دے۔ ان زیریں آباد، برباد لوگوں کی جنھیں عرفِ عام میں انسان اور عرفِ خاص میں عوام کہتے ہیں ساری پونجی، بستر، بوریا، ہنڈیا، کھٹیا اور ڈھور ڈنگر کو سیلاب کا غضب ناک تھپیڑا بہالے گیا۔ ان کا سارا اثاثہ جو کسی سرمایہ دار کے گھر کے ایک گیٹ کی قیمت سے بھی کم تر تھا۔ بالآخر پنجاب اور سندھ کے دریاؤں میں آب کے رقصِ دیوانگی کے ساتھ، بربادی کے ساز پر چیختا، پانیوں کے ہولناک طغیانی دیو صفت اٹھتی ہوئی، پھیلتی اور بڑھتی ہوئی، موت کی پیام بر لہروں کی آب و تاب میں گرتا، پڑتا، بھلا تا ریزہ ریزہ ہو کر بحرۂ عرب کے وسیع قلب میں ابدی نیند سو گیا۔ اور یہ زیریں آباد، برباد عوام جو اب سڑک اور شاہراہ نشین ہوئے یا جنھیں قسمت نے اس حال میں اسکول میں پناہ گزین کا داخلہ دے دیا، اپنی مختصر ترین آسائشوں کا حساب بے باق کر کے ایک آس لئے آسمان کی جانب ٹکٹکی لگائے بیٹھے تھے اور آسمان کسی بے رحم پروہت کی طرح ان پر مزید بارانِ رحمت کی بوچھاڑ کر رہا تھا۔ شاید ان لاچار افلاس زدہ اور بھوکے ننگے ڈھانچوں کو اس لئے غسل دے رہا تھا کہ ان کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کیا چاہتی ہے تاکہ یہ آخری غسل ان کی روح کو "نجس" ڈھانچوں سے بہا کر سوئے آسمان لے جائے کیونکہ عیسیٰ کی طرح یہ بھی ظلم سہنے کے آخری امتحان میں پاس ہو چکے ہیں۔

میں اس قسم کے خیالات کے بھنور میں اُلجھا ہوا اگست کی اُس صبح فیض صاحب کے ماڈل ٹاؤن

کے گھر کو روانہ ہوا۔ فیض، چیف منسٹر صادق حسین قریشی کے بنگلے پر ایک میٹنگ میں کچھ کی نظمیں سنوانے[1] جارہے تھے۔ پنڈی سے پیرزادہ، ملک جعفر اور ڈاکٹر اجمل[2] بھی آئے ہوئے تھے۔ انھیں قریشی صاحب کے بنگلے پر چھوڑ کر میں واپس شعیب ہاشمی، حمیرا ہاشمی اور منیزہ ہاشمی کے یہاں چلا آیا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں اور چھیمی فیض صاحب کے گھر آگئے۔

چھیمی کافی بنا کر لائی اور ہم فیض کے کمرے میں بیٹھ گئے۔ بس چھیمی اور میں بقیہ سب لوگ اپنے اپنے دھندے سے لگ گئے۔ میں نے پوچھا آپ ابو کو کب سے جانتی ہیں؟ چھیمی بولی ابو پنڈی میں فوجی افسر تھے۔ میں دو سوا دو سال کی ہوں گی۔ ہمارے بنگلے کے در کے باہر ایک بڑھیا بھکارن بیٹھا کرتی تھی۔ مجھے ٹھیک یاد نہیں، غالباً بھکارن ہی ہوگی کیونکہ اس کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے۔ اور وہ بہت میلی کچیلی تھی۔ وہ زمین پر بیٹھی ہوتی تھی۔ اس کا ایک لڑکا تھا۔ شکل تو اس کی اب یاد نہیں مگر میں اسے گھور گھور کر دیکھا کرتی تھی۔ بس دونوں ماں اور بیٹا تھے۔ وہ لڑکا کمال مہارت کے ساتھ لکڑی کی بیساکھی کی مدد سے ہر راہ گیر کے پیچھے اُچھلتا ہوا بھاگتا تھا۔ میں اسے غور سے دیکھا کرتی تھی اس کی ایک ٹانگ نہیں تھی، غالباً کٹ گئی تھی۔ مجھے وہ بہت ہوشیار لگتا۔ ایک روز میں نے دو لکڑیاں لیں اور بغلوں میں داب کر اپنی ایک ٹانگ کو اوپر اُٹھا کر اس لڑکے کی نقل اُتارتے ہوئے بنگلے کے لان پر چلنے کی کوشش کی۔ ابو نے دیکھ لیا پوچھا کیا ہوا؟ میں نے کہا کچھ نہیں۔ کہنے لگے پھر لنگڑا کیوں رہی ہو؟ اور یہ لکڑیاں؟ میں نے سارا ماجرا سنایا۔ ابو بہت خفا ہوئے۔ پھر انھوں نے مجھے پہلا لیکچر دیا کہ غریب لوگوں کی مدد کرنی چاہیئے، ان کا مذاق اُڑانا انسانیت سے گری ہوئی بات ہوتی ہے کسی کی معذوری اور مجبوری سے لطف اندوز ہونا اپنی کمینگی کی دلیل ہے۔ وغیرہ وغیرہ ــــ میں بہت شرمندہ ہوئی، پانی پانی ہوگئی۔ مجبوری کیا ہوتی ہے، معذوری کیا ہوتی ہے اور انسانیت کس چڑیا کا نام ہے، ان باتوں کا مجھے اس وقت ادراک نہیں تھا۔ مگر اس کے بعد میں نے اس لڑکے اور اس کی ماں کو اپنی ٹافیوں، بسکٹوں اور سیبوں کا حصہ دار بنا لیا۔

---

1. سابق وفاقی وزیر تعلیم، حال وفاقی وزیر مالیات
2. سابق وفاقی وزیر امور اقلیت و سیاحت 3. سکریٹری وفاقی وزارت تعلیم

دسمبر کے مہینے میں پیدا ہونے والی سلیمہ فیض کے دل میں اس واقعہ کے بعد محبت کی گرمی پیدا ہونا شروع ہو گئی تھی۔ کہنے لگی میں آہستہ آہستہ تقریباً ہنسا کی دہلیز تک پہنچ گئی تھی۔ ابو تو کسی کو کچھ کہتے ہی نہ تھے۔ میں نے ان کے منہ سے کبھی کرخت الفاظ نہیں سنے۔ ہر وقت ہر نوعیت کی بات سننے کو ہمہ تن گوش اور ایثار اور ہمدردی کا عصا لئے ملازموں سے لے کر ہم تک، سب کی مشکل کشائی کے لئے تیار۔ ممی؟ ویل ممی کی بات جدا ہے۔ وہ جو ہوتا ہے نا کہ کوئی بات سلیقے سے باہر نہ ہو، وہ ممی تھیں اور ہیں۔ اور اگر معاملہ سلیقے سے باہر ہوا تو پھر ممی آپے سے باہر۔ میں دیکھتی تھی کہ ہمارے گھر میں ایک عجیب CONTRAST ہے۔ دونوں کو تو COMPARE کر ہی نہیں سکتے۔ ابو کے اندر بہت خوبصورت اور کومل، نرمی، محبت اور ٹھہراؤ۔ ممی کے پاس سلیقہ، سلیقہ دار پیار اور گھن گرج۔ مجھے ابو کی کی نسبت ممی اچھی لگتی تھیں۔ بچپن میں۔ کیوں؟ شاید اس لئے کہ میں خود INTROSPECTIVE ہوتی جا رہی تھی۔ ہر وقت گھر میں رہتی تھی۔ میری بہت ہی کم سہیلیاں تھیں۔ ابو گھر میں اکیلے ہوں تو ایسا لگتا تھا کہ میں گھر میں اکیلی ہوں۔ اس کا صرف ایک فائدہ تھا کہ کھانا ہاتھ سے کھا سکتی تھی۔ ممی کے ہوتے یہ ناممکن تھا۔ ایک روز ممی اسپتال چلی گئیں۔ بیمار ہوں گی۔ مجھے ابو کے پاس گھر چھوڑ گئیں۔ میں نے سوچا نہ جانے ممی کب آئیں اور ابو ہونے ہوئے نہ ہوئے۔ میں ممی کے ساتھ جانا چاہتی تھی۔ اپنا دیسی نسخہ استعمال کیا اور رونا شروع کر دیا۔ ابو نے ایک مرتبہ پوچھا کیوں رو رہی ہو؟ اور میں بغیر جواب دیئے روتی رہی۔ سوچا سمجھ جائیں گے کہ اس کی ماں اسپتال چلی گئی ہے۔ مگر کہاں۔ بار بار یہی کہہ رہے ہیں کہ بھئی وجہ تو ہو گی کچھ رونے کی۔ اور میرے آنسوؤں کا ذخیرہ اور رونے کا کوٹہ ختم ہونے کو تھا کہ بولے بھوک لگی ہے ٹھہرو میں ابھی بازار سے تمہارے لئے نہایت عمدہ مزے دار بسکٹ لاتا ہوں۔ اِس پر میں خاموش ہو گئی چلو یہی سہی۔ تھوڑی دیر کے بعد ابو بسکٹ کا ڈبہ لے آئے۔ خوش ہو گئی۔ اب جو بسکٹ کھایا تو اس قدر بدمزہ اور گلے میں پھنسنے والا۔ انتہائی بدمزہ (HORRIBLE) بسکٹ تھے۔ میں نے بسکٹوں کی بدمزگی پر رونا شروع کر دیا۔ اور ابو کہے جا رہے ہیں، ہاں بھئی بسکٹ کھاؤ۔ اور ہاں ٹھہرو ابھی تمہارے لئے دودھ بھی لاتا ہوں۔ دودھ کے ساتھ یہ اور مزہ دیں گے۔ میرے رونے کی رفتار تیز ہو گئی اور وہ تیزی کے ساتھ باورچی خانے میں دودھ لینے چلے گئے۔ دوسرے دن ممی واپس آ گئیں۔ مجھے دودھ سے چڑ تھی اور ابو دودھ پلانے کے رسیا۔ برسوں بعد پتہ چلا کہ ان کا خاندان تو اصل جاٹ خاندان ہے۔

تو ماں میں کہہ رہی تھی کہ مجھے دودھ پینے سے چڑ ہے اور ابّو مجھے جبراً دودھ پلایا کرتے تھے ایک دن میں نے کہا کہ ابّو سر میں درد ہے۔ ابّو بولے تو پھر گرم دودھ کا ایک گلاس پی لو۔ یہ سنتے ہی مجھے واقعی سر میں درد اٹھا۔ میں نے کہا ابّو آج اگر دودھ نہ پیوں تو؟ کہنے لگے نہ پیو۔ میں کھیل میں مشغول ہو گئی۔ آواز آئی سر کا درد اب کیسا ہے؟ اس کے بعد ہمارا دودھ پینا بند۔

چیمی کی دودھ سے چڑ اور فوجی افسر فیض کے گھر دودھ کی فراوانی کا ذکر سن کر میرا دھیان اُن ماؤں کی طرف چلا گیا جن کی چھاتیاں خشک ہو جائیں اور بلبلاتے ہوئے لاغر اور نڈھال بچوں کو شیر نہ پلا سکیں۔ ان کی جیب اتنی ہلکی ہو کہ گوالے کے دودھ کا بوجھ برداشت نہ کر سکیں تو پھر انھیں نجات کا راستہ ڈھونڈنا ہی پڑتا ہے۔ اس راستے کے جھوٹے مبلّغ، راہبر، مجاور اور محافظ ان کی قسمت کے اندھے پتھر بن کر انھیں منزل سے دور رکھنے کی سعی مسدود کے فاسقانہ شغل میں نادان اداکاروں کی طرح اپنے فن کی پختگی پر رقصاں ہیں۔ وہ اپنے مقسوم سے بے خبر اپنی وقتی کامیابی پر شاداں و فرحاں ہیں کامیابی جو درحقیقت ان کی اصلی شکست کا پیش خیمہ ہے۔ ان ماؤں کی سوکھی ہوئی پژمردہ چھاتیوں میں نہرِ شیر کیسے رواں ہو اور نڈھال بلبلاتے ہوئے لاغر بچوں کے جسم کی توانائی، ان کی آنکھوں کی رونق، گالوں کی لالی اور بچپن کا معصوم انھیں کون واپس دے گا۔ ان کی نجات کے رہبر، مبلّغ، مجاور اور محافظ اندھی طاقتوں سے شیر و شکر ہیں، جنھوں نے ماؤں کی چھاتیوں کا شیر خشک کیا ہے، جنھوں نے معصوم بچوں کو معصومیت کے حسن سے محروم کیا ہے۔ ان راہبروں کے ہاتھ میں، ان مبلّغوں، مجاوروں اور محافظوں کے ہاتھ میں کوئی تیشہ نہیں۔ ان کے دراز ہاتھوں میں پرمٹوں کی بھیک کا کشکول ہے۔ ایک ہاتھ میں پرمٹ اور دوسرے ہاتھ میں نجات مانگنے والوں کے خلاف فتوے۔ لیکن ان کی قسمت کے تاریک فلک پر سچا نجم، ایک روز تابندہ خورشید بن کر طلوع ہوگا اور ان بچوں کی آنکھوں کو نور بخشے گا۔ ان کا حسن لوٹا دے گا اور ماؤں کی چھاتیوں میں ممتا سے لبریز محبت سے اُبلتا ہوا دودھ، بھوک سے بلبلاتے ہوئے بچوں کو پکارے گا۔ آؤ ننھے فرشتو آؤ! ماں کی محبت اور ممتا جی بھر کر پیو۔

اور چیمی کہہ رہی تھی ابو سے مجھے SOLACE ملتا تھا۔ وہ ہمارے پیار، محبت اور سکون کی ایک بہت بڑی اور گہری کمیں گاہ تھے۔ یہ استقامت کا، صبر کا اور غم خواری اور ہمدردی کا بحرالکاہل ہیں۔ میں نے انھیں کبھی کسی پر چیں بہ چیں ہوتے ہوئے نہیں دیکھا۔ کسی پر بہت زیادہ خفا ہوں تو کہہ

دیتے ہیں وہ پاجی ہے۔ اور دوستوں سے کوئی کوتاہی ہو جائے تو کہتے ہیں بھئی دوستوں کی خوبیوں سے تو آپ لطف اندوز ہوتے ہیں، وہ بے چارے اپنی خرابیاں کہاں بیچنے جائیں۔

مجھے روزانہ اسکول جانا بالکل پسند نہیں تھا اور ممی کو میری یہ بات بالکل پسند نہیں تھی۔ ابو اس معاملے میں میرے بہت بڑے ہمدرد تھے۔ کہا ابو! سر میں درد ہے آج اسکول نہیں جاؤں! کہتے تھے مت جاؤ، وہاں رکھا ہی کیا ہے؟ میں حساب میں خاصی نالائق تھی، حساب مجھے بالکل نہیں آتا تھا۔ ایک دن ابو نے پوچھا پڑھائی کیسی چل رہی ہے؟ میں نے صاف صاف بتا دیا کہ مجھے حساب بالکل نہیں آتا۔ بولے مجھے بھی نہیں آتا تھا۔ میں نے تو بعد میں حساب گزر اوقات کے لئے سیکھ لیا۔ مگر انھیں آج تک نہ آیا۔ شاید اسی لئے وہ حسابِ دوستاں میں ہمیشہ مار کھاتے رہے ہیں۔

پھر میں آٹھ سال کی ہو گئی اور ابو فوج سے "پاکستان ٹائمز" میں آ گئے۔ اِس دور میں ان سے بہت کم ملاقات ہوتی تھی۔ وہ ہر وقت اخبار چلاتے تھے اور ممی گھر چلاتی تھیں۔ ہم لوگ اس وقت میٹرو ہوٹل (لاہور) کے اوپر والے فلیٹ میں منتقل ہو گئے تھے۔ فرق یہ تھا کہ فلیٹ، فلیٹ ہوتا ہے اور بنگلہ، بنگلہ ـــــ بنگلے کے سامنے بہت بڑا لان تھا اور فلیٹ کی بالکونی کے سامنے لاہور کی سڑکیں۔ میں نے اسی فلیٹ کی بالکونی سے وہ جلوس دیکھا تھا جب ماسٹر تارا سنگھ پنجاب اسمبلی سے نکل کر جلوس بن گیا تھا۔ یاد نہیں وہ الفاظ GIRD UP YOUR LOIN KHALSA

میزو اور میں کوئن میری میں پڑھتے تھے۔ کوئن میری لڑکیوں کا ایچی سن سمجھ لیں۔ ہمارے مزے تھے ابو اخبار میں غرق تھے اور ممی گھر کو سجانے اور ہمیں نفاست زدہ ڈسپلن سکھانے میں مست۔ ہمارا گھر سہیلیوں کے گھروں سے چھوٹا اور مختصر ہونے کے باوجود صاف ستھرا اور سجا ہوا ہوتا تھا۔ اس میں ایک قرینہ تھا اور آپ اس قرینے کے ہر کونے میں ممی کی کارفرمائی دیکھ سکتے تھے۔ الغرض گھر کا ہر فرد مستِ مئے دلداریِ روز و شب تھا۔

پھر ایک شب پولیس والے آ گئے۔ ابھی صبح کاذب تھی۔ ابو میرے کمرے میں آئے مجھے پیار کیا اور زندگی میں پہلی مرتبہ میرے گالوں کو تھپکتے ہوئے ابو نے کہا: خدا حافظ۔ میں نے انھیں جاتے ہوئے دیکھا اور پھر سو گئی۔ میزو بہت چھوٹی تھی۔ مجھے خود کچھ خبر نہیں تھی کہ کیا ہو گیا ہے۔ پھر ممی نے احساس دلایا کہ ابو بہت دنوں کے لئے چلے گئے ہیں، گھبرانا نہیں اور اگر لوگ ان کے بارے میں باتیں کریں تو

اُن پر کان نہ دھرنا۔

چھیمی کی گفتگو سے مجھے وہ زمانہ یاد آگیا تھا جب فیض کی دہلیز میں' دارورسن' کی منزل نے پڑاؤ ڈال لیا تھا۔ ان کے صحن میں صلیب بلند ہونا شروع ہوگئی تھی اور ان کے گھر کے دریچوں کو اس اندھیری صبح کی سیاہی نے بھینچا ہوا تھا۔ طلوعِ سحر کے ساتھ ہی لیاقت علی خاں کے دورِ حکومت میں ملک کے اندر پہلی سازش ہوچکی تھی۔ اعلان ہوا کہ فیض اور دیگر فوجی اور غیر فوجی حضرات کو ملک کا تختہ اُلٹنے کی سازش میں گرفتار کرلیا گیا اور اس طرح ملک کو بچا لیا گیا ہے۔ یہی سازش بعد میں' راول پنڈی سازش کیس' کہلائی اور اس کی کارروائی خفیہ رکھی گئی۔ جہاں حکومت مدعی بھی تھی اور منصف بھی چنانچہ سزا ہوگئی۔

چھیمی نے مجھے بتایا کہ چند دنوں کے بعد وہ کوئن میری سے کینارڈ ہائی اسکول میں منتقل ہوگئی۔ کیونکہ یہ اسکول سستا تھا۔

میں نے پوچھا جب ابو جیل میں تھے تو آپ لوگوں کی گزراوقات کا کیا بندوبست تھا؟

اس نے کہا کہ ممی نے نوکری کرلی تھی اور ہمیں پیسے کی کمی کا کبھی احساس ہوا ہی نہیں۔ اول تو ابو پیسہ بچانے کے قائل ہی نہیں ہیں، لہٰذا ہمارے پاس غالباً کوئی رقم جمع نہ تھی۔ مجھے معلوم نہیں، یہ میرا اندازہ ہے مگر ممی نے اخراجات کو سنبھال لیا تھا۔ لیکن جس بات کا مجھے شدید احساس اب تک ہے وہ یہ ہے کہ ابو کے جیل چلے جانے کے بعد ہمارے گھر میں کوئی نہیں آتا تھا۔ جہاں شب و روز ایک تانتا لگا رہتا تھا وہاں سناٹا ہوگیا۔ سناٹا بُری چیز ہے، مجھے اس سے وحشت ہوتی تھی مگر میں ممی کو نہیں بتاتی تھی۔ کوشش کرتی تھی کہ ممی کے سامنے خوش رہوں۔ ہاں رشتہ داروں میں سے صرف پھوپھی باجی ملنے آئی۔ اور میرا دل خوشی سے پھول گیا۔ اور لوگ تو کہتے تھے فیض نے بہت بُرا کیا اور اس کے ساتھ نرمی برتنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ انھیں پھانسی ہو جائے تو بھی کم ہے۔ میں اب سمجھتی ہوں کہ انسان کے دلوں کو اور ان میں خفتہ محبتوں کو کبھی کبھی پھانسی کیوں ہو جاتی ہے۔

ہمیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ ابو کو کہاں لے گئے ہیں۔ صرف افواہیں ہم تک صبح کے اخبار کی طرح پہنچا دی جاتی تھیں۔ "فیض کے دائیں ہاتھ کی پانچوں انگلیاں کاٹ دی گئی"۔ "ان کا ہاتھ کاٹ دیا گیا ان کی ٹانگوں کی ہڈیاں توڑ دی گئی ہیں"۔ "ان کے جسم پر ضربوں اور زخموں کے نشان ہیں"۔ "ان کی

آنکھوں کو کھرچ کر نکال دیا گیا ہے۔" میں خاموشی سے یہ سب سنتی تھی اور آنسو پی جاتی تھی۔ مجھے صلیب پر لٹکے ہوئے عیسیٰ کے زخمی جسم پر گڑھی ہوئی میخیں رات کو سونے نہیں دیتی تھیں۔ دعا مانگتی تھی کاش ایک بار ابو کو دیکھ لوں۔ اور ممی یہ افواہیں سن کر مغلظات کی بوچھاڑ شروع کر دیتی تھیں BASTARD CONSPIRATORS مجھے تلقین کرتی تھیں کہ جو ہو سو ہو تم لوگ ہمت نہیں ہارنا، تمہارے ابو آجائیں گے۔ ہمیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ ابو کو کہاں لے گئے ہیں۔ ان کی کوئی خبر کوئی اتا پتا ہمیں نہیں تھا۔

ایک دن میری ایک کلاس فیلو نازلی نے مجھے اپنے گھر اپنی برتھ ڈے پارٹی پر بلایا۔ ممی نے کہا ہاں ہاں ضرور جاؤ۔ اتنے دنوں کے بعد یہ پہلی دوستانہ دعوت تھی۔ ہم لوگوں نے بھوکوں کی طرح اسے جھپٹ کر دبوچ لیا۔ ممی نے مجھے بہت اچھے کپڑے پہنائے اور میں نازلی کے گھر برتھ ڈے پارٹی میں چلی گئی۔ وہاں پہنچی تو مجھے ایک ڈرائنگ روم میں لے جایا گیا۔ وہاں دعوت کا کوئی سامان نہ تھا۔ چھ مرد میز کے گرد بیٹھے ہوئے تھے اور مجھے ان کے سامنے کھڑا کر دیا گیا۔ میں سمجھ گئی دال میں کچھ کالا کالا ہے۔ انھوں نے باری باری سوالات پوچھنے شروع کر دیئے۔ میں نے تہیہ کر لیا کہ ان کی کسی بات کا جواب نہیں دوں گی۔ جو یہ جاننا چاہیں گے وہ ہرگز نہیں بتاؤں گی چاہے مر جاؤں۔ میں نے کہا چھپی تمہیں کیا معلوم تھا جو ان سے چھپانا چاہتی تھیں۔ کہنے لگی کچھ بھی نہیں۔ انھوں نے پوچھا تم فیض کی بیٹی ہو؟ میں نے سر اونچا کر کے کہا ہاں۔ پھر انھوں نے پوچھا فیض جیل میں ہے؟ میں نے کہا ہاں۔ پھر کہنے لگے تمہیں ان کی کوئی خبر آتی ہے؟ میں نے کہا ہاں۔ چٹھی آتی ہے؟ میں نے کہا ہاں۔ دراصل وہ جاننا چاہتے تھے کہ فیض وغیرہ کے باہر LINKS قایم ہو چکے ہیں یا نہیں۔ ہمیں ابو وغیرہ کی اس وقت بالکل خبر نہیں تھی مگر ان حرام زادوں کے سامنے میں اپنی شکست قبول کرنے کو ہرگز تیار نہیں تھی۔ دو تین گھنٹے کی INTERROGATION کے بعد مجھے چھوڑ دیا گیا اور میں گھر آکر پہلی مرتبہ ممی کے گلے لگ کر زار و قطار روئی۔ نازلی زہریلی ناگن کی طرح زندگی کی دشمن بن کر میرے قرطاسِ ذہن پر پھیل گئی۔ وہ چھ مرد مجھے بزدل، کمینے، اوچھے، رذیل اور ننگِ مردانگی نظر آئے۔ ممی نے مجھے بہت دلاسہ دیا۔ خود بھی روئیں اور حسبِ دستور مغلظات کی گردان شروع کر دی۔ ان لوگوں کو تم جانتی ہو؟ نہیں، میں نہیں جانتی۔ میں جاننا بھی نہیں چاہتی۔ ممی، ابو جانتے ہیں۔ میں تو یہ جانتی ہوں کہ

میری پہلی دعوت یوں ختم ہوئی۔ ہاں نازلی نے ایک دو ہفتوں کے بعد پھر گھر دعوت پر بلایا۔ ظاہر ہے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مجھے اب واقعی نازلی سے خوف آنے لگا تھا۔ وہ لڑکی سے ڈائن بن چکی تھی۔ میں نے اسکول میں اس واقعہ کا کسی سے ذکر نہیں کیا۔ جب اسکول ٹیچر بلیک بورڈ پر کچھ لکھتی تھیں تو مجھے وہاں ابو کی تصویر نظر آتی تھی۔ ابو کو یوں کلاس میں دیکھ کر میرے اندر ایک بے پایاں صبر، حوصلہ اور جرأت پیدا ہونا شروع ہو گئی تھی۔ پھر میں چھ آدمیوں کی شبیہہ اور کلاس میں بیٹھی ہوئی نازلی کی صورت دیکھ کر بے ساختہ مسکرا دیتی تھی۔ مجھے محسوس ہونے لگا کہ یہ لوگ کمینے تو ہیں ہی کمزور بھی ہیں۔ یہ لوگ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکے میرے ابو کو کیا گزند پہنچا سکتے ہیں۔ بہرحال ان خیالات میں غلطاں و پیچاں میری زندگی نہ جانے کن اَن دیکھے طوفانوں میں گھر چکی تھی جس کا مجھے نہ تو صحیح اندازہ تھا نہ ہوش۔

ایک روز ہماری اردو ٹیچر مسز شجاع نے حاضری لیتے وقت جب میرا نام سلیمہ فیض پکارا تو رک گئیں کہنے لگیں تم فیض احمد فیض مشہور شاعر کی کچھ لگتی تو نہیں ہو؟ میں نے کھڑے ہو کر کہا کہ فیض میرے والد ہیں۔ ساری کلاس نے میری طرف دیکھا سوائے نازلی کے جو بلیک بورڈ کی سیاہی سے اپنی نظروں کو مستفید کر رہی تھی۔ اس ٹیچر نے ابو کے بہت سے شعر سنائے۔ میں شعر سن رہی تھی اور خوش ہو رہی تھی۔ میرا دل نہ جانے کیوں ابو کے پیار کے گہرے سمندر میں ہچکیاں لیتا ہوا ڈوب گیا۔ پھر یکایک اس ٹیچر نے ابو کو گالیاں دینی شروع کر دیں۔ میں سمجھ نہ سکی۔ شاید اسے یاد آ گیا کہ ابو جیل میں ہیں اور حکومت ان کے خلاف ہے۔ یہ ملازم پیشہ لوگوں کا ازلی المیہ ہے جیسی وہ تو TERRIFIC BORE ثابت ہوئی۔ لیکن خیر اس کے بعد مسز ڈار اردو پڑھانے آگئی۔ بہت ہمدرد اور محبت والی استانی تھی۔ اس نے مجھے الگ بلا کر کہا تم فکر نہ کرو۔ کوئی مسئلہ ہو تو مجھے بتاؤ۔ تمہارے ابو بہت بڑے شاعر ہیں۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ میں عجب گومگو میں تھی۔ کیا یہ سچ کہہ رہی ہے؟ کیا میں اس کی بات مان لوں یا یہ دوسری 'برتھ ڈے پارٹی' کا اہتمام ہو رہا ہے۔ لیکن میں غلط ثابت ہوئی۔ کئی برسوں تک وہ ہمارے گھر آتی رہی۔ اپنی استطاعت کے مطابق وہ میرے لئے کچھ نہ کچھ ضرور ساتھ لاتی تھی۔ مجھے اس کی موجودگی میں بہت ذہنی سکون ملتا تھا۔

میں نے پوچھا ابو سے جیل میں پہلی ملاقات؟ ہمیں کچھ خبر نہ تھی کہ ابو کہاں ہیں۔ افواہیں حوصلہ شکن، مایوس کن ہونے کے علاوہ دل دہلا دینے والی بھی تھیں۔ ایک روز جب میں اسکول سے آئی تو

دیکھا ممی خلاف معمول خوش، ہشاش بشاش، اتنی سویٹ باتیں کر رہی تھیں کہ بس۔ پھر کہنے لگیں "تمہارے ابّو زندہ ہیں"۔ ابّو زندہ ہیں! یہ سن کر میں ان کی زندگی کے نشے سے چکرا گئی۔ کہاں ہیں؟ کہنے لگیں لائل پور جیل میں۔ مجھے احساس ہوا کہ ہم نے پہلا معرکہ مار لیا ہے۔ لیکن ان کی کٹی ہوئی انگلیاں ٹوٹے ہوئے بازو اور ٹانگیں، ان کی آنکھوں کے خالی خانوں کی افواہیں ذہن میں گھوم گئیں۔ میں ہنستے ہنستے روتے روتے یکایک خاموش ہو گئی۔ ممی نے بتایا کہ کل ہم انھیں ملنے لائل پور چلیں گے۔

لائل پور جیل خانے پہنچے تو ہمیں ایک تنگ کمرے میں بٹھا دیا گیا۔ اسے ملاقاتی کمرہ کہتے تھے۔ میرے خیال میں اس سے خوب صورت اور پودوں کے گل دستوں سے سجا ہوا کمرہ دنیا بھر میں کہیں نہیں ہوگا۔ اس کمرے میں ایک ننھی منی کھڑکی تھی۔ میرا منہ کھڑکی کی جانب تھا۔ ممی دوسری طرف بیٹھی تھیں کھڑکی کی زنگ آلود بوسیدہ سلاخوں کے بیچ سے مجھے جیل خانے کا صحن نما حصہ نظر آ رہا تھا۔ ہم دونوں خاموش بیٹھے تھے۔ انتظار کے یہ لمحے بہت گراں تھے، بہت بھاری تھے۔ میں آج بھی جب وہ وقت یاد کرتی ہوں تو میرا ذہن گم ہو جاتا ہے۔ میرے شانے بوجھل ہو جاتے ہیں۔ بات کرنے کی تاب نہ تھی یہ بھی سوچ نہ سکتی تھی کہ ابّو سے بات کیا کروں گی۔ میں نے اپنی زمین پر گڑھی ہوئی نظریں اوپر اٹھائیں نگاہیں بلند کیں اور سلاخوں کے بیچ سے جیل کا صحن دیکھنے لگی۔ کیا دیکھتی ہوں کہ ایک کونے سے دور ایک آدمی پتلون قمیض پہنے سر سے ننگا چلا آ رہا ہے۔ میں اسے غور سے دیکھ رہی تھی۔ وہ شخص دور تھا۔ چلتے ہوئے اس کے پاؤں یوں پڑ رہے تھے جیسے کوئی نشے میں ہو۔ اس نے کالی عینک پہنی ہوئی تھی۔ وہ قریب آتا گیا اور میرا گمان یقین میں بدلنا شروع ہو گیا۔ یہ ابّو ہیں! پھر میں بے ساختہ چیخ اٹھی ابّو! ممی نے دلاسہ دیا ہاں ہاں ابّو آئیں گے۔ میں نے ممی کو جھنجھوڑا۔ ممی ابو آ رہے ہیں۔ ممی انھیں دیکھ نہ سکتی تھیں۔ وہ اٹھ کر کھڑکی تک بھی نہ آئیں وہ نہ ہنسیں نہ روئیں۔ بس چپ ہو گئیں۔ پھر پوچھنے لگیں کیسے ہیں؟ میں نے کہا وہ ٹھیک نظر آ رہے ہیں۔ پھر میں نے کومنٹری شروع کر دی۔ ان کے ہاتھ سلامت ہیں، ان کی ٹانگیں سالم ہیں مگر...... ممی نے کہا مگر کیا؟ میں نے کہا وہ لڑکھڑاتے آ رہے ہیں۔ کہنے لگیں وہ تو ہمیشہ لڑکھڑاتے رہے ہیں۔ میں نے اپنی افسردگی کو اپنی محبت کے زور سے بھگا دیا تھا مگر اس وقت افسردہ صورت بنائے ممی کو بتایا کہ انھوں نے کالی عینک پہن رکھی ہے۔ یہ کیوں پہنی ہے پھر ان کی آنکھیں نکالے جانے کی افواہ کا خیال آیا اور میں چپ ہو گئی۔ ممی بھی چپ ہو گئیں۔ میرے

دل کو کالی عینکوں نے، کالی افواہوں کے سیاہ بادلوں کے گمبیر سیاہ سایوں نے گھیر لیا تھا. چند لمحوں بعد ابو کمرے میں داخل ہوئے. ایک ہاتھ سے عینک اتاری اور ہیلو ڈارلنگ کہہ کے ممی سے گلے ملے. پھر مجھے گلے لگایا اور پیار کیا. میں ان کی آنکھیں دیکھ رہی تھی. بالکل ٹھیک ان آنکھوں میں پہلے سے زیادہ چمک تھی، زیادہ گہرائی تھی. میں خاموش بیٹھ گئی اور میری پلکوں پر دل کا لہو محبت کا روپ دھار کر آنسوؤں کی لڑی بن کر جھڑی بن گیا تھا. ہم بہت گلے ملے بہت پیار کیا اور چلتے وقت ابو سے پوچھا یہ آپ نے کیا کیا ہے؟ بولے بکواس کرتے ہیں کچھ بھی نہیں کیا جلد آ جائیں گے سب جھوٹ اور فراڈ ہے. ابو جو سچ بولنے کے عادی ہیں مجھے محسوس ہوا کہ سچ کی آخری فتح پر مکمل ایمان رکھتے ہیں. کہنے لگے ایسی باتوں سے گھبرانا نہیں. سب ٹھیک ہو جائے گا اور ہم ابو کو پیار کر کے ایک نئے تجربے اور نئے ولولے کو سمیٹے گھر لوٹ آئے.

ایک دن میں باجی آمنہ کے ہاں گئی ہوئی تھی. باجی آمنہ میری بھی باجی ہیں ممی کی بھی ابو کی بھی اور سارے ملک کی باجی ہیں. ان کی ذات میں سب کو سکون ملتا ہے. اس دن ابو کے مقدمے کا فیصلہ سنایا جا چکا تھا. انھیں لمبی سزا سنائی جا چکی تھی. اخباروں نے ضمیمے نکالے تھے میں نے باجی آمنہ کے گھر پڑھا. مجھے بہت دکھ ہوا.

میں گھر لوٹ آئی. ممی ابھی نہیں آئی تھیں. شام کو جب ممی آئیں تو بہت پریشان نظر آ رہی تھیں. کہنے لگیں تم سے بات کرنی ہے. میں نے کہا مجھے پتہ ہے. میں نے بتایا کہ میں نے ضمیمہ پڑھ لیا ہے پھر ممی نے لیکچر دینا شروع کر دیا کہ اب ہمیں ایک لمبے عرصے کے لئے پلان کرنا ہے. فکر کی کوئی بات نہیں، بس کمر کس لو. میں خاموش تھی مگر تو میں نے عرصہ ہوا کس لی تھی. میں کوشش کرتی تھی کہ ممی کو کسی قسم کی تکلیف نہ دوں. سیاسی سوجھ بوجھ تو نہ تھی مگر اس مقدمے کی سدھ بدھ سمجھ میں آ چکی تھی میں نے اسی روز تہیہ کر لیا کہ بقیہ زندگی ابو کی حق و باطل کی جنگوں میں ابو کی طرف دار رہوں گی اور میں اس وقت چھٹی جماعت میں تھی.

ان چکروں میں میری پڑھائی خراب ہو چکی تھی. میں ایک عزم میں بلند ہو رہی تھی تو دوسری طرف پڑھائی کی پستیوں کو چھونے لگی تھی. پھر خیال آیا کہ تعلیم اچھی چیز ہے پڑھنا چاہیئے. مگر بدبخت حساب تو اوپر بگڑ چکا تھا اور اردو بھی نہ ہونے کے برابر تھی. ممی سے میں نے اپنی مجبوری بیان کی. دا

دفتر سے ایک نظام صاحب کو لے آئیں۔ بار یش تھے اور انھیں میں نے ابّو کے حلقۂ احباب میں کبھی نہ دیکھا تھا۔ انھوں نے نہایت شفقت کے ساتھ مجھے حساب اور اردو میں تیز کیا۔ میں انھیں بہت پسند کرتی تھی اور عالم تنہائی میں جب ہمارے سائے بھی غائب ہو چکے تھے نظام صاحب فرشتۂ رحمت تھے ایک اور صاحب حنیف تھے وہ بھی آنا شروع ہوئے۔ یہ بھی غیر سیاسی آدمی تھے۔ وہ بھی ہم لوگوں پر بہت مہربان تھے۔ ہم لوگ نئے سرے سے ان کے ساتھ پکنک وغیرہ پر جانے لگے۔ وہ عید پر بھی ہمارے گھر آتے تھے۔ میں انھیں نہیں بھول سکتی۔ ان کا احسان ان تمام لاف زنوں اور فیض کے پروانوں سے عظیم تر ہے جنہیں اب بھی ان کے گرد دیکھتی ہوں۔

اور ہاں، بخاری صاحب صرف ایک مرتبہ آئے اور ہمیں ۔۔ ۵ روپے دیئے۔ اس کے بعد وہ کبھی نہیں آئے۔ کاش وہ ۔۔ ۵ روپے کی جگہ ہمارے گھر ۔۔ ۵ مرتبہ آتے۔ کیونکہ ہم ان سے بہت محبت کرتے تھے۔ اس زمانے میں ایک خاص بات یہ تھی کہ لوگ یعنی عام لوگ ہمیں کچھ نہیں کہتے تھے۔ جانتے تو سبھی تھے مگر کبھی ان سے ہماری دل شکنی یا دل آزاری نہیں ہوئی۔ سبزی والا، دودھ والا، بیکری والا، رکشہ والا سب جانتے تھے کہ ہمارے ابّو پر سازش کیس چل رہا ہے۔ میں تو کہوں گی کہ ان کا رویہ کچھ ہمدردانہ ہی تھا۔ کبھی کبھی پوچھ لیتے تھے۔ ابّو سے ملی ہو، کیسے ہیں؟ اللہ انھیں تم سے جلد ملا دے گا گھبراؤ نہیں، خدا پر بھروسہ رکھو۔ وغیرہ وغیرہ ـــــ ان غریب لوگوں کے منہ سے نکلے ہوئے یہ مختصر جملے میرے کانوں میں رس گھول دیتے تھے۔ ان کی SENSE بڑی گہری ہوتی ہے۔ یہ بڑے محبتی لوگ ہوتے ہیں۔

ایک مرتبہ ہم حیدرآباد جیل میں ابّو سے ملنے گئے۔ ممی ایسے موقعوں پر ہم دونوں بہنوں کو خوب DRESS UP کر کے لے جاتی تھیں۔ ابّو ٹھیک ٹھاک تھے۔ بولے چھیمی تمہارے لئے کیا بھیجوں؟ اب میں حیران تھی۔ جیل خانہ سے سوائے خود گھر آنے کے اور کیا بھیج سکتے ہیں۔ کہنے لگے ہاں گلبنی تمہارا برتھ ڈے آرہا ہے نا۔ وہ تحفہ تو ضروری ہے نا۔ بہتر ہے تم اپنی مرضی کا تحفہ بتاؤ؟ میں نے کہا ایک فراک بھیج دیں۔ اور پھر عین برتھ ڈے والے دن ایک نہایت خوب صورت جوڑے کا پارسل ملا۔ یہ ابّو کی طرف (حیدرآباد جیل) سے تھا۔

ایک دن میں اسکول سے گھر آرہی تھی۔ بس میں تھی۔ نہ جانے اِس روز ابّو بے حساب یاد آئے

تھے۔ دل بار بار کہتا تھا آج ابّو لوٹ آئیں گے۔ بس گھر کے قریب پہنچی تو میں نے دیکھا کہ عبداللہ ملک، حمید اختر والا CROWD جارہا ہے۔ میں سمجھ گئی ضرور ابّو واپس آگئے ہیں۔ گھر میں داخل ہوئی تو ابّو موجود۔ گلے ملے۔ میں تو خوشی کے مارے پاگل ہوگئی اور وہ کہہ رہے تھے لو بھئی اب ہم لوٹ آئے ہیں نا۔ یہ مرحلہ بھی طے ہوا۔ بس اب چپ کرو۔ اب ہم آگئے ہیں۔ اب نہیں جائیں گے۔ پھر وہ پاکستان ٹائمز میں لوٹ گئے اور اسی میں غرق رہنے لگے۔

ممی کو شکایت رہتی تھی کہ میں ٹھیک سے پڑھتی نہیں۔ ابّو کچھ نہیں کہتے تھے۔ ایک دن ابّو کہنے لگے بھئی میٹرک میں فرسٹ ڈویژن لاؤ تو جانیں، ہم تو نہ لا سکے تھے اور اگر تم لے آؤ تو سونے کی گھڑی انعام۔ اب دو مسئلے تھے ایک تو سونے کی گھڑی اور دوسرے ابّو کی بات کا پاس میں نے دل میں کہا ہو جائے۔ اور میں اپنے اسکول میں فرسٹ آگئی۔ ابّو شام کو گھر آئے تو میں نے انھیں بتایا۔ کہنے لگے میں اخبار چلاتا ہوں، مجھے پتہ ہے یہ لو سونے کی گھڑی، تم جیتیں۔

پھر ابّو دوبارہ جیل چلے گئے اور پھر یہ دستور بن گیا اور ہمارے لئے بھی ایک معمول ہوگیا۔ ایّوب کے دور میں جب یہ گرفتار ہوئے ہیں تو ماسکو سے لوٹے ہی تھے۔ ایک روز پہلے میری سالگرہ بڑی دھوم سے منائی گئی۔ دوسری صبح پولیس والے آگئے۔ ممی دفتر میں تھیں۔ ابّو کو میں نے بتایا کہ وہ آگئے ہیں۔ آہا آگئے۔ تم ممی کو فون کرکے بلوا لو۔ ممی کے آنے سے پہلے ابّو پولیس افسر کو لیکچر دے رہے تھے کہ بھئی وہ جب آئیں گی نا تو تمہیں بہت گالیاں دیں گی تم MIND نہ کرنا۔ پھر ممی آئیں۔ اللہ دے اور بندہ لے۔

ہم اس طرز کی زندگی کے کچھ عادی سے ہوگئے تھے۔ اب جیل آنے جانے نے معمول اختیار کر لیا تھا۔ اس لئے وہ پہلی سی بات نہیں تھی۔ ایک روز ابّو اور ممی بند کمرے میں کھسر پھسر کر رہے تھے تھوڑی دیر بعد ابّو میرے پاس آئے اور کہنے لگے بھئی چھیمی یہ کچھ رقم ہم دونوں نے پس انداز کی ہے بس یہی ہے۔ یہ تم لے لو۔ میں نے کہا ابّو میں کیا کروں گی؟ کہنے لگے اس رقم سے یا تو تم شادی کر لو بھئی وہ بھی کرنا ہی ہے نا، یا پھر مزید تعلیم حاصل کر لو CHOICE تمہارا اپنا ہے۔ میں نے کہا نہ، پڑھوں گی۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ میں ایسے لڑکے سے ہرگز شادی نہیں کروں گی جو رقم کا طالب گار ہو جہیز چاہتا ہو اور دولت کا پرستار ہو۔ لعنت بھیجو ایسے لوگوں پر اور اپنی شادی پر

مگر میں وہ سین نہیں بھولتی۔ ممی اور ابو کی محنت کی کمائی یوں میری شادی پر برباد ہوجائے۔ مجھے یہ صریحاً ظلم لگا۔ میں نے مزید پڑھنا شروع کر دیا۔

مجھے احساس ہے کہ ابو بڑے شاعر ہیں۔ میں نے ان کی شاعری کو پڑھا ہے مگر میں کوئی رائے قایم نہیں کر سکتی۔ میں انھیں جتنا پڑھتی ہوں مجھے ان میں ایک ہی موضوع نظر آتا ہے۔ وہ سیاست ہے شاید میں BIASED ہوں۔ مجھے وہ واقعات یاد آجاتے ہیں جن کے بوجھل اثرات سے ان کے نازک دل سے پھوڑے پھوٹتے رہے ہیں اور وہ واقعات بیشتر سیاسی ہی تھے۔ مجھے انکی عظمت کا احساس نہیں ہے شاید اس لئے کہ ان کی عظمت آہستہ آہستہ ہم پر اثر انداز ہو چکی ہے۔ اس لئے اُدھر دھیان نہیں جاتا۔ وہ ایک بہت اچھے باپ اور دوست ہیں۔ میں نے آخر میں چھیمی سے کہا بس آخری بات۔ چھیمی جو نہایت انہماک اور توجہ سے میری آخری بات سن رہی تھی بولی جی۔ میں نے کہا آپ نے فیض سے کیا سیکھا ہے؟ چھیمی مجھے بڑے غور سے گھور رہی تھی یکایک اس کی آنکھیں سامنے میز پر رکھی ہوئی فیض کی مسکراتی ہوئی تصویر پر رک گئیں۔ وہ بالکل خاموش تھی اس کی آنکھیں نمدار تھیں۔ چھیمی کے لب اور زبان کے وقفہ کا لمحہ میرے اندر انتظار کا عجب اضطراری احساس پیدا کر رہا تھا۔ لب اور زبان کا وقفہ ختم ہوا اور چھیمی نے اپنے حلق میں اٹکا ہوا احساسِ محبت نگلا۔ نمدار آنکھوں کی پلکیں جھپک کر اس کو خشک کرنے کی کوشش کی۔ غالباً ان آنکھوں میں اس کی VISION پھیل چکی تھی۔ میں اس کو سامنے بیٹھا نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ دور ابو کی ساری زندگی کو محیط کر رہی تھی بولی PASSION! میں نے کہا جی؟ چھیمی بولی جی PASSION میں نے ابو سے PASSION سیکھا ہے اور پھر وہ اپنے نرم باریک لبوں کو بھینچ کر خاموش ہو گئی۔

PASSION؟ میں سوچ میں ڈوب گیا۔ کیا یہ وہ گیت ہے جو عیسیٰ کے سولی پر چڑھنے کے بعد گایا جاتا ہے یا وہ قوت ہے جو ایذا رسانی کا تریاق ہے یا وہ بحرِ محبت ہے جس کا کوئی کنارا نہیں یا اس دشتِ بے آب و گیاہ میں ایک واویلا ہے جسے گوشِ وقتِ حاضر سننے اور سمجھنے سے قاصر ہے۔

غلام عباس

دھنک

یہ بیسویں صدی کے اواخر کی ایک شب کا ماجرا ہے ہوٹل موہن جودارو کی اکیسویں منزل پر جو سب سے اونچی اور "باغیچہ آویزاں" کے نام سے موسوم ہے، ارباب حکومت کی جانب سے ایک پرتکلف ضیافت نیم شبی دی جا رہی تھی۔ مہمانوں میں دنیا بھر کے ملکوں کے سفیر، سائنس دان، مفکر اور صحافی شامل ہیں۔

ہوٹل کی چھت پر کھلے آسمان کے نیچے کمخواب کا ایک شامیانہ جس کے کناروں پر موتیوں کی خوش نما جھالر لگی ہے جڑاؤ استادوں پر نصب کیا گیا ہے۔ شامیانے کے نیچے رنگا رنگ قالینوں کا فرش بچھا ہے۔ یہ وہی قالین ہیں جو پٹ سن کے سنہرے ریشے سے بنائے جاتے ہیں اور اپنی نفیس بنت، پائیداری اور نقش ونگار کی دل آویزی کے باعث دنیا بھر میں شہرت رکھتے ہیں۔ ان قالینوں پر تھوڑے تھوڑے فصل سے کشادہ اور آرام دہ مخملی صوفے رکھے ہیں جن پر معزز مہمان اپنی بیگمات کے ساتھ متمکن ہیں۔

یہ مہمان جو پانچ براعظموں کے مختلف تمدنوں کی نمائندگی کرتے ہیں اپنا اپنا پروقار قومی لباس پہنے ہوئے ہیں۔ ان کے جدا جدا ناک نقشے، ان کی مخصوص حرکات و سکنات، ان کی الگ الگ بولیاں، ہر ملک کی عورت کا جداگانہ حسن، اس کی مختلف طرز آرایش و زیبایش، اس کے مخصوص کرشمہ و ادا دیکھنے والوں پر ایک محویت کا عالم طاری کر دیتے ہیں۔

ہر چند بظاہر کوئی ہنڈا، بلب، گیس یا ٹیوب لائٹ دکھائی نہیں دیتی پھر بھی سارا پنڈال بقعۂ نور بنا ہوا ہے۔ جا بجا فوارے چھوٹ رہے ہیں جن کی پھواروں پر رنگ برنگی شعاعیں پڑ رہی ہیں۔ "باغیچہ آویزاں" میں قسم قسم کے پیڑ پودے کثرت سے لگائے گئے ہیں، جن کے پھولوں کی ملی جلی خوشبو دلوں میں ایک نشاط کی کیفیت پیدا کر رہی ہے۔

مہمانوں کے وسط میں ایک اونچی گول میز ہے جو کار چوبی کے کام کے ایک بیش قیمت میز پوش سے مزین ہے۔ ایک خوب صورت ریڈیو سٹ رکھا ہے۔ اس سٹ کے اندر چاروں طرف اسپیکر اس ترکیب

ہ لگائے گئے ہیں کہ ہر شخص کو خواہ وہ کسی سمت بیٹھا ہو آواز صاف سنائی دے سکے۔

اس وقت ریڈیو سے آرکسٹرا کی موسیقی نشر ہو رہی ہے جس کی دھن اس تقریب کے لئے خاص طور پر باندھی گئی ہے۔ اور وہ تقریب کیا ہے؟ وہ یہ کہ آج رات پونے دو سے لے کر دو بجے کے درمیان کسی وقت پاکستان کا پہلا خلا پیما چاند پر اتر جائے گا اور اس کی اس بے نظیر کامیابی کا حال اور چاند پر اس کے مشاہدات براہ راست اسی کی زبان سے نشر کئے جائیں گے۔

گو دنیا کے بعض ممالک پچھلے کئی برس سے چاند پر پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مگر اس امر میں اوّلیت حاصل کرنا پاکستان کی قسمت میں لکھا تھا جب پاکستان نے تسخیر قمر کے سلسلے میں اپنے عزم کا اعلان کیا تو پہلے تو ان ملکوں کے سربراہوں کو یقین ہی نہیں آیا کہ پاکستان نے اس میدان میں اسقدر ترقی کر لی ہے۔ مگر جب ان کے سفیروں نے جو پاکستان میں مقیم تھے پاکستان کے اس ارادے کی تصدیق کر دی تو ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی اور انھوں نے اپنے اپنے یہاں کے سائنس دانوں اور دانش وروں کو اس تقریب کا حال بچشم خود دیکھنے کے لئے یہاں بھیج دیا۔

اس وقت رات کے ایک بج چکا ہے۔ مگر دنیا کے دور دراز حصوں سے آئے ہوئے ان مہمانوں میں سے کسی کے چہرے سے بھی تھکاوٹ یا کسل مندی کے آثار ظاہر نہیں ہوئے۔ اس کے برعکس جوں جوں وقت گزرتا جاتا ہے وہ پہلے سے بھی زیادہ چاق چوبند نظر آ رہے ہیں۔

ہوٹل کے خدام زرنگار وردیاں پہنے ہلکے پھلکے طعام اور مشروبات کے طشت اٹھائے مہمانوں کی تواضع میں مصروف ہیں۔ کچھ لوگ باہم گفتگو کر رہے ہیں۔ کچھ ریڈیو کی موسیقی سن رہے ہیں جس کا سلسلہ کبھی کبھی منقطع ہو جاتا ہے اور اناؤنسر آج رات کے پروگرام کی تفصیل یا کوئی مقرر چاند کی مہم کے سلسلے میں ابتدائی کامیابیوں کا حال سنانے لگتا ہے۔ کچھ مہمان جب بیٹھے بیٹھے اکتا جاتے ہیں تو شامیانے سے باہر نکل کر "باغیچہ آویزاں" کی پرفضا روشوں پر ٹہلنے یا گرد و نواح کا منظر دیکھنے لگتے ہیں۔ یوں تو شہر میں کئی عمارتیں ہوٹل موہن جوڈارو سے بھی اونچی اونچی ہیں، مگر مضافات اور سمندر کا جیسا دلفریب نظارہ "باغیچہ آویزاں" سے دکھائی دیتا ہے اور کہیں سے دکھائی نہیں دیتا خصوصاً رات کے وقت تو جہازوں اور جزیروں کے مکانوں کی روشنیاں دور سے جھلملاتی ہوئی بہت ہی بھلی معلوم ہوتی ہیں۔

اس وقت فروری کا چاند اپنی پوری تابندگی کے ساتھ روئے زمین پر خنک چاندنی بکھیر رہا ہے۔ اس کا نظارہ بجائے خود ایک عجیب جاذبیت رکھتا ہے۔ مہمانوں کی نظریں بار بار اس کی طرف اٹھ جاتی

ہیں اور وہ موجودہ تقریب کی مناسبت سے اور بھی محویت کے ساتھ اسے دیکھنے لگتے ہیں۔

آخر ڈیڑھ بجے کے قریب ریڈیو پر اعلان کیا گیا کہ سب مہمان اپنی اپنی نشستوں پر آکر بیٹھ جائیں اس وقت مہمانوں کے اشتیاق کی کیفیت دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ خصوصاً بعض خواتین پر تو اضطراب کی سی حالت طاری ہے جس پر قابو پانے کے لئے انھوں نے اپنی مٹھیاں بھینچ رکھی ہیں۔ دم بھر میں سب لوگ جو ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے اپنے اپنے صوفوں پر آکر بیٹھ گئے۔ سب نے کان ریڈیو کی آواز پر لگا دیئے۔ کچھ وقت اور انتظار میں گزرا۔ اس کے بعد اناؤنسر کی آواز یہ اعلان کرتی ہوئی سنائی دی:

"اب ہم اپنے سننے والوں کو چاند پر لئے چلتے ہیں جہاں اس وقت اجرام فلکی پر انسانی فتوحات میں ایک نیا اور انوکھا اضافہ ہونے کو ہے۔ لیجئے ہمارے خلا پیما جو اس مہم کو سر کر رہے ہیں آپ سے مخاطب ہوتے ہیں:"

اس اعلان کے ساتھ ہی ریڈیو سے ایسی گھڑگھڑاہٹ سنائی دینے لگی جیسی کسی دور دراز ملک کے اسٹیشن کو "پکڑتے" وقت سنائی دیا کرتی ہے۔ اس فضائی گڑبڑ کا سلسلہ چند لمحے جاری رہا۔ اس کے بعد ایک انسانی آواز اس شور میں سے ابھرنی شروع ہوئی۔ پہلے پہل الفاظ صاف سنائی نہ دیئے مگر رفتہ رفتہ واضح ہوتے گئے:

"میں کیپٹن آدم خاں سکنہ ضلع جھنگ عمر ۳۵ سال آپ سے مخاطب ہوں۔ میرا خلائی جہاز اس وقت چاند کی سطح سے صرف پانچ ہزار فیٹ کی بلندی پر رہ گیا ہے۔ جہاز کی رفتار پچھتر میل فی گھنٹہ کر دی گئی ہے۔ مجھ کو چاند کی سطح بہت صاف نظر آرہی ہے۔ یہ وہی سرزمین ہے جسے سائنس داں "طوفانوں کے سمندر" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ عجیب نظارہ ہے پر ہول بھی اور دلکش بھی۔ لیجئے اب بلندی صرف دو ہزار فیٹ رہ گئی ہے۔ جہاز کی رفتار چالیس میل فی گھنٹہ ہے۔ مجھے اس سفر میں بحمداللہ کسی قسم کا حادثہ پیش نہیں آیا۔ خدا نے چاہا تو میرا جہاز حسب توقع آہستگی کے ساتھ چاند پر اتر جائے گا...... اب میں ایک ہزار فیٹ سے بھی کم بلندی پر ہوں۔ جہاز کی رفتار بتدریج بہت کم کی جارہی ہے..... لیجئے اب میں صرف سات سو فیٹ چاند کی سطح سے بلند ہوں....... پانچ سو فیٹ....... رفتار دس میل فی گھنٹہ...... صرف اڑھائی سو فیٹ...... سو فیٹ...... الحمدللہ کہ میرا خلائی جہاز صحیح سلامت چاند کی سطح پر اتر گیا ہے...... اس وقت پاکستانی گھڑیوں کے مطابق رات کا ایک بج کر اڑتالیس منٹ اور چار سیکنڈ آئے ہیں۔ پاکستان زندہ باد۔"

جلسے کے تمام شرکانے جو دم سادھے بیٹھے تھے اور جن کے دل کی دھڑکن پل پل میں تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھی ایک ساتھ اطمینان کا لمبا سانس لیا۔ ریڈیو سے خلا پیما کی آواز آنی بند ہوگئی اور اس کے بجائے قومی ترانہ بجنا شروع ہوا۔ سب لوگ تعظیماً کھڑے ہوگئے۔ جب ترانہ ختم ہوا تو جلسے کا پنڈال تالیوں کے شور اور نعرہ ہائے تحسین و آفرین سے گونج اٹھا۔ غیر ملکی سفیر، سائنس داں اور اہل دانش اپنی نشستوں سے اٹھ اٹھ کر ارباب حکومت کے پاس جانے، ان سے مصافحہ کرنے اور انھیں مبارکباد دینے لگے۔ یہ سلسلہ کچھ دیر جاری رہا۔ اس کے بعد ریڈیو سے پھر پہلے کی طرح گھڑگھڑاہٹ سنائی دینے لگی۔ سب مہمان جلدی سے پھر اپنی اپنی جگہ آبیٹھے۔ اب کے کیپٹن آدم خاں کی آواز پہلے سے بھی زیادہ صاف سنائی دی:

"ابھی ابھی میں نے اپنا قومی پرچم "طوفانوں کے سمندر" کی سرزمین پر گاڑ دیا ہے۔ چاند کی سطح جمی ہوئی بھوبل کی طرح ہے، کہیں سخت کہیں نرم مگر اس میں پاؤں نہیں دھنستے۔ جا بجا دراڑیں اور گڑھے ہیں۔ کہیں کہیں یہ گڑھے بہت بڑے بڑے ہیں جیسے آتش فشاں پہاڑوں کے دہانے ہوں پرچم گاڑنے کے مقدس فریضے سے فارغ ہو کر میں نے سب سے پہلے اُس کے سائے میں اُس خدائے لم یزل کے حضور نماز شکرانہ ادا کی جس کے فضل و کرم سے آج ہمارے ملک نے اپنا صحیح مقام پا لیا ہے۔ اور اب وہ دنیا کے سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور طاقتور ممالک کی صف میں شامل ہوگیا ہے

پاکستان پائندہ باد!"

جلسے کا پنڈال ایک مرتبہ پھر نعرہ ہائے تحسین و آفریں سے گونج اٹھا۔ جب شور تھما تو خلا پیما کی آواز یہ کہتی ہوئی سنائی دی:

"آپ کو یہ تو معلوم ہی ہوگا کہ چاند میں دو ہفتے کا دن ہوتا ہے اور دو ہفتے کی رات۔ یہاں اس وقت دن ہے جس کو شروع ہوئے ہمارے حساب سے تقریباً چھتیس گھنٹے گزر چکے ہیں۔ میرے پاس اتنی آکسیجن موجود ہے کہ میں یہاں چاند کا پورا ایک دن بسر کر سکوں اور میرے خلائی جہاز میں اتنا ایندھن ہے کہ وہ مجھے بفضل خدا خیر و عافیت کے ساتھ وطن پہنچا سکے......

لیجئے اب میں آپ سے یہاں کے گرد و پیش کے حالات اور اپنے مشاہدات بیان کرتا ہوں"

۲

ابھی سپیدہ سحر نمودار نہیں ہوا تھا کہ کراچی سے سینکڑوں میل دور ایک قصبے کی چھوٹی سی مسجد میں ایک ملا صاحب نماز فجر کے بعد نمازیوں سے کہہ رہے تھے :

"ابھی ابھی میں نے اپنے ٹرانسسٹر پر یہ اعلان سنا ہے کہ پاکستان کا کوئی مردود شخص چاند پر پہنچ گیا ہے۔ خدا اُس کو غارت کرے۔

برادران اسلام! یہ صریح کفر ہے کہ جن اشیا پر مشیت ایزدی نے اسرار و رموز کے حجاب ڈال رکھے ہیں انھیں سائنس اور نام نہاد ترقی کے نام پر بے نقاب کیا جائے۔

بھائیو! ہم نے اپنی اس چھچھوری حرکت سے باری تعالیٰ کی جناب میں سخت گستاخی کی ہے۔ میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ عنقریب ہم پر خدائے قہار کا غضب نازل ہونے والا ہے۔۔۔۔"

گاؤں اور قصبوں ہی کے نہیں شہروں کے ملاّؤں میں بھی اس خبر سے ہلچل مچ گئی۔ چنانچہ ایک شہر کی درس گاہ میں ایک ملاّ صاحب جو در پردہ شعر و سخن کا بھی مذاق رکھتے تھے، یوں نکتہ سنج تھے :

"باری تعالیٰ نے انسان کو زمین پر خلیفہ بنا کر بھیجا اور یہ اختیار بخشا کہ جا وہاں جو جی میں آئے کرتا پھر۔ مگر انسان کا ناشکراپن اور اس کی ہوس ملک گیری دیکھو کہ اسے زمین کی لامحدود وسعتیں اپنے اعمال و افعال کے لئے تنگ معلوم ہوئیں۔ اور اس نے اپنے خالق ہی کے آستانۂ خاص، اس کی آماقِ مملکت پر ہی، جو چاند، سورج اور ستاروں پر محیط ہے، غاصبانہ قبضہ جمانے کی ٹھان لی ہے۔۔

اللہ اللہ! انسان کے جنون نخوت کا کچھ ٹھکانہ ہے کہ اس نے فرشتوں کو توصید زبوں قرار دے کر چھوڑ دیا اور خود یزداں ہی پر کمندیں پھینکنی شروع کر دیں۔ نعوذ باللہ من ذالک۔۔۔۔۔"

اور پھر اگلے جمعہ کو دارالسلطنت کی وسیع جامع مسجد میں جہاں ہزاروں مسلمان نماز کے لئے جمع ہوئے تھے شہر کے ایک شیوہ بیان خطیب للکار للکار کر اپنے خطبہ میں کہہ رہے تھے :

"مسلمانو! تمہاری درس گاہوں میں جو شیطانی علوم پڑھائے جا رہے ہیں، جانتے بھی ہو اُن کا لب لباب کیا ہے؟ اُن کا لب لباب یہ ہے کہ مادہ مثل ذات باری تعالیٰ ازلی ہے یا ذات باری تعالیٰ (نعوذ باللہ) خود مادی ہے۔ تم نے دیکھا ان علوم نے رفتہ رفتہ کیا گل کھلایا! میرا اشارہ تسخیر قمر کی طرف

ہے جس کی خبر تم نے ریڈیو پر سنی اور اخباروں میں پڑھی ہوگی۔ ہماری حکومت جو مغرب کی پیروی میں لادینیت کا شکار ہوگئی ہے اپنی اس کامیابی پر پھولی نہیں سماتی۔ حالاں کہ یہ سخت کافرانہ و ملحدانہ فعل ہے جس کا مرتکب شریعت کی رو سے واجب القتل ہے......

"مسلمانو آج ہر طرف فسق و فجور کا بازار گرم ہے۔ زمین فتنہ و فساد کی آماج گاہ بنی ہوئی ہے۔ بے دینی، بے غیرتی، بے حیائی، فحاشی، عیاشی اور کفر و الحاد کا دور دورہ ہے۔ اللہ کا کلمہ نیچا اور کفر کا بول بالا ہو رہا ہے۔ زناکاری، شراب خواری اور قمار بازی دھڑلے سے ہو رہی ہے۔ آلاتِ لہو و لعب اور ناچ گانے کا عام رواج ہو گیا ہے۔ عورت کی آنکھ سے حیا اور جسم سے لباس کی قید اٹھ گئی ہے۔ یہ ساری علامتیں قربِ قیامت کی ہیں......

"مسلمانو! وہ وقت جلد آنے والا ہے جب کلام اللہ دلوں، زبانوں اور کاغذوں سے اٹھا لیا جائے گا زمین جا بجا شق ہو جائے گی، سمندر اُبل پڑیں گے، پہاڑ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر تیز ہوا میں ریت کی طرح اُڑنے لگیں گے۔ گرد و غبار اور آندھیوں سے جہان تیرہ و تار ہو جائے گا۔ آسمان پھٹ جائے گا اور ستارے ٹوٹ ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جائیں گے......

"مسلمانو! جاؤ گاؤں گاؤں، قریہ قریہ، شہر شہر لوگوں کو خبردار کر دو کہ انسان من حیث القوم توبہ و استغفار کر لے کیونکہ قیامت آنے والی ہے......"

اور اس طرح ملاؤں نے اپنی لسانی اور زورِ خطابت سے عوام کو قربِ قیامت کا ایسا الیقین دلایا کہ ہر شخص ڈرا ڈرا، سہما سہما نظر آنے لگا۔ حکومت کے خلاف ہر طرف ایک بددلی سی پھیلنے لگی۔ ملاؤں کی تحریک روز بروز زور پکڑنے لگی۔ ملک بھر میں جگہ جگہ پہلے چھوٹے چھوٹے پھر بڑے بڑے جلوس نکلنے لگے۔ اسی طرح ان کے شرکا کی تعداد بھی جلد جلد بڑھنے لگی۔ جلد ہی دارالسلطنت میں ایک بھاری جلسہ منعقد کیا گیا جس میں حسبِ ذیل قرارداد منظور کی گئی:

"پاکستان کے عوام موجودہ نظامِ حکومت کو سخت کافرانہ اور فاسد اصولوں پر قائم تصور کرتے ہیں جس سے ہولناک نتائج نکلنے کا شدید خطرہ درپیش ہے۔ اس لئے وہ مطالبہ کرتے ہیں کہ اس نظام کو فوراً بدلا جائے اور اس کے بجائے ملک میں قانونِ خداوندی رائج کیا جائے۔"

اس قرارداد نے یک بیک اربابِ حکومت کو جیسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ جب تک ملاؤں کی تحریک تسخیرِ قمر کی مخالفت تک محدود رہی تھی، انھوں نے قابلِ اعتنا نہیں سمجھا تھا اور سچ یہ ہے کہ شروع شروع میں

ان کے پاس اس طرف دھیان دینے کے لئے وقت بھی نہ تھا۔ ان کی توجہ تو تمام تر اس خراج تحسین وصول کرنے میں لگی ہوئی تھی جو ساری دنیا اس محیر العقول کامیابی اور سائنس میں ان کی پیش روی پر انھیں ادا کر رہی تھی۔ اور پھر وہ یہ بھی جاننا چاہتے تھے کہ اس کا عالمی سیاست اور خصوصاً ہمسایہ ممالک پر کیا اثر پڑا ہے۔ وہ ظاہر میں کیا کہتے ہیں اور در پردہ ان کا ردعمل کیا ہے۔

چنانچہ ملاؤں کی اس تحریک پر عام طور پر خیال کیا گیا کہ ان لوگوں کا کیا ہے یہ تو سائنس کے ہر نئے انکشاف، ہر نئی اختراع کی شروع شروع میں ایسے ہی مخالفت کیا کرتے ہیں۔ مگر پھر رفتہ رفتہ خود بھی اس کو قبول کر لیتے اور اپنے تصرف میں لانے لگتے ہیں۔ چنانچہ آج بڑے بڑے خرقہ و عمامہ والے ملاؤں میں سے شاید ہی کسی کا گھر ٹیلی فون، ریڈیو یا ٹیلی ویژن سے خالی ہوگا۔ یا ان میں سے شاید ہی کوئی ایسا ہوگا جو دینی نشریات میں اپنے لئے وافر حصے کا طلب گار نہ ہو۔ یا جو کسی سرکاری یا قومی دورے کے سلسلے میں ہوائی جہاز کو نقل و حرکت کے دوسرے ذرائع پر ترجیح نہ دیتا ہو۔

اور تو اور آج مساجد تک میں لاؤڈ اسپیکر جسے یہ لوگ تلفظ کی سہولت کے لئے "آلہ مکبر الصوت" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اذان، خطبہ اور دینی تقریبات کی تشہیر کا ایک جزو لاینفک ہے۔ اس لئے عجب نہیں کہ چند ہی روز میں وہ تسخیر قمر کو بھی قبول کر لیں اور پھر کون کہہ سکتا ہے کہ آئندہ جب کبھی چاند میں سب سے پہلی مسجد کے افتتاح کا موقعہ آئے تو ہر ملا اس مقدس فریضے کے ادا کرنے کا خود کو دوسروں سے کہیں زیادہ اہل ظاہر نہ کرے گا۔

لیکن اب جو اس تحریک نے ایک نیا ہی رنگ اختیار کر لیا تو ارباب حکومت کو سخت تشویش ہوئی۔ اور انھوں نے اخبارات اور ریڈیو کے ذریعے حکومت کا موقف واضح کرنے کی کوشش کی۔ اسی سلسلے میں یک مفکر نے "سائنس اور اسلام" کے عنوان سے ریڈیو پر ایک زوردار تقریر بھی نشر کرائی جس میں مفکر نے کہا:

"ہمارے ملا صاحبان سائنس کو کفر و الحاد سے تعبیر کرتے ہیں اور اس کے درس و تدریس کو گناہ قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں جا بجا ارشاد فرمایا ہے کہ کائنات کو مسخر کرو، ہواؤں پر حکم چلاؤ، چاند اور سورج کی شعاعوں کو اپنی گرفت میں لاؤ، زمین کے سینے سے اس کے ان گنت خزانے نکالو، اور سمندر کی طوفانی موجوں کو تابع فرمان بناؤ...... تسخیر قمر ان ہی ارشادات خداوندی کی تعمیل کی ایک کوشش ہے......"

ایک پمفلٹ میں جس کا عنوان "بروجھی سے ایٹم بم تک" تھا، مضمون نگار نے موجودہ زمانے کے

تقاضوں پر یوں روشنی ڈالی:

"حضور سرورِ کائنات کے زمانے میں تیر اندازی، شمشیر زنی اور شہسواری کی مہارت مسلمانوں کے لئے ایک مقدس فریضہ کی حیثیت رکھتی تھی۔ کیونکہ اس سے دینِ حق کی حفاظت مقصود تھی۔ اگر آنحضرت صلعم موجودہ زمانے میں ہوتے اور دیکھتے کہ کس طرح باطل کی قوتیں چاروں طرف سے اسلام کو ختم کرنے میں لپیٹنا چاہتی ہیں تو وہ اُن سے نبرد آزما ہونے کے لئے ٹینک اور ہوائی جہاز تو کیا راکٹ میزائیل بلکہ ایٹم بم تک کے استعمال کو ہر مومن کے ایمان کا جزو قرار دیتے....."

مگر ملاؤں کی تحریک ایک اسقدر زور پکڑ چکی تھی کہ محض بیانات سے اس کا مداوی ہونا مشکل تھا۔

ادھر جب کیپٹن آدم خاں چاند کی مہم سر کرکے اپنے خلائی جہاز سمیت صحیح سلامت وطن واپس پہنچ گیا تو اس کی بڑی آؤ بھگت کی گئی اسے قومی ہیرو قرار دیا گیا۔ اس کا استقبال ایک فاتح کی حیثیت سے کیا گیا۔ اور اس کے فوجی مناصب میں جلد جلد ترقی دے کر اسے پہلے میجر اور پھر کرنیل بنا دیا گیا۔ علاوہ ازیں ملکی و غیر ملکی اخبارات میں اس کی ان گنت تصویریں اور انٹرویو چھاپے گئے۔ ایک تصویر جو خاص طور پر بڑی مقبول ہوئی اُس موقع کی تھی جب ایک غیر ملکی سفیر کی بیوی پاکستانی خلا پیما کی اس عدیم النظیر بہادری پر وفورِ جذبات سے مغلوب ہو کر اس کا منہ چوم رہی تھی۔ ہر چند کہ اس میں بڑا معصوم سا جذبہ کار فرما تھا مگر ملاؤں نے جو آدم خاں کو مردود اور گردن زدنی سمجھتے تھے اسے کچھ اور ہی معنی پہنا کے خوب خوب اُچھالا اور اسی سلسلے میں حزبِ اختلاف کے بعض اراکین سے ساز باز کرکے قومی اسمبلی میں ایک تحریک التوا بھی پیش کروا ڈالی۔

اس سے ملک میں اور بھی انتشار پھیل گیا۔ ملاؤں کے حوصلے پہلے سے بھی بڑھ گئے اور انھوں نے جلد ہی اپنا ایک ملک گیر کنونشن منعقد کر ڈالا جس میں متفقہ طور پر حکومت کے اربابِ حل و عقد سے مطالبہ کیا گیا۔ کہ چونکہ وہ کافر ہو چکے ہیں اور مملکت خدا داد پاکستان کی سربراہی کی اہلیت نہیں رکھتے، اس لئے ان کو فوراً مستعفی ہو جانا چاہیئے۔

جس عظیم الشان جلسے میں یہ قرار داد پیش کی گئی اس میں بڑی بڑی جوشیلی تقریریں سننے میں آئیں۔ ایک ملا صاحب حاضرین سے یوں خطاب کر رہے تھے:

"حیف صد حیف کہ اربابِ حکومت نے ہماری تنبیہ کو پرکاہ کے برابر بھی وقعت نہیں دی۔ لیکن دوستو اب تنبیہات کا وقت گزر چکا ہے اور وہ ساعت آ پہنچی ہے کہ ملک کی زمامِ کار ملحدوں اور

اپنے مذہب سے خواہ کتنے ہی بیگانہ کیوں نہ ہوں، مگر ایک مرتبہ جب ان کو یقین دلا دیا جائے کہ یہ ان کے دین کی حرمت کا سوال ہے تو یکبارگی ان کے مذہبی احساسات بیدار ہو جاتے ہیں اور وہ ایک جنون کی سی کیفیت میں دین کی خاطر جان تک دے دینے سے دریغ نہیں کرتے۔ یہی حال اس تحریک کا ہوا۔ عوام میں ہر طرف ناراضگی پھیل گئی۔ لیکن چونکہ جلسوں جلوسوں پر پابندی عاید تھی اور وہ برملا غم و غصے کا اظہار نہ کر سکتے تھے اس لئے وہ ایک ایک، دو دو کر کے مسجدوں میں پہنچنے لگے اور خود کو ملاؤں کی تحریک سے وابستہ کرنے لگے۔ رفتہ رفتہ تمام مسجدیں سیاسی کارروائیوں کا مرکز بن گئیں۔ دن رات رہنماؤں میں مشورے ہونے لگے۔ نمازیوں کو کھلم کھلا سرکشی پر آمادہ کیا جانے لگا۔ جب ملاؤں کو یقین ہو گیا کہ عوام پورے طور پر ہمارے ساتھ ہیں تو انھوں نے ایک خاص دن ان گرفتاریوں کے خلاف احتجاج کرنے کے لئے مقرر کر دیا۔ اعلان میں کہا گیا کہ اس روز سارے ملک میں ہڑتال کی جائے گی اور حکومت کی نافذ کردہ دفعہ ۱۴۴ (ایک سو چوالیس) کو توڑنے کے لئے شہر کی ہر مسجد سے نماز فجر کے بعد جتھے روانہ ہوں گے جن میں شرکا کی تعداد پانچ سے کسی صورت میں کم نہ ہو گی۔

یوم احتجاج کی صبح کو ابھی اندھیرا ہی تھا کہ حکومت نے شہر کی تمام چھوٹی بڑی مساجد کے باہر پولیس کی بھاری جمعیتیں متعین کر دیں۔ حسب اعلان نماز فجر کے بعد نمازیوں کے جتھے مسجدوں سے نکلنے شروع ہوئے۔ ہر شخص کو پھولوں کے ہار پہنائے گئے تھے اور ان کے کپڑوں پر عرق گلاب چھڑکا گیا تھا۔ پولیس نے ان لوگوں کو دھڑا دھڑ گرفتار کرنا شروع کر دیا۔ صرف ایک گھنٹے کے اندر ملک کے طول و عرض میں دس ہزار سے اوپر گرفتاریاں عمل میں آ چکی تھیں۔ پھر بھی ان جتھوں کے کم ہونے کے آثار نظر نہ آتے تھے۔ لوگ تھے کہ خود کو گرفتار کرانے کے شوق میں جوق در جوق چلے آتے تھے۔ شہروں سے، قصبوں سے، دیہات سے۔ بعض سروں پر کفن باندھے ہوئے تھے، بعض درود شریف پڑھتے چلے آتے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی جوالا مکھی پہاڑ پھٹ پڑا ہے جس سے انسانی لاوا بہتا چلا آ رہا ہے۔

یہ تو تھا دفعہ ۱۴۴ (ایک سو چوالیس) کے توڑنے والوں کا حال۔ اب ہڑتال کرانے والوں کا ماجرا سنئے: یہ لوگ جن میں بہت سا عنصر غنڈوں اور آوارہ گرد لڑکوں کا شامل ہو گیا تھا، صبح ہوتے ہی بازاروں اور گلی کوچوں میں چکر لگانے لگے۔ رضاکاروں نے گزشتہ رات ہی کو شہر کے ہر حصے میں لاؤڈ اسپیکروں کے ذریعے ہڑتال کا اعلان کر دیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے دکاندار فساد کے ڈر سے گھروں ہی سے نہ نکلے اور اگر کچھ لوگوں نے پولیس کے اصرار اور حفاظت کی یقین دہانی پر دکانیں کھولیں بھی تو ہڑتالیوں کے مشتعل گروہ

خدا کے باغیوں سے چھین لی جائے اور حکومت کی سربراہی مومنین اور صالحین کے ہاتھوں میں ہو۔ پس اے مسلمانو اٹھو۔ اس کافرانہ تہذیب کے علم برداروں سے عنان اقتدار چھین لو اور چار دانگ عالم میں دین الٰہی کا ڈنکا بجا دو.......

کیا تم جاننا چاہتے ہو کہ ہم کیسی حکومت چاہتے ہیں؟ آؤ میں تمہیں اس کی ایک جھلک دکھاؤں۔ اس حکومت میں کوئی فقیر نہیں ہوگا، لاوارث نہیں ہوگا، کیونکہ یہ حکومت خود اس کی مائی باپ ہوگی۔ زمین کا مالک اللہ اور صرف اللہ ہوگا۔ نہ مزارع ہوگا نہ زمین دار...... اگر ایسی بادشاہت چاہتے ہو تو مسلمانو! اس زور سے نعرۂ تکبیر لگاؤ کہ ایوان کفر کے در و بام متزلزل ہو جائیں۔"

اور واقعی حاضرین جلسہ نے اس زور سے نعرۂ تکبیر بلند کیا کہ دور دور تک راہ گیر چلتے چلتے تھم گئے اور گرد نیں اٹھا اٹھا کے دیکھنے لگے کہ یہ شور کیسا ہے۔

اس کے بعد ایک چھوٹے سے قد کے ملا جن کی تقریر کا موضوع "فی سبیل اللہ جہاد" تھا بڑے جوش سے اچھل اچھل کر کہنے لگے:

"ہم اللہ کے سپاہی ہیں۔ حکومت نے ہم کو سمجھا کیا ہے۔ وہ ہماری طاقت سے بے خبر ہے۔ اگر ہم نہ چاہیں تو نہ کہیں شادی بیاہ ہو، نہ میت کی تجہیز و تکفین عمل میں آئے۔ حکومت لاکھ اعلانات کرتی پھرے میں کہتا ہوں دوربینیں لگا لگا کر دیکھے، ہوائی جہازوں میں بادلوں سے اوپر پرواز کرے، ٹیلیفون کے ذریعے دوسرے شہروں سے شہادتیں فراہم کرائے مگر جب تک ہم اپنی ان گناہ گار آنکھوں سے ہلال کو نہ دیکھ لیں نہ عید کی خوشی ہو نہ محرم کا سوگ۔ حکومت اس باب میں ہار رہا ہم سے متصادم ہو کر ہماری طاقت کا اندازہ کر چکی ہے......"

جب یوں کھلم کھلا نعرہ بغاوت بلند ہونے لگے تو کون حکومت اسے ٹھنڈے پیٹوں گوارا کرے گی! چنانچہ ان تمام مقررین کو جنھوں نے اس جلسے میں اشتعال انگیز تقریریں کی تھیں، نقص امن کے خطرے کے تحت راتوں رات ان کے ٹھکانوں سے گرفتار کر لیا گیا اور ملک بھر میں دفعہ ۱۴۴ (ایک سو چوالیس) نافذ کر دی گئی جس کی رو سے لاٹھیوں، تلواروں، برچھی بھالوں اور دوسرے ہتھیاروں کو لیکر چلنا، اینٹ، پتھر تیزاب اور سوڈے کی بوتلوں کو دنگے فساد کی غرض سے جمع کرنا، پانچ یا زیادہ اشخاص کا اکٹھا ہونا ممنوع قرار دیا گیا۔

ان گرفتاریوں نے اور بھی آگ بھڑکا دی۔ حکومت کے اس فعل کو مداخلت فی الدین سمجھا گیا۔ لوگ

فوراً موقع پر پہنچ گئے۔ اور لوٹ مار کی دھمکی دے کر دکانوں کو بند کرا دیا۔ اگر کہیں پولیس نے مزاحمت کی تو اس پر اینٹیں اور پتھر برسائے گئے۔ پولیس نے پہلے زیادہ سختی اختیار نہ کی۔ جب اس کے سمجھانے بجھانے سے ہجوم منتشر نہ ہوتا تو وہ ہلکا سا لاٹھی چارج کر دیتی۔ لوگ ادھر ادھر بکھر جاتے۔ لیکن تھوڑی ہی دیر میں پھر آموجود ہوتے۔ رفتہ رفتہ دونوں طرف تندی اور درشتی پیدا ہونے لگی، حالات نازک صورت اختیار کرنے لگے۔

یہ ہڑتالی دکانیں ہی بند نہیں کرا رہے تھے بلکہ بسوں، ٹیکسیوں اور رکشاؤں کو روک بھی رہے تھے۔ ان ہنگاموں میں دو بسوں اور آٹھ رکشاؤں کو جلا دیا گیا۔ جن بسوں کے شیشے توڑے گئے ان کا تو کچھ حساب ہی نہ تھا۔

کچھ لوگوں نے سرکاری دفتروں اور غیر ملکی سفارت خانوں کا رخ کیا۔ اور انھیں آگ لگانے لگے۔ حکومت کے لئے یہ بڑا نازک وقت تھا۔ جب پولیس لاٹھی چارج اور آنسو گیس اس سیلاب کو نہ روک سکا تو اسے گولی چلانے کا حکم دیا گیا۔ اور جب صورت حال پولیس کے قابو سے باہر ہو گئی تو فوج بلوائی گئی۔ یہی واقعہ کئی شہروں میں پیش آیا۔ ہر جگہ کرفیو لگا دیا گیا، مگر فتنہ و فساد اور بلوؤں کا سلسلہ ختم نہ ہوا۔ شام ہوتے ہوتے تقریباً پچاس ہزار رضا کار گرفتار ہو چکے تھے اور سینکڑوں جانیں آتشیں اسلحہ کی نذر ہو گئی تھیں ......

۳

ملاؤں نے روئے زمین پر خدا کی بادشاہت کا جو تصور پیش کیا تھا وہ اب حقیقت بن چکا ہے۔

پہلی حکومت کے مستعفی ہونے کے بعد سب سے پہلے بالغ رائے دہندگان کے ووٹوں سے ایک امیر چنا گیا اور اسے دنیا پر خدا کے نائب کی حیثیت دی گئی۔ انتخاب کا مسئلہ بڑا ہنگامہ خیز ثابت ہوا تھا اور سارا ملک جیسے ایک بحران کی لپیٹ میں آ گیا تھا۔ مگر شکر ہے کہ بالآخر یہ مصیبت ٹل گئی۔ ہوا یہ کہ جب تک ملا صاحبان حکومت سے برسرپیکار رہے، ان میں اتحاد بھی رہا اور یک جہتی بھی۔ مگر جیسے ہی عام انتخاب منعقد کرنے کا اعلان ہوا ہر شخص حصول اقتدار کے لئے مضطرب ہو گیا۔

ملک بھر میں بہت سی جماعتیں الیکشن لڑنے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ہر جماعت نے اپنا اپنا لائحہ عمل، اپنے اپنے قواعد و ضوابط اور اپنی اپنی مخصوص وردی وضع کر لی اور پھر جتھے بنا بنا کر اپنے اپنے

امیر کے گن گاتی گلی گلی، کوچے کوچے پھرنے لگی۔ جلسے جلوس، پوسٹر بازی غرض وہ وہ ہنگامے ہوئے کہ مابدولت شاید ہی ... الیکشن میں جن جماعتوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ان میں سبز پوش، سرخ پوش، نیلی پوش، پیلی پوش، سیاہ پوش اور سفید پوش خاص طور پر قابل ذکر تھیں۔ موخر الذکر جماعت زیادہ تر دہاتیوں پر مشتمل تھی۔

اس الیکشن میں جو خوش نصیب ملا برسر اقتدار آیا وہ سبز پوشوں کی جماعت کا امیر تھا۔ زبان و قلم کا دھنی، آتش بیاں، زود رقم اس نے اپنے خطبوں اور پمفلٹوں سے ملک میں ہلچل سی مچادی۔ اور اپنی آواز کو ملک کے گوشے گوشے میں پہنچا دیا۔ غرض اس زور شور سے پروپیگنڈا کیا کہ انتخاب میں سب سے زیادہ ووٹ اسی کو ملے اور سرخ پوش، نیلی پوش، پیلی پوش، سیاہ پوش اور سفید پوش امیدوار منہ دیکھتے ہی رہ گئے۔

سبز پوشوں کے امیر نے انتخاب میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد سوچا کہ ان مخالف جماعتوں کے نمایندوں کو مجلس شوریٰ میں شامل کر لینا بہتر ہوگا۔ اس طرح ایک تو ان کی اشک شوئی ہو جائے گی۔ دوسرے وہ ملک میں فتنہ و فساد پھیلانے سے باز رہیں گے۔

امیر نے کہا "الگ الگ رنگ بھائے خود کچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ لیکن جب یہی رنگ یکجا ہو جاتے ہیں تو دیکھو کیسی خوب صورت دھنک بن جاتی ہے۔"

یہ مصالحت بڑی کارآمد ثابت ہوئی۔ چنانچہ مجلس شوریٰ، جس کا کام امور سلطنت میں امیر کو مشورت دینا تھا پوری قوم کی نمایندہ بن کر اپنا کام بڑی دل جمعی کے ساتھ انجام دینے لگی۔ امیر نے مجلس شوریٰ کے اجلاس اور دیگر انتظامی امور سرانجام دینے کے لئے شہر کی جامع مسجد کو پسند کیا اور اسی کے ایک حجرے میں بود و باش اختیار کی۔ چنانچہ دن رات جامع مسجد میں مجلس شوریٰ کے جلسے ہونے لگے۔ اور حکومت کا اصلاحی اور تعمیری کام بڑی سرگرمی سے شروع ہو گیا۔

مجلس شوریٰ نے سب سے پہلے اپنی توجہ اس امر پر مرکوز کی پچھلی حکومت کے زیر اثر معاشرے کے رگ و ریشے میں مغربی تہذیب و تمدن کا جو زہر سرایت کر گیا ہے اس کو زائل کیا جائے چنانچہ تمام انگریزی طور طریقے، لباس، آداب معاشرت یک قلم موقوف کر دیئے گئے بلکہ اس اقدام کو زیادہ مؤثر بنانے کے لئے "نہ رہے بانس نہ باجے بانسری" کے مصداق انگریزی زبان کی تحصیل ہی کو نصاب تعلیم سے خارج کر دیا گیا۔

ملک کی زمام کار امیر نے خود اپنے ہی ہاتھ میں لی۔ اور پچھلی حکومت کے انتظامی امور کے طریقے، سکریٹریٹ اور اس کے ماتحت جملہ شعبے منسوخ کر دیئے گئے اور ان کی پچھلی فائیلوں اور تمام ریکارڈز کو نذر آتش کر دیا گیا۔ البتہ پولیس اور جنگی محکمے بحال رکھے گئے۔

تمام اسکول، کالج اور یونی ورسٹیاں اور مروجہ طریق تعلیم منسوخ کر دیا گیا اور اس کے بجائے دینی مدرسے قائم کئے گئے۔ جو عموماً مسجدوں سے ملحق ہوتے تھے۔ ان مدرسوں میں فقہ، حدیث، تفسیر وغیرہ علوم شرعیہ اور فن قرأت کی تعلیم دی جانے لگی۔ ملک کا رسم الخط عربی قرار پایا اور ایک ایسا منصوبہ بروئے کار لایا جانے لگا کہ ایک معینہ مدت کے اندر سارے ملک کی زبان عربی ہو جائے۔

فن خوش نویسی کی طرف بھی خاص طور پر توجہ دی گئی۔ نسخ، خط کوفی اور طغریٰ کی تعلیم کے لئے ماہر خوش نویسوں کی خدمات حاصل کی گئیں۔ علاوہ ازیں ایک بڑا مدرسہ فن حرب اور سپہ گری کی تعلیم کے لئے بھی کھولا گیا۔ جس میں تلوار، نیزے، گرز اور برچھی بھالے کے استعمال کے گُر سکھلائے جانے لگے۔

عورتوں کی وہ تمام آزادیاں اور بے پردگیاں جن کی پچھلی حکومت نے کھلے بندوں اجازت دے رکھی تھی کلیتہً ختم کر دی گئیں۔ علاوہ ازیں انہیں بے حجابانہ گھر سے باہر نکلنے کی بھی ممانعت کر دی گئی۔ پھر چونکہ بقول ملا نہ تو عورتوں کو مملکت کے انتظامی مناصب دیئے جا سکتے تھے اور نہ وہ عہدوں ہی پر فائز ہو سکتی تھیں۔ اس لئے ان کے لئے تو اعلیٰ تعلیم کی ضرورت ہی نہ سمجھی گئی۔ ان کے لئے تو بس اتنا ہی کافی سمجھا گیا کہ وہ عام اصول دین اور امور خانہ داری جان لیں یا زیادہ سے زیادہ دھوبی کے کپڑوں کا حساب رکھ سکیں۔

مجلس شوریٰ نے دوسرا اصلاحی قدم عدالتوں کے باب میں اٹھایا۔ وکالت کے پیشے کو تو ختم ہی کر دیا گیا کیونکہ وکلا جان بوجھ کر حقائق کو چھپاتے اور اپنے پر فریب دلایل سے منصف کو گمراہ کرتے ہیں اور یہ اسلامی روایات کے سراسر منافی ہے۔ کورٹ فیس ختم کر دی گئی۔ کیونکہ اس سے سایل پر مفت کا بار پڑ جاتا ہے۔ اور وہ اکثر کورٹ فیس کی رقم نہ ہونے کے باعث دادرسی ہی سے محروم رہ جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی جج اور مجسٹریٹ کے عہدے بھی منسوخ کر دیئے گئے اور ان کے بجائے ہر شہر میں مفتی اور قاضی مقرر کر دیئے گئے اور اس طرح عدالتی نظام کے لئے کسی لمبے چوڑے عملے کی ضرورت ہی نہ رہی۔

اراضی کی ملکیت کے بارے میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ جن زمینوں پر لوگوں کا پہلے سے قبضہ چلا آ رہا ہو

ان کی مالکانہ حیثیت برقرار رکھی جائے۔ البتہ لگان کی شرح جریبوں کے حساب اور اجناس کے لحاظ سے مقرر کی جائے۔ اگر کسی شخص کے پاس زمین ہو اور وہ اس پر تین سال تک کھیتی باڑی نہ کر سکے یا اسے تعمیر یا کسی اور کام میں نہ لاسکے تو وہ زمین متروکہ سمجھی جائے گی اور اسے دوسرا شخص کام میں لے آئے تو اس پر عرضی دعویٰ نہ ہو سکے گا۔

ملک میں جہاں جہاں افتادہ زمینیں تھیں ان کے متعلق اعلان کیا گیا کہ جو شخص ان کو آباد کرے اسی کی ملکیت ہو جائے گی۔ فصل کی پیداوار میں زمین دار اور کاشت کار لگان کی رقم منہا کرنے کے بعد برابر کے حصہ دار قرار دیئے گئے۔

مجلس شوریٰ نے نماز، روزہ، زکوٰۃ، قربانی اور بشرط استطاعت حج بیت اللہ کو ہر مسلمان پر فرض قرار دیا۔ اور جو ان احکام شرعی کو انجام نہ دے اس کے لئے دُروں کی سزا مقرر کی گئی۔ جائیداد پر جس میں اراضی، نقدی، زیور، گائیں، بھینسیں، اونٹ، گھوڑے، بھیڑ، بکری شامل تھی زکوٰۃ کی شرح مالیت کا چالیسواں حصہ یعنی اڑھائی فی صد سالانہ ٹھہری۔

مسلمان دولت جمع کر سکتے ہیں اور اسے کاروبار میں بھی لگا سکتے ہیں۔ مگر یہ دولت ان کے مرتے ہی عزیز و اقارب میں تقسیم کر دی جائے گی اور اگر کوئی وارث نہ ہو تو ساری رقم بیت المال میں جمع کر دی جائے گی۔

غیر مسلم رعایا کو ذمی قرار دیا گیا۔ ان کو زکوٰۃ سے تو مستثنیٰ کر دیا گیا مگر ان پر جزیہ لگایا جو تقریباً ساڑھے تیرہ روپے سالانہ فی کس تھا۔ البتہ جو ذمی عساکر اسلام میں بھرتی ہونا پسند کریں ان پر سے جزیہ کی قید اٹھالی جائے گی۔ بعض غیر مسلم اقوام نے جزیے کے خلاف آواز اٹھائی۔ مگر ان میں جو اہل دانش تھے انھوں نے اپنے ہم مذہبوں کو سمجھایا کہ اس طرح ہمارے اُمراء اور اہل ثروت کو زکوٰۃ سے چھٹکارا مل جائے گا جو جزیے سے کئی گنا زیادہ ہو سکتی ہے اور انھوں نے جزیہ دینا منظور کر لیا۔

جرائم میں چوری کے لئے ہاتھ کاٹنے کی سزا، غیر شادی شدہ زانی اور زانیہ کے لئے سو سو دُرے اور شادی شدہ کے لئے سنگساری کی سزا مقرر کی گئی۔

شہروں اور قصبوں میں جہاں جہاں تھیٹر اور سینما تھے سب کے سب دینی درس گاہوں یا یتیم خانوں میں تبدیل کر دیئے گئے۔ ہوٹلوں اور کلب گھروں کی جگہ سرائیں بنا دی گئیں۔ وہ تمام کھیل جن سے مغربیت جھلکتی تھی مثلاً کرکٹ، فٹ بال، ہاکی، ٹینس، گولف، بیڈمنٹن وغیرہ بند کر دیئے گئے اور ان کے بجائے

شہسواری، نیزہ بازی، چوگان بازی، تیراندازی کو از سرِ نو زندہ کیا گیا نیز پہلوانی اور گرز زنی کے فن کو بھی فروغ دیا جانے لگا۔

اسلحہ سازی کے کارخانے سارے ملک میں وسیع پیمانے پر کھل گئے۔ لوہا اور فولاد ڈھال، تلوار، نیزے، گرز اور برچھی بھالے کی صورت میں ڈھلنے لگا۔ مسلم رعایا کے ہر فرد کو بصورت مرد ایک تلوار اور بصورت عورت ایک خنجر کا مستحق قرار دیا گیا۔ چنانچہ جیسے ہی کوئی بچہ پیدا ہوتا حکومت کے اہلکار تلوار اور خنجر لے کر اُس کے گھر پہنچ جاتے۔ تلوار لباس کا جزو بن گئی۔ یہاں تک کہ سقے بھی کمر پر مشک رکھے پہلو سے تلوار لٹکائے گھروں میں پانی بھرنے لگے۔ یہی کیفیت دھنیوں اور کھٹ بنوں کی نظر آنے لگی۔

جب ملک میں تلوار کی مانگ بڑھی اور لوہے کی کمی محسوس کی جانے لگی تو مکانوں کے آہنی پھاٹک اور جنگلے قومی ضرورت کے تحت اکھاڑے جانے لگے۔ ملک میں آتشیں اسلحہ کا ایک کارخانہ بھی کھولا گیا۔ جس میں بندوقیں، رائفلیں، پستول اور اُن کے کارتوس اور گولیاں بنائی جانے لگیں لیکن مجلس شوریٰ نے آتشیں اسلحہ کا استعمال سوائے عساکرِ حکومت کے رعایا کے تمام افراد کے لئے ممنوع قرار دیا۔

ادب اور شعر و شاعری پر بھی کڑی پابندیاں عائد کر دی گئیں اور عاشقانہ غزلوں، نظموں اور گیتوں تو ادب سے خارج ہی کر دیا گیا۔ کیونکہ اِن سے ملک کی بہو بیٹیوں کے خیالات پر بُرا اثر پڑنے کا احتمال تھا۔ البتہ حمد و نعت، رجز، مرثیہ و سلام اور قومی لوریوں کو شاعری میں افضل ترین درجہ دیا گیا۔ ناول افسانے اور ڈرامے چونکہ من گھڑت قصے ہوتے ہیں اور دروغ گوئی کو تقویت دیتے ہیں اسلئے معاشرے میں ان کی کوئی گنجایش نہ تھی۔ اخباروں میں ہر قسم کی تصاویر یہاں تک کہ کارٹون تک چھاپنے بند کر دیئے گئے۔ مصوری، سنگتراشی، موسیقی وغیرہ کو فنون لہو و لعب قرار دے کر ان کی بھی کلی طور پر ممانعت کر دی گئی۔

کسب معاش میں ایسے تمام وسیلے حرام قرار پائے جن سے لوگ معاشرے کو اخلاقی یا مادی نقصان پہنچا کر روزی پیدا کرتے ہیں۔ چنانچہ شراب اور نشہ آور اشیاء کا بنانا اور بیچنا، عصمت فروشی اور رقص و سرود کا پیشہ نیز جوا، گھوڑ دوڑ، سٹہ بازی، لاٹری، معمہ بازی بند کر دی گئی۔ چونکہ سود خواہ بلکہ کسی بھی شکل میں ہو، حرام ہے اس لئے ملک بھر میں بنک، انشورنس، انعامی بونڈ وغیرہ کے کاروبار قطعاً ممنوع قرار پائے۔ بنکوں کی تنسیخ کے بعد دوسرے ممالک سے زرِ مبادلہ کے لین دین کے سلسلے خود بخود ختم ہو گئے اور اس کے ساتھ ہی بین الاقوامی منڈیوں میں اجناس کی خرید و فروخت معدوم ہو گئی۔

ڈاکٹر اور سرجن کے پیشے بھی ختم کر دیئے گئے کیونکہ ان کی دواؤں میں شراب کی آمیزش ہوتی ہے۔

اس کے بجائے طب یونانی اور جراحی حکومت کی سرپرستی میں لینے اور نصاب تعلیم میں شامل کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ نرس کا پیشہ موقوف کر دیا گیا۔

ان سب پیشوں کو ختم کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک میں لاکھوں اشخاص بے روزگار ہو گئے۔ مجلس شوریٰ نے سفارش کی کہ انھیں زمینیں دے دی جائیں تاکہ وہ کھیتی باڑی کر کے اپنا اور بیوی بچوں کا پیٹ پال سکیں مگر مشکل یہ آن پڑی کہ اچھی اچھی اور قابل کاشت زمینیں پہلے ہی سے اور لوگوں کے قبضے میں تھیں۔ جو باقی بچی تھیں وہ یا تو بنجر تھیں یا ان کی مٹی میں سیم اور تھور کی بہتات تھی۔ چنانچہ انھیں کھیتی باڑی کے قابل بنانے کے لئے ان لوگوں کو بڑے جتن کرنے پڑے اور دور دریاؤں سے نہریں کھود کھود کر پانی لانا پڑا۔

ہر شخص کو حکم تھا کہ سیدھا سادہ لباس پہنے اور رہنے سہنے میں سادگی اختیار کرے۔ داڑھی رکھے اور لبیں کتروائے۔ کسی قسم کی شان و شوکت کا اظہار نہ کرے۔ نہ فضول خرچی اور اسراف میں پیسہ ضائع کرے۔ آرام طلبی اور تن آسانی کو ترک کرے۔ چنانچہ پیش بندی کے طور پر شہر کی دکانوں سے تعیش کی ساری چیزیں مثلاً ریفریجریٹر، ایرکنڈیشنر، واشنگ مشین، بجلی کے پنکھے، چولہے، استریاں، چینی کے ظروف اور کراکری کا سامان اٹھوا دیا گیا۔ یہاں تک کہ ٹوتھ پیسٹ اور دانتوں کے برش تک کو معاشرے سے خارج کر دیا گیا برش کے بجائے مسواک کے استعمال پر زور دیا گیا کہ اس سے بقول ملا فصاحت بڑھتی ہے۔

علاوہ ازیں عہد حاضر کی تمام اختراعات و ایجادات مثلاً ریڈیو، ٹیلی ویژن، ٹیلیفون، ٹیپ ریکارڈر، ریکارڈ، پنکھے، کیمرے وغیرہ کی فروخت پر پابندی لگا دی گئی۔ بجلی کی روشنی کا بے جا استعمال جرم ٹھہرا۔ کوکا کولا، پاکولا اور تمام انگریزی طرز کے مشروبات ممنوع قرار دیئے گئے۔

شہر میں جتنی اونچی اونچی عمارتیں تھیں ان کی صرف اتنی ہی منزلوں کو جائز سمجھا گیا جو جامع مسجد کے گنبد و مینار سے نیچی تھیں، باقی منزلوں کو منہدم کرا دیا گیا۔

چونکہ دوسرے ممالک اور خصوصاً مغربی ممالک کے سفیروں کے قیام سے ان کے آداب معاشرت کے برے اثرات اہل ملک کے ذہنوں پر پڑنے کا احتمال تھا اس لئے ان سے کہا گیا کہ آپ یہاں ٹھہرنے کی تکلیف نہ فرمائیں اور اسی وقت تشریف لائیں جب کسی اہم ملکی یا بین الاقوامی نزاع کے سلسلے میں بالمشافہ گفت و شنید کی ضرورت ہو۔

مجلس شوریٰ نے مسلمانوں کو ایک مہینے کی مہلت دی کہ وہ اس عرصے میں اپنا شعار اسلامی بنالیں۔

اور منتشر نظر آئیں۔ اس کے بعد جو شخص غیر اسلامی شعار کا نظر آئے گا اسے دائرہ اسلام سے خارج کر دیا جائے گا۔ وہ چاہے تو کوئی غیر اسلامی مذہب اختیار کر سکتا ہے۔ لیکن اگر وہ مسلم کہلانے پر اصرار کرے گا تو اسے مرتد تصور کر کے سنگسار کر دیا جائے گا۔

پہلے پہل لوگ اپنا ہی ملکی لباس یعنی کُرتا پاجامہ، شیروانی، ٹوپی پہنتے یا پگڑی باندھتے رہے۔ عربی لباس صرف کبھی کبھار پٹڑی پر کھڑے ہو کر طاقت کی دوائیں بیچنے والے نیم حکیموں ہی کے تن پر نظر آتا تھا۔ مگر ایک دن ایک درزی کو جو سوجھی اس نے ایک لمبا ڈگلا سا کرتا زیب بر کیا۔ اوپر ڈھیلی ڈھالی سیاہ عبا پہن، سر پر ایک بڑا سا سفید رومال رکھ، پیشانی پر سنہرے ریشم کی رسی کے دو تین پیچ دے کر بازار میں چل کھڑا ہوا۔

یہ شخص خاصا شکیل اور بلند قامت تھا۔ یہ لباس اس کے جسم پر خوب پھبا۔ چنانچہ کچھ لوگ اس کے پیچھے پیچھے ہو لئے۔ وہ کوئی تین چار گھنٹے شہر کے مختلف بازاروں اور کوچوں میں خوب گھوما پھرا۔ اس کے بعد اپنی دکان پر آ، لباس اُتار، باہر ایک کھونٹی پر لٹکا، نیچے یہ عبارت لکھ دی کہ یہ عربی لباس یہاں سے صرف ۲۵ روپے میں دستیاب ہو سکتا ہے۔ پھر کیا تھا لوگ دھڑا دھڑ آرڈر دینے لگے ایک دوسرے کی دیکھا دیکھی عربی لباس کی مقبولیت ایک دم بڑھ گئی۔

ملاؤں کی حکومت کا پہلا سال ہر پاکستانی کے لئے بے حد صبر آزما ثابت ہوا۔ خود حکومت کو سخت اقتصادی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ مگر عوام نے اس کا پورا پورا ساتھ دیا۔ ملاؤں نے خدا اور رسول کے نام پر اہل وطن سے جو بڑی سے بڑی قربانی بھی طلب کی، انھوں نے اس سے دریغ نہ کیا۔ مصائب اٹھائے مگر اُف نہ کی۔ اس کے ساتھ ہی وہ صوم و صلوٰۃ کے بھی ایسے پابند ہو گئے کہ ان پر کسی محتسب کے مقرر کرنے کی ضرورت ہی نہ رہی۔ جدھر دیکھو چھوٹے چھوٹے لڑکے سیاہ عبائیں پہنے چھوٹی چھوٹی تلواریں کمر سے لٹکائے ٹولیاں بنا بنا کے "خنجر ہلال کا ہے قومی نشاں ہمارا" گاتے ہوئے نظر آنے لگے۔

نماز کے اوقات میں مسجدیں نمازیوں سے اس قدر پُر ہو جاتیں کہ تل دھرنے کو جگہ نہ رہتی۔ جمعہ کے روز ہر طرف ایسی چہل پہل دیکھنے میں آتی جیسے کسی تہوار پر نظر آتی ہے۔

لوگ اپنے عزیزوں اور دوستوں سے تو اپنی مادری زبان ہی میں بات چیت کیا کرتے۔ البتہ غیروں اور اجنبیوں سے ٹوٹی پھوٹی عربی میں ہمکلام ہوتے۔ اُدھر عربی لباس تیزی سے رواج

پا ہی رہا تھا بس ایسا معلوم ہونے لگا جیسے ملک کو عربستان ثانی بنانے کی ریہرسل کی جا رہی ہے۔

۴

جہاں تک تہذیب مغربی کی تقلید، زناکاری، شراب خواری، قماربازی، سود اور عورتوں کی بے پردگی کا تعلق تھا ملاؤں کی حکومت کو ان کی تنسیخ یا ترمیم اصلاح کے قوانین نافذ کرنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی۔ کیونکہ ملاؤں کی سبھی جماعتیں سبز پوش، سرخ پوش، نیلی پوش، پیلی پوش، سیاہ پوش، سفید پوش ان کی بیخ کنی پر متفق تھیں بلکہ ایسے معاملات میں ان کے پیشواؤں میں اس قدر ہم آہنگی پائی جاتی کہ وہ لوگ جو ملاؤں کے مختلف فرقوں میں پھوٹ پڑ جانے کا خدشہ محسوس کیا کرتے تھے اطمینان کا سانس لینے لگے کہ بحمداللہ ہمارے اندیشے باطل ثابت ہوئے۔

لیکن رفتہ رفتہ جب اسلام کے بنیادی اصول و عقاید، ایمان و تقویٰ کا سوال پیدا ہونا شروع ہوا تو ان فرقوں میں انتشار و کشیدگی کی فضا پیدا ہونے لگی۔ یوں تو یہ سبھی فرقے اللہ کو ایک، رسول کو برحق اور قرآن کو کلام اللہ سمجھتے تھے۔ لیکن ان کے جماعتی معتقدات و نظریات ایک دوسرے سے یکسر جداگانہ تھے۔ جیسے مختلف رنگوں والے شیشوں کی عینکوں سے منظر کی کیفیت ہی بدل جاتی ہے۔ سبز پوش جن باتوں کو حلال سمجھتے تھے، سرخ پوش انھیں کو حرام۔ نیلی پوشوں کا جس فقہ پر ایمان تھا، پیلی پوشوں کی نظر میں وہ کفر کے مترادف تھا۔ ہرچند امیر مملکت نے ہر جماعت کو اپنے اپنے اصول و عقاید پر قایم رہنے کی آزادی دے رکھی تھی، ان کی الگ الگ مسجدیں تھیں، الگ الگ طریق عبادت، الگ الگ مدرسے، اور ایک فرقہ دوسرے پر اپنے عقاید مسلط کرنے کا مجاز نہ تھا پھر بھی جب کبھی مختلف فرقوں کے لوگ کسی اجتماعی تقریب یا قومی جلسے میں یکجا ہوتے اور تاریخ یا فقہ کا کوئی مسئلہ زیر بحث آتا تو گفتگو میں تلخی پیدا ہو ہی جاتی۔

جس وقت حکومت نے ایک ادارہ تصنیف و تالیف قایم کیا جس کا مقصد ایک مفصل تاریخ اسلام لکھنا اور رسول اکرمؐ، خلفائے راشدین اور دیگر اکابر اسلام کی سوانح حیات مرتب کرنا تھا تو فرقہ وارانہ جذبات اچانک منظر عام پر آگئے۔ اس کی ابتدا اخبارات سے ہوئی۔ ایک فرقے کے اخبار نے اپنے مقالہ افتتاحیہ میں اس مسئلے پر یوں روشنی ڈالی:

"یہ کتب اگر کسی نجی ادارے کی جانب سے شائع کی جائیں تو ہمیں اس پر چنداں اعتراض نہ ہو۔

قابل اعتراض امر تو یہ ہے کہ ان پر حکومت کی مہر ہوگی۔ اور اس طرح یہ پوری قوم کے خیالات کی نمایندہ تصور کی جائیں گی۔ اگر حکومت کو یہ کتب شائع کرنا ہی ہیں تو اس کا فرض ہے کہ وہ ہر فرقے کے نقطہ نظر سے ان کے الگ الگ سلسلے شروع کرے۔"

اس پر اخبارات میں ایک طویل بحث چھڑ گئی۔ بعض اس کے حق میں تھے، بعض اسے اسراف بے جا تصور کرتے تھے۔ اور بعض کا کچھ اور ہی نظریہ تھا۔ یہ مسئلہ کئی روز تک مجلس شوریٰ کے بھی زیر غور رہا اور جب اس کا کوئی مناسب حل نہ مل سکا تو امیر نے فی الحال تصنیف و تالیف کا کام ہی رکوا دیا۔ مگر اب ملک کی فضا مکدر ہونی شروع ہو چکی تھی۔

بدقسمتی سے اُن ہی دنوں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے مختلف فرقوں کے جذبات کو مشتعل کر دیا۔ ہوا یہ کہ ایک دن جب سرخ پوش اپنے علاقے کی مسجدوں میں نماز فجر پڑھنے گئے تو بعض مسجدوں کی دیواروں پر جلی حروف میں ایسے کلمات لکھے ہوئے پائے گئے جن سے اس جماعت کے بعض اکابر کی بے حرمتی ہوتی تھی۔ اس سے سرخ پوشوں کے غصے اور رنج کی حد نہ رہی۔ اُن کا ایک وفد امیر کی خدمت میں حاضر ہوا۔ امیر نے اس کی شکایت بڑی ہمدردی سے سنی۔ پھر مجلس شوریٰ سے کہا کہ اس معاملے کی پوری پوری تفتیش کی جائے اور مجرموں کو گرفتار کر کے قرار واقعی سزا دی جائے۔

جب دو دن تک مجرم گرفتار نہ کئے جا سکے تو تیسرے روز اسی قسم کا واقعہ سبز پوشوں کی مسجدوں میں پیش آیا۔ سبز پوشوں کو اس امر میں ذرا شک نہ تھا کہ یہ کارروائی سرخ پوشوں نے انتقامی طور پر کی ہے۔ گو سرخ پوش بڑی شد و مد سے اپنی بریت ظاہر کر رہے تھے۔

اسی روز سبز پوش نوجوانوں نے اپنے غم و غصے کے اظہار کے لئے نماز ظہر کے بعد ایک جلوس نکالنا ضروری سمجھا۔ جب تک یہ جلوس ان کے اپنے محلوں میں گھومتا رہا اس سے کسی نے تعرض نہ کیا۔ یہاں تک کہ نیلی پوشوں، پیلی پوشوں، سیاہ پوشوں، اور سبز پوشوں کے محلوں میں بھی خیریت ہی گزری۔ مگر جیسے ہی یہ جلوس سرخ پوشوں کے علاقے میں پہنچا۔ تو ایک تو وہ بے حد لمبا ہو گیا۔ دوسرے اس کے نعروں میں زیادہ تندی و تلخی پیدا ہو گئی۔ ایک آدھ جگہ اینٹ پتھر پھینکے جانے کی خبر بھی آئی۔ مگر شکر ہے کہ بے بنیاد ثابت ہوئی۔ تاہم دونوں فرقوں کے جذبات سخت مشتعل ہو گئے تھے۔ دونوں طرف کے نوجوان بات بات پر تلواریں سونتے پھرتے تھے۔ اس پر حکومت کے لشکریوں کے لئے بیچ بچاؤ کرنا ضروری ہو گیا۔ اس سعی میں تین چار لشکری زخمی تو ہوئے مگر حالات پر قابو پا لیا گیا۔

اگلے روز دونوں فرقوں کے اخباروں نے اس واقعہ پر خوب خوب حاشئے چڑھائے اور ایک دوسرے پر کھلم کھلا چوٹیں کیں۔

امن چین کے چند ہی روز گزرنے پائے تھے کہ ایک اور واقعہ پیش آیا۔ جو پہلے سے کہیں زیادہ سنگین تھا۔ ہوا یہ کہ ایک رات نماز مغرب کے بعد کوئی شخص سیاہ پوشوں کی ایک مسجد میں چپکے سے ایک بم رکھ کر چلا گیا۔ جب یہ بم پھٹا تو خوش قسمتی سے اس وقت مسجد میں کوئی نمازی موجود نہ تھا۔ بس مسجد کا ایک طاق ہی شہید ہوا۔

اس واقعہ سے لوگوں کی توجہ سرخ پوشوں اور سبز پوشوں کے قضئے سے ہٹ کر سیاہ پوشوں کی طرف منعطف ہو گئی۔ سیاہ پوشوں کے اخباروں نے چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھا لیا۔ وہ کئی روز تک اپنی مسجد کے طاق کی شہادت کا سوگ مناتے رہے یہاں تک کہ ایک اور سانحہ اہل ملک کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ اب کے یہ ہوا کہ پیلی پوشوں کے ایک مجتہد نماز عشاء سے فارغ ہو کر مسجد سے گھر کی طرف جا رہے تھے کہ کسی نے ایک تاریک گلی سے نکل کر اُن کی پیٹھ میں خنجر گھونپ دیا اور خود فرار ہو گیا۔ مجتہد کی چیخ سن کر بہت سے پیلی پوش جمع ہو گئے۔ کچھ قاتل کی تلاش میں دوڑے۔ مگر اس کا کہیں پتہ نہ تھا۔ مجتہد کو اٹھا کر مسجد میں لے گئے۔ مگر ان کی حالت نازک تھی۔ زخم کاری لگا تھا۔ چنانچہ جب فجر کی اذان ہو رہی تھی تو وہ دم توڑ چکے تھے۔ پیلی پوشوں کے غیظ و غضب کا کچھ ٹھکانا نہ رہا۔ ایک پیلی پوش اخبار نے سیاہ حاشیوں کے ساتھ اپنے مجتہد کی شہادت پر بڑا پرزور اور دردناک مقالہ لکھا۔ اس کا مقطع کا بند یہ تھا:

"قاتل کا اب تک گرفتار نہ ہونا ثابت کرتا ہے کہ یہ واقعہ کسی منظم سازش کا نتیجہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ قتل کا منصوبہ پہلے سے بہت سوچ سمجھ کر بنایا گیا تھا۔ اس واقعہ سے اس الم ناک حقیقت کا بھی انکشاف ہوتا ہے کہ پیلی پوشوں کے، جو اقلیت میں ہیں، جان و مال کی حفاظت سے قاصر ہے"۔

امیر مملکت نے جنہیں اس واقعہ کا انتہائی صدمہ پہنچا تھا، فوری طور پر مجلس شوریٰ کا اجلاس طلب کیا۔ یہ اجلاس کئی دن تک جاری رہا۔ مگر کسی کو کوئی ایسی تدبیر نہ سوجھی جس سے پیلی پوشوں کی اشک شوئی ہو سکے اور حکومت کو ان کا اعتماد پھر سے حاصل ہو سکے۔

اس اجلاس میں مجلس شوریٰ کے ایک رکن نے کہا:

"ہمارے پاس اس امر کا کیا ثبوت ہے کہ اس قتل کا یا اس سے قبل کے واقعات کا مرتکب

پاکستان کا کوئی باشندہ ہی ہوا ہے۔ اگر وہ پاکستانی ہوتا تو اب تک ضرور اس کا سراغ مل گیا ہوتا۔ مجھے یقین ہے کہ یہ تخریبی کارروائیاں، ملک میں پھوٹ ڈلوانے کی یہ کوشش ضرور کسی ایسے ہمسایہ ملک کے جاسوسوں کی ہیں جو ہم سے بیر رکھتا ہے اور ہماری تباہی کے درپے ہے۔ ان دنوں جب کہ آمدورفت کے وسایل ایسے آسان ہیں نہ معلوم کتنے غیر ملکی ایجنٹ پاکستانیوں کا بھیس بنائے پھر رہے ہیں۔"

کچھ دیر تک اجلاس پر سکوت طاری رہا۔ اس کے بعد دوسرا رکن بولا: "ہاں یہ ممکن ہے۔ لیکن میں پوچھتا ہوں کیا ہمارے اخبارات بھی، جو ملک میں انتشار پھیلا رہے ہیں ہمارے دشمنوں کے ایجنٹ ہیں؟"

اس پر ایک اور رکن نے کہا: "ہم نے مغربی تہذیب کی بہت سی بدعتوں کو منسوخ کر دیا مگر افسوس اخباروں کی طرف کسی کا دھیان نہ گیا۔"

امیر نے جو اپنے ہی خیالوں میں کھوئے ہوئے تھے اور اس گفتگو سے بے تعلق معلوم ہوتے تھے ایک آہ سرد بھری اور کہا:

"کاش قاتل پکڑا جاتا!"

ملک کی فضا روز بروز زیادہ بگڑتی جا رہی تھی۔ اب اِکّا دُکّا آدمیوں پر حملے ہونا عام بات ہو گئی تھی۔ اس پر ملک کی تمام جماعتیں اپنی اپنی حفاظت کے لئے رضا کار بھرتی کرنے لگی تھیں کیونکہ عساکر حکومت پر سے ان کا اعتماد اٹھتا جا رہا تھا۔ چند ہی دنوں میں سرخ پوشوں، سبز پوشوں، نیلی پوشوں پیلی پوشوں، سیاہ پوشوں اور سفید پوشوں نے ہزاروں کی تعداد میں رضا کار بھرتی کر لئے۔ ان رضا کاروں کے دستے اپنی اپنی جماعت کے مخصوص رنگ کی وردیاں پہنے، سوائے بندوق کے باقی سب ہتھیاروں سے لیس، اپنا اپنا پھریرا لہراتے، بڑے بڑے بازاروں اور چوکوں میں کھلے بندوں فوجی مشقیں کرتے دکھائی دینے لگے۔ شہر کی تمام دکانیں سرشام ہی بند ہو جاتیں۔ لوگ گھروں میں پہنچتے تو عافیت کا سانس لیتے۔ کہیں وقت بے وقت آنا جانا ہوتا تو جتھے بنا بنا کر جاتے۔

ایک دفعہ ایک بارونق بازار میں عین روز روشن ایک شخص کی نعش پائی گئی۔ یہ شخص جو عربی لباس پہنے تھا اوندھے منہ پٹری پر گرا پڑا تھا۔ اس کی ناک اور منہ سے خون جاری تھا۔ پل بھر میں سبز پوشوں، سرخ پوشوں، نیلی پوشوں، پیلی پوشوں، سیاہ پوشوں اور سفید پوشوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ گئے۔ سرخ پوش کہتے تھے کہ ہمارے آدمی کو ظالم سبز پوشوں نے مار ڈالا۔ سبز پوش کہتے تھے کہ ایک غریب سبز پوش، سرخ پوشوں کے کینے کا شکار ہو گیا۔ چونکہ متوفی کسی خاص فرقے کا لباس پہنے ہوئے نہ تھا

اس لئے نیلی پوش، پیلی پوش، سیاہ پوش، سفید پوش بھی اُس پر اپنا حق جتانے لگے تھے۔ قریب تھا کہ تنازعہ بڑھ جاتا مگر اتنے ہی میں ایک بے پردہ عورت مجمع کو ہٹاتی ہوئی نعش کے قریب پہنچی اور اس کو پہچان کر اُس سے لپٹ گئی۔ معلوم ہوا کہ متوفی اس کا شوہر تھا۔ یہ دونوں سِکھ مذہب سے تعلق رکھتے تھے۔ شوہر بڑی لباس پہننے کا بہت شوقین تھا۔ وہ ادھیڑ عمر تھا اور کئی برس سے دل کے مرض میں مبتلا تھا۔ قیاس کہتا ہے کہ اس پر چلتے چلتے اچانک دل کا دورہ پڑا ہوگا اور وہ گر کر مر گیا۔ اور یوں خدا خدا کرکے یہ ہنگامہ فرو ہوا۔

غرض صورت حال اس قدر نازک ہوگئی کہ امیر نے عساکر حکومت کے نام حکم جاری کر دیا کہ اپنے دستے شہر کے ناکوں پر متعین کر دو۔ اور دن رات بازاروں اور گلی کوچوں میں گشت کرتے رہو۔ اور جہاں مفسدوں اور فتنہ پردازوں کو دیکھو گرفتار کر لو۔ اور اگر وہ مزاحمت کریں تو انھیں گولی مار دو۔ اس میں کسی فرقے یا جماعت کا لحاظ نہ کیا جائے۔

امیر خود بھی مجلس شوریٰ کے اراکین کے ہمراہ اکثر شہر میں گشت کرتے۔ وہ ہر فرقے کے لوگوں سے ملتے اور انھیں اتحاد، بُردباری اور صبر کی تلقین کرتے۔ اور جو دن بھی خیر و عافیت سے گزر جاتا اس کی شب کو وہ دیر دیر تک جامع مسجد میں سربسجود رہتے اور خضوع و خشوع کے ساتھ شکرانہ خداوندی ادا کیا کرتے۔

ایک رات وہ جامع مسجد کے صحن میں کچھ زیادہ ہی دیر سجدے میں گرے رہے۔ جب پہلے صبح کاذب اور پھر صبح صادق نمودار ہوئی تب بھی وہ سربسجود ہی رہے۔ پھر جب نمازی حسب معمول صحن مسجد میں نماز فجر کے لئے جمع ہوئے تو اُس وقت بھی انھوں نے سجدے سے سر نہ اٹھایا۔ اس پر لوگوں کو کچھ تشویش ہوئی۔ قریب جا کر دیکھا تو امیر شہید ہوئے پڑے تھے۔ زہر میں بجھا ہوا ایک خنجر ان کے پہلو میں گھونپا ہوا تھا۔

امیر ملت کی شہادت کی خبر آن کی آن میں دارالخلافہ کے گوشے گوشے میں پھیل گئی۔ پھر کیا تھا ان کے پیرو سبز پوش غیظ و غضب سے دیوانے ہوگئے۔ وہ "القصاص، القصاص" چلاتے ہوئے سرخ پوشوں کے محلوں کی طرف چڑھ دوڑے۔ اُدھر گھروں سے سینکڑوں لوگ نیزے، تلواریں اور برچھی بھالے لے لے کے نکل پڑے۔ ہر طرف تلواریں چلنے لگیں۔ آہ و بکا، فریاد و فغاں کی صدائیں اٹھنے لگیں۔ زمین بے گناہوں کے خون سے رنگین ہونے لگی۔ "مارو ان ناپاک سبزوں کو!" "لینا ان پلید سرخوں کو!" کے

نعرے بلند ہونے لگے۔ رفتہ رفتہ رنگوں کی کوئی قید نہ رہی۔ اور نیلے پیلے، سیاہ و سفید بھی مار دھاڑ میں شامل ہو گئے۔ کچھ لوگوں نے مسجدوں پر یورش کی۔ منبروں کو توڑ پھوڑ ڈالا۔ مسجدوں کی دیواروں پر بزرگانِ دین کے ناموں کے جو کتبے لگے تھے انھیں نوچ کھسوٹ کر اتار ڈالا۔ بعض شقی گھروں میں گھس گئے اور عورتوں کی بے حرمتی کرنے لگے۔ عورتیں روتی پیٹتی اور بچے بلکتے تھے۔ مگر کوئی ان کی فریاد سننے والا نہ تھا۔ گھنٹے بھر کے اندر تمام بازار اور گلی کوچے لاشوں سے پٹ گئے۔

اُدھر حکومت کے لشکری الگ بندوقیں چلا چلا کر بلوائیوں کو موت کے گھاٹ اُتار رہے تھے سڑکوں پر ہزاروں لاشیں بے گور و کفن پڑی نظر آنے لگیں۔

ابھی یہ ہنگامہ کشت و خون برپا ہی تھا کہ دفعتہً فضا میں ایسی آوازیں گونجنے لگیں جیسی بمبار طیاروں کے اُڑنے اور ٹینکوں کے چلنے سے پیدا ہوتی ہیں۔

یہ طیارے اور ٹینک پاکستانی عساکر کے نہ تھے ......

۵

ایک صحرائے لق و دق ہے جس پر چودھویں کا پورا اور گول چاند اپنی پوری تابندگی کے ساتھ چاندنی بکھیر رہا ہے۔ جس طرف نگاہ اٹھتی ہے ریت ہی ریت دکھائی دیتی ہے۔ جس کے ذرے چاندی کی طرح چمک رہے ہیں۔ ریت میں کہیں نشیب ہیں کہیں فراز۔ کہیں ریت کے اونچے اونچے ٹیلے، جن پر آ ہو خرام بے پروا میں مصروف ہیں۔ جب کبھی کوئی قافلہ ادھر سے گزرتا ہے تو یہ آ ہو چوکڑیاں بھرتے ہوئے کوسوں دور نکل جاتے ہیں۔

دور دور تک آبادی کا نشان نہیں۔ البتہ کہیں کہیں ایسے کھنڈر ضرور پائے جاتے ہیں۔ جنکو دیکھنے سے گمان ہوتا ہے کہ یہاں کبھی کوئی متمدن شہر آباد ہوگا۔ ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی ہے جو ایک عجیب اداسی کی کیفیت لئے ہوئے ہے۔

اچانک افق پر کچھ دھبے سے نمودار ہوئے۔ جب کوئی قافلہ آتا ہے تو پہلے یوں ہی دھبے سے دکھائی دیتے ہیں، جو رفتہ رفتہ پھیلتے جاتے ہیں۔ ایسا نظر آنے لگتا ہے جیسے کوئی لمبا سانپ بل کھاتا ہوا آ رہا ہو۔ رفتہ رفتہ اونٹوں کے گلے میں پڑی ہوئی گھنٹیوں کی آواز حدی خواں کے لحن کے ساتھ مل کر دھیمی دھیمی سنائی دینے لگتی ہے۔ جوں جوں قافلہ قریب آتا جاتا ہے آوازیں بلند ہوتی جاتی ہیں، یہاں

کسی قافلے کے محافظ لشکریوں کے نیزے چاندنی میں چمکتے ہوئے نظر آنے لگتے ہیں۔

لیکن یہ دھبے جو افق پر نظر آئے۔ نہ تو پہلے اور نہ انھوں نے سانپ کی شکل ہی اختیار کی۔ البتہ وہ بڑے ضرور ہو گئے۔

نہیں۔ یہ کوئی قافلہ تو نہیں بلکہ چند مسافر ہیں۔ جب یہ قریب پہنچے تو معلوم ہوا کہ چار اونٹ چلے آ رہے ہیں۔ جن پر دو مرد اور دو عورتیں سوار ہیں۔ ان چاروں نے مغربی لباس پہن رکھا ہے۔ اگلے اونٹ کی مہار ایک شخص نے پکڑ رکھی ہے جو بدوؤں کا سا ڈھیلا لباس پہنے اونٹ کے قدم بہ قدم چل رہا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی انگریز یا امریکن سیاح ہیں۔ جو بندرگاہ کے ہوٹل سے گائیڈ کے ہمراہ چاندنی میں گرد و نواح کی سیر کو نکلے ہیں۔ مرد ادھیڑ عمر ہیں اور عورتیں بھی جوانی کی منزل سے گزر چکی ہیں۔ مگر چاروں چاق و چوبند اور شاداں و فرحاں نظر آتے ہیں۔ ان کے قہقہے اونٹوں کی گھنٹیوں کی آواز میں گڈمڈ ہو کر اس منظر کی اداسی پر ایک تضحیک کی سی کیفیت پیدا کر رہے ہیں۔

ایک عورت نے اپنی اونچی اور خراش دار آواز میں اپنے ساتھ والے مرد سے کہا:

"ڈک! دیکھو یہاں کا منظر کتنا دل فریب ہے۔ ذرا گائیڈ سے پوچھو ابھی کتنا اور آگے جانا ہے۔"

مگر یہ پوچھنے کی نوبت ہی نہ آئی۔ کیونکہ گائیڈ چلتے چلتے خود ہی ٹھہر گیا۔ ساتھ ہی گھنٹیوں کی آواز بھی تھم گئی۔ چاروں سیاح گردنیں گھما گھما کر گرد و پیش کا منظر دیکھنے لگے۔ گائیڈ نے کھنکار کر انھیں اپنی طرف متوجہ کیا۔ پھر وہ ریت پر ایک خاص جگہ جہاں کچھ کھنڈر پتھروں کی صورت میں پڑے تھے، اشارہ کر کے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کہنے لگا:

"صاحب! یہی وہ جگہ ہے جہاں فلیم کے حملے سے پہلے ہوٹل موہن جوڈارو ہوا کرتا تھا جس کی اکہتر منزلیں تھیں اور جہاں پہلی مرتبہ پاکستانی خلا بازوں نے چاند سے ریڈیو پر پیغام بھیجا تھا....."

غلام عباس کی قابل قدر پیش کش "دھنک" کتابی شکل میں بھی مل سکتی ہے۔ ادارہ

رضیہ فصیح احمد

جب پھوپی کھوئی گئیں

کچھ واقعات بین الاقوامی تاریخ کا حصہ ہوتے ہیں جیسے عالمگیر جنگیں، کچھ ملکی تاریخ کا جیسے چھوٹے موٹے سیاسی انقلاب۔ کچھ واقعات خاندانی تاریخ کا جزو ہوتے ہیں جن کو گاہے بگاہے اسی طرح یاد کیا جاتا ہے جیسے دوسرے واقعات کو مثلاً یہ اس وقت کی بات ہے جب پھوپی کھوئی گئی تھیں۔ یہ ہمارے خاندان کا ایک تاریخی حادثہ ہے اور اس وقت کی بات ہے جب کراچی کا جغرافیہ بہت مختصر سا تھا۔ کراچی کے شاخسانے مختلف سوسائٹیوں کی شکل میں ابھی نہ نکلے تھے۔ کاریں انگلیوں پر گنی جا سکتی تھیں۔ بسوں میں ذرا اتنا ہجوم ہوتا تھا۔ ان میں بیٹھنا کسرِ شان سمجھا جاتا تھا۔

سردیوں کے دن تھے اور شام کا وقت۔ ہم سب اپنے روزمرہ کے کاموں میں لگے ہوئے تھے کہ تقی بھائی گھبرائے ہوئے گھر میں داخل ہوئے۔

"پھوپی آئی ہیں؟" انھوں نے پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان پوچھا۔

"کیسی پھوپی! کون سی پھوپی؟" اُلٹا سب ان ہی سے پوچھنے لگے۔ ہماری دو ہی تو پھوپیاں تھیں اور دونوں قطعی اس بات کی نااہل تھیں کہ کراچی جیسی جگہ میں تنہا سفر کر سکتیں۔ تقی بھائی کا زرد پڑا ہوا رنگ بالکل ہی اڑ گیا۔ پیشانی پر آئے ہوئے پسینے کے قطرے دریا بن کر بہنے لگے۔

"بات کیا ہے پوری بات تو بتاؤ!" منجھلی نانی نے پوچھا۔

اور تقی بھائی جیسے تیسے پھوپی کے کھوئے جانے کی داستان سنانے لگے۔ بڑے تایا کا کنبہ ان دنوں ڈرگ روڈ میں رہتا تھا اور کبھی بس سے اور کبھی ٹرین سے کراچی آیا جایا کرتا تھا۔ آج بڑے تایا کو چھوڑ کر باقی سب لوگ بس سے آ رہے تھے۔ صدر پر اترے تو کچھ دیر بعد پتہ چلا کہ پھوپی نہیں ہیں۔ بس جا چکی تھیں۔ سارے گھر والے ڈر کے مارے واپس ڈرگ روڈ لوٹ گئے صرف تقی بھائی کو ریلوے اسٹیشن دوڑایا کہ بس کا آخری اسٹاپ وہی تھا۔ وہاں بھی کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکا کسی ایک آدمی نے کہا کہ اس نے ایک برقع پوش چھوٹی سی لڑکی کو تنہا اسٹیشن پر دیکھا تھا جو کسی ٹرین میں بیٹھ گئی تھی۔ وہاں سے تقی

بھائی سیدھے یہاں آئے کہ شاید کسی طرح پھوپی یہاں پہنچ گئی ہوں مگر جب اُلٹا انھیں آتے ہاتھوں لیا جانے لگا تو ان کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ ادھر سارے گھر والے ایک دم پریشان ہو اُٹھے۔ منجھلے تایا غصّے کے تیز تھے۔ انھوں نے جوتے پہنتے ہوئے بیوی کو للکارا "لاؤ پیسے دو، میں اسے ڈھونڈنے جاؤں۔" اور جب بیوی نے ڈرتے ڈرتے دس بیس روپے بڑھائے تو وہ پھنکارے۔ "یہ کیا دے رہی ہو ہو سکتا ہے مجھے پشاور تک جانا پڑے۔ نہ جانے کون سی گاڑی میں بیٹھ گئی ہو وہ ڈرگ روڈ میں رکتی بھی ہوگی یا نہیں اور رُکے بھی تو اس میں اتنی عقل ہے کہ وہاں اُتر جائے۔"

چھوٹی پھوپی بڑے اور منجھلے تایا دونوں سے چھوٹی اور ہمارے ابا سے بڑی تھیں ان کا صحیح قد کیا تھا۔ یہ تو مجھے یاد نہیں البتہ یوں سمجھ لیجئے کہ بڑھوتری میں پڑا ہوا ہر بچہ وقتاً فوقتاً اپنا قد پھوپی سے ناپا کرتا تھا اور گیارہ بارہ سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے ان سے اونچا نکل جاتا تھا۔ ایک بات یہ یاد ہے کہ گھر کے کسی پلنگ یا کرسی پر بیٹھ جائیں تو ان کے پیر زمین سے اوپر ہی اوپر جھولتے رہتے تھے بہن بھائیوں میں وہ واحد ہستی تھیں جنھوں نے کچھ نہیں پڑھا تھا اور وہ خود ہی کہا کرتی تھیں کہ "اللہ میاں نے اتنا دماغ ہی نہیں دیا کہ کچھ پڑھتی لکھتی"۔ مگر ہم بچوں کو یہ شبہ تھا کہ وہ کچھ نہ کچھ ضرور پڑھ سکتی ہیں۔ ہم نے اکثر ان کے ہاتھ میں اخبار، کتاب یا گھر میں آنے والے خطوط دیکھے تھے۔ چونکہ وہ ان پڑھ مشہور تھیں اس لئے اس بات کو جھٹلانا نہیں چاہتی تھیں خصوصاً جب کہ ہم بچے "پھوپی پڑھ سکتی ہیں۔" کو باقاعدہ سلوگن کے طور پر ان کے خلاف استعمال کرتے تھے۔ شادی ان کی اسی عمر میں ہوئی تھی جس عمر میں پہلے وقتوں میں ہوا کرتی تھیں یعنی چودہ پندرہ کا سن ہوگا مگر پھوپی چند ماہ سے زیادہ سُسرال میں نہیں رہیں۔ ایک مرتبہ جو اپنے سُسرالی شہر سے واپس آکر بیٹھیں تو پھر کبھی واپس نہیں گئیں اور جلد ہی پھوپا نے دوسری شادی کرلی۔ یہ تو ہماری یاد کا واقعہ تھا کہ جب پھوپا کا انتقال ہوا اور پھوپی کی چوڑیاں توڑنے کا سوال اٹھا تو دادی نے کہا "اے جانے بھی دو، اس بے چاری کا کیا سہاگ اور کیا بیوگی۔"

یوں پھوپی کی ساری عمر بھائیوں میں گزری جہاں بھتیجے بھتیجیوں کی ایک سے ایک شیطان نسل پیدا ہوتی تھی اور پھوپی کے نتھنوں میں تیر پھناتی رہتی تھی۔ ایمان کی بات یہ ہے کہ ہم میں کسی نے بھی چھوٹی پھوپی کو وہ عزت نہ دی جو پھوپھیوں کا حق ہے۔ بات یہ ہے کہ آنکھ کھولی تو ہم نے اپنے سے بڑے بہن بھائیوں کو ان پر ہنستے پایا۔ اب اس میں کچھ ان کا اپنا بھی قصور تھا بقول ہماری امی کے کہ خواہ مخواہ بچوں سے اُلجھتی تھیں کہ آ بیل مجھے مار۔ ہماری نسل نے بھی ان سے وہی سب مذاق روا رکھے جو ہم سے

بڑے کرتے آئے تھے۔ ان کے وقت بے وقت کھانے پینے پر، ان کے رو پیہ جوڑنے پر، ان کے شوہر اور سوتیلے بچوں پر مذاق نسل در نسل چلتا رہا۔ اب مثلاً ہر لوہا انھیں اس بات پر چھیڑتی تھی کہ یہ جو وہ ہر وقت نماز میں پڑھا کرتی ہیں تو نماز کی کوئی سورت انھیں پوری اور صحیح یاد نہیں ہے۔ بعض بچے قسمیں کھا کر کہتے تھے کہ انھوں نے پھوپی کو تین سجدے کرتے دیکھا ہے۔ اب ایسی باتوں پر وہ مارنے کو نہ دوڑتیں تو کیا ہم پر پھول برساتیں۔

دادی اماں مرحومہ کو جب کبھی ان کے بیٹے پیسے دیتے ہوں گے ان ہی میں سے کچھ وہ بیٹی کو دیتی ہوں گی۔ وہی زنگ کھائے، گھنیائے ہوئے سیاہ رنگ پیسے اب تک ان کے ٹرنک کے کسی کونے میں رکھے تھے جس کی کنجی وہ سنبھال سنبھال کر رکھتی تھیں مگر بندہ بشر آخر غلطی کا پتلا ہے کبھی کبھی وہ کنجی کسی کے ہاتھ لگ جاتی اور ہم سب یہ اعلان کر دیتے کہ ہم نے پھوپی کا سارا خزانہ نکال لیا ہے۔ اور پھر وہ تو پکار مچتی کہ سارا محلہ سنتا۔ پھوپی اپنا ٹرنک دیکھے بغیر ہم سب کو کوس کاٹ کر ڈھیر کر دیتیں۔ یہ سب اس وقت ہوتا جب کوئی مرد گھر میں نہ ہوتا۔ امی کبھی ہمیں ڈانٹیں کبھی نند کے لئے لیتیں کہ تم بھی بچوں کے ساتھ بچی بن جاتی ہو۔ آخر گھنٹہ بھر کی چیخ پکار کے بعد کوئی بڑا بہن بھائی دخل دیتا تو کنجی پھوپی کو واپس ملتی اور وہ کچھ ہنستی کچھ روتی جا کر ٹرنک کھول کر اپنا اطمینان کرتیں۔ ان کے نماز کے اوقات پر بھی ان سے چھیڑ رہتی۔ وہ اول وقت نماز پڑھنے کی اس حد تک قایل تھی کہ اکثر ایسا ہوا کہ عصر کی اذان ہوئی تو معلوم ہوا کہ پھوپی مغرب کی نماز بھی نمٹائے بیٹھی ہیں۔ اب اگر کوئی انھیں سنجیدگی سے بھی سمجھاتا تو وہ ہرگز ماننے کو تیار نہ ہوتیں۔ ایک دن غصے میں جل کر کہہ اٹھیں "واہ وا یہ خوب رہی۔ اگر کسی دن سورج نہیں ڈوبے گا تو کیا مغرب کی نماز ہی نہیں ہوگی۔"

یہ تھیں ہماری چھوٹی پھوپی کہ جب برقع اوڑھ کر ہمارے ساتھ ساتھ چلتیں تو سب سے چھوٹی بہن دکھائی دیتیں۔ منجھلے تایا کے جانے کے بعد منے بھائی ریلوے ٹائم ٹیبل لے کر بیٹھ گئے۔ یہ دیکھنے کہ پھوپی کون کون سی گاڑیوں میں بیٹھ سکتی ہیں۔ ہمارے ابا اس وقت اپنے کمرے میں او ہوتے وہ یہ خبر سن کر گم سم مراقبے میں چلے گئے کہ ایسی پریشانی کے وقت وہ کسی کام دھام کے نہیں رہتے تھے۔ ان کی اپنی حالت غیر ہو جاتی تھی اور امی اصل مسئلہ بھول کر ان کی دیکھ ریکھ میں لگ جاتی تھیں۔ پھر منے بھائی اچانک اٹھے اور جوتے پہن کر وہ بھی پھوپی کی تلاش میں نکل گئے اور ہم سب بچوں پر جو اس وقت تک بغیر کھائے پیئے بستروں میں دبک گئے تھے بڑا ہنسی کا دورہ یہ سوچ سوچ کر کہ پھوپی نے کیسے کیسے ڈرامے کئے ہوں گے۔ وہ بغیر ٹکٹ پشاور یا کوئٹہ جانے والی گاڑی میں بیٹھ گئی ہوں گی۔ اور جب ٹکٹ چیکر نے ٹکٹ مانگا ہوگا تو انھوں نے کیا جواب

دیا ہوگا۔ پھوپی کو ہمارے بڑے تایا نے جو ان معاملات کو بڑی اہمیت دیتے تھے، سینکڑوں ہی مرتبہ اپنے اور نزدیکی عزیزوں کے گھروں کے پتے یاد کروائے ہوں گے مگر وہ ان کے ذہن سے یوں پھسل جاتے تھے جیسے چکنے گھڑے پر سے پانی کی بوند۔ اب کسی بھلے مانس نے ان سے ان کے گھر کا پتہ یا بھائیوں کے نام پتے پوچھے ہوں گے تو انھوں نے کیا کہا ہوگا۔ ہمیں یقین تھا کہ پھوپی کو اپنے بھائیوں کے نام بھی بڑے بھائی منجھلے بھائی اور بچّی میاں سے آگے یاد نہ تھے۔ اس سلسلے میں جتنی مضحکہ خیز صورت حالات ممکن تھیں، ہم باری باری ان سب کا تصور پیش کرتے اور ہنستے اور کوئی ایسی ویسی ہنسی، اس قدر والہانہ اور بے قابو کہ سانس پیٹ میں نہ سماتا۔ آخر منجھلی تائی جانماز پر سے اٹھ کر آئیں اور ہمیں ڈانٹا۔

"شیطانو! یہ وقت ہنسنے کا ہے یا رو رو کر دعائیں مانگنے کا، کہ ہماری پھوپی کو ساتھ خیریت کے گھر پہنچائے۔" وہ تو یہ کہہ کر دوبارہ مصلّے پر جا بیٹھیں۔ مگر یہاں تو شیطان سوار تھا جو اتنی آسانی سے اترنے والا نہ تھا۔ ناصر نے لمحہ بھر میں سر پر پگڑ باندھ جانے کہاں سے تسبیح نکال لی اور ورد کرنے لگا "یا اللہ ہماری پھوپی کو خیریت سے گھر پہنچا۔" اس کا لہجہ کم بخت ایسا تھا کہ ہنسی روکتے روکتے پیٹ میں درد ہونے لگا۔ ادھر گڈو وہیں پلنگ پر سجدہ ریز ہو گیا اور پھر ہاتھ پھیلا کر دعائیں مانگنے لگا "یا مولیٰ ہماری پھوپی کو ہمارے گھر کا نمبر یاد دلا دے اور محلے کا نام بھی اور شہر کا نام بھی اور ملک کا نام بھی ایسا نہ ہو کہ کوئی منحوس انھیں انگلستان پہنچا دے۔" سلیم نے فوراً انگوٹھی رگڑ کر جن کو بلایا اور حکم دیا "ہماری چھوٹی پھوپی کو دنیا کے جس کونے میں بھی ہوں فوراً حاضر کرو، ورنہ اے جن تمہاری گردن ماردی جائے گی۔" ان بے تکی باتوں پر کر جن کا سر تھا نہ پیر ہنسی تھی سانس نہ لینے دیتی تھی۔ اب یہ سوچ کر حیرت ہوتی ہے کہ بچپن میں کیسی کیسی سنجیدہ باتوں پر ہنسی آتی ہے اور کیسی گھر گھر کر آتی ہے کہ ڈانٹ پھٹکار سے، بجائے کم ہونے کے بڑھتی ہی جاتی ہے۔ کہتے ہیں جب میدان جنگ میں کسی سپاہی کے گولی لگتی ہے تو پاس کھڑا ہوا سپاہی آپ ہی آپ مسکرا اٹھتا ہے یہ جان کر کہ یہ میں نہیں تھا جس کے گولی لگی۔ شاید ہماری ہنسی بھی اسی قسم کی ہنسی تھی جس میں یہ طرب انگیز جملہ چھپا ہوا تھا "خدا کا شکر ہے یہ ہم نہیں تھے جو کھوئے گئے۔"

مجھے یاد ہے ایک مرتبہ پہلے بھی ہم اسی طرح بے لگام ہنستے چلے گئے تھے۔ یہ وہ دن تھا جب ریڈیو پر اعلان ہوا تھا کہ کراچی کے نزدیک سمندر میں طوفان آنے والا ہے اور کراچی زبردست خطرہ لاحق ہے بہتیرے اہل دل اس رات ہوائی جہاز میں بیٹھ کر کراچی کو خیرباد کہہ گئے تھے۔ اس دن بھی ہمارے بڑوں نے جانمازیں اور تسبیحیں سنبھال لی تھیں اور ہم بچوں نے تخیل کی لگامیں ڈھیلی چھوڑ دی تھیں اور ہنستے ہنستے

بے حال ہو گئے تھے۔ شاید اس رات ہم ہنس ہنس کر اُس خوف کو دور بھگانے کی کوشش کر رہے تھے جو اندر سے ہماری روحوں کو منجمد کر رہا تھا۔

جب رات گہری ہونے لگی تو سب سے پہلے منے بھائی اپنی تلاش سے بے نیل و مرام لوٹے۔ ابا نشستم پشتم کوٹھے پر سے اتر کر پلنگ پر تکئے سے پیٹھ لگا کر بیٹھ گئے۔ وہ شکل سے پرانے بیمار نظر آ رہے تھے منجھلی تائی اور امی اپنے اپنے بستروں پر صورت تصویر بیٹھ گئیں تب ہم بھی ایک دوسرے میں گھس کر چپ چاپ پڑ گئے کہ اب ہنسنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ اسی طرح پڑے پڑے جانے کب سو گئے کہ ذرا ہنگامے سے آنکھ کھلی۔ گھر میں ابھی خاصی چہل پہل تھی۔ بڑے تایا چھوٹی پھوپی کے ساتھ ابھی ابھی گھر میں داخل ہوئے تھے۔ ہمیں اندازہ ہوا کہ پھوپی کسی نہ کسی طرح ڈرگ روڈ میں اپنے گھر پہنچ گئی تھیں۔ ان دنوں کی طرح گھر گھر ٹیلی فون نہیں تھا۔ تایا یہ سوچ کر کہ رات بھر سب پریشان رہیں گے خود ہی پھوپی کو لے کر یہاں آ گئے تھے۔ امی، تایا اور پھوپی کے لئے کھانا نکالنے چلیں تو چلتے چلتے ہم سے بھی کہا "بچو! اٹھو کھانا کھا لو، پھوپی آ گئی ہیں۔"

تھوڑی دیر بعد منجھلے تایا لوٹے۔ اپنی روئیداد تو انھوں نے نہ سنائی، لے کر پھوپی کے پیچھے پڑ گئے کہ وہ کیسے گھر تک پہنچیں۔ پھوپی نے اُس غبی طالب علم کی طرح جو غلط جواب دینے کے ڈر سے چپ رہ کر سارا دن پٹنے کو ترجیح دیتا ہے چپ سادھ لی۔ ادھر منجھلے تایا رہ رہ کر ایسے دھاڑتے کہ ہم سب لحافوں میں دُبکے قل پڑھنا شروع کر دیتے۔ ادھر پھوپی رو رو کر دوپٹے سے منہ اور ناک پونچھے جاتیں مگر ہرگز منہ سے کچھ نہ بولتیں۔ بڑے تایا اور ابا خاموش بیٹھے تھے کہ منجھلے تایا کے غصے کے آگے کسی کی پیش نہ جاتی تھی۔ وہ تو تائی سر پر کفن باندھ آگے بڑھیں اور بولیں "قصہ بعد میں سن لیجئے گا ان کو کھانا تو کھا لینے دیجئے اور آپ بھی کھانا کھا لیجئے منہ ہاتھ دھو کر۔"

منجھلے تایا غصے میں پیر پٹختے غسل خانے میں چلے گئے۔ تائی نے چھوٹی پھوپی کو دودھ کا ایک پیالہ پلا کر جھٹ بستر میں لٹا دیا کہ کہیں پھر سے عدالت نہ بیٹھ جائے۔ بڑے تایا کو اوپر ابا کے ساتھ سلا دیا گیا کہ اب کہاں رات کو جاتے پھریں گے اور ہم سب بغیر کھانا کھائے جیسے ٹیڑھے بانکے جہاں پڑے تھے وہیں سو گئے۔

صبح اٹھے تو حالات نارمل تھے۔ بڑے تایا ابا کو لے کر اپنے گھر چلے گئے تھے۔ منجھلے تایا شیروانی پہن کر بینک کے کسی کام سے جا چکے تھے۔ منے بھائی اپنے دفتر سدھار چکے تھے۔ ہم نے پھوپی سے اپنے گم ہو جانے کی داستان سنانے کو کہا تو خلاف توقع انھوں نے سارا قصہ سنا دیا۔ "جب اسٹیشن کے بس اسٹینڈ

بسا سے مسافر اُتر گئے اور بس کنڈکٹر نے پوچھا اے منی تجھے کدھر جانا ہے تو میں گھبرائی اور گھبرا کر وہیں اُتر
ی۔ میں نے سوچا کہ بس سے جاؤں تو پتہ طے نہ طے اس سے اگر میں گاڑی میں بیٹھ جاؤں تو ڈرگ روڈ پر
رک کر گھر جا سکتی ہوں تو بھیا میں گاڑی میں بیٹھ گئی۔"

"مگر تمہیں کیسے پتہ تھا کہ یہ گاڑی ڈرگ روڈ پر ٹھہرے گی؟"

"ہاں مجھے پتہ تھا۔" پھوپی نے فخر سے کہا "یہ وہی تو گاڑی تھی جس کے پہنچنے پر میں روز مغرب
نماز پڑھا کرتی ہوں۔"

"اچھا پھر ڈرگ روڈ پر بغیر ٹکٹ نکلیں کیسے؟"

"بغیر ٹکٹ کیوں! میرے پاس ٹکٹ تھا۔"

"اچھا! وہ کس نے دلوایا؟"

"میں نے خود لیا..... میرے پاس پیسے تھے۔ اماں کہا کرتی تھیں کہ باہر جاتے وقت تھوڑے
سے پیسے پلّو میں باندھ لیا کرو۔"

"اچھا! پھر کیا ہوا؟"

"بس اسٹیشن سے باہر نکلی تو ایک رکشہ کھڑی تھی میں نے وہ لی اور اپنے گھر پہنچ گئی۔"

"مگر گھر کا پتہ کیسے بتایا آپ نے؟"

"وہ تو خیر مجھے نمبر بھی یاد تھا مگر میں نے پی۔ اے۔ ایف اسکول کا کہہ دیا، اس کے پاس ہی تو ہے گھر۔
ایں پہنچ کر میں نے رکشہ والے سے کہا کہ "بھیا! میرے پاس پیسے نہیں ہیں اندر سے بھجوائے دیتی ہوں
، بولا کوئی بات نہیں اماں۔"

"اماں کہا یا بیٹی؟ آپ کو ہر قصے میں دیکھ کر آج تک تو کسی نے اماں کہا نہیں۔"

پھوپی مسکرائیں "میں نے کراچی اسٹیشن پر ہی نقاب اُلٹ دی تھی کہ لوگ میرے سفید بال دیکھ
ں اور مجھے بچی نہ سمجھیں اور میں نے چپکے سے اپنی چوڑیاں اُتار دوپٹے کے پلّو میں باندھ بغل میں داب
لی تھیں۔ اماں کہا کرتی تھیں چور اُچکوں کو سونے کا بڑا لالچ ہووے ہے۔" اس وقت ان کے چہرے پر
فتح کی وہ سرخی تھی جو کسی جرنل کے چہرے پر کوئی بڑی جنگ جیتنے کے بعد ہوتی ہوگی۔

"ہُرّا۔ چھوٹی پھوپی! ہپ ہپ ہُرّا۔" ہم لوگوں کے نعروں نے ہمیشہ کی طرح گھر سر پر اُٹھا لیا اور
ہمیشہ کی طرح خوب ڈانٹ کھائی۔

اور پھر اس دن ہمیں پتہ چلا کہ پھوپی نہ اتنی بے وقوف تھیں نہ اتنی ڈرپوک جتنا ہم نے انھیں سمجھ رکھا تھا۔ ساری عمر وہ اس جوکر کا پارٹ ادا کرتی رہیں جسے منہ پر بھبوت ملے، جھولا سے کپڑے پہنے، بڑا سا جوتا پھٹپھٹاتے دیکھیں تو مزا نہیں آتا۔ وہ پتے اس لئے بھول جاتی تھیں کہ سب نے طے کر رکھا تھا وہ پتے یاد ہی نہیں رکھ سکتیں۔ وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ اس لئے نہیں جا سکتی تھیں کہ ہم نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ وہ تنہا کہیں آجا سکتی ہیں۔ ہم نے بغیر آزمائے انھیں ایک چھوٹا سا بچہ سمجھ لیا تھا اور وہ بخوبی اپنا کردار نبھا رہی تھیں۔ وہ وہی کرتی تھیں جس کی توقع ان سے کی جاتی تھی اور ان ہی پر کیا موقوف ہے ہماری اکثر بڑی بوڑھیوں کے ساتھ یہی رویہ رکھا جاتا تھا۔ یہ طے شدہ امر تھا کہ وہ بھائی یا شوہر کے بغیر آجا نہیں سکتیں، کوئی صحیح فیصلہ نہیں کر سکتیں۔ وہ ساری زندگی ہماری چھوٹی پھوپی کی طرح کھوئی رہتی تھیں اور خوش رہتی تھیں کہ انھیں جو پارٹ دیا گیا ہے وہ اسے بخوبی انجام دے رہی ہیں۔

آج عورت نے اپنے آپ کو اس طرح دریافت کر لیا ہے جس طرح پھوپی نے خود کو اس گم ہو جانے والے دن پا لیا تھا، مگر اس کے بعد بھی زندگی کے باقی دن پھوپی نے پہلے ہی کی طرح گزارے جس طرح آج بہت سی عورتیں اپنے آپ کو دریافت کر لینے کے بعد بھی زندگی کے دن مردوں کے تحفظ کے سائے میں، عافیت و آشتی سے گزارنا چاہتی ہیں اور ظاہر نہیں کرتیں کہ انھیں اپنے گھر کا پتہ خوب یاد ہے۔ انھیں خوب معلوم ہے کہ کون سی گاڑی کس وقت چلتی ہے اور کہاں پہنچاتی ہے۔

"یہ کہانی معمولی کہانی نہیں ہے۔ پڑھئے اور سوچئے کہ کیا ہمارے معاشرے نے سماج کے نصف حصے کو پھوپی ہی کی طرح مفلوج اور بے مصرف بنا کر نہیں رکھ دیا ہے انھیں جوکر کا پارٹ ادا کرنے یا بستروں میں خرخر کرنے والی بلیوں میں تبدیل نہیں کر دیا ہے۔ عورتوں کی یہ آزادی جمہوری آزادی کا حصہ ہے۔"

ادارہ


Assert yourself...say Matador!
Matador
SUITINGS & SHIRTINGS

پاکستان سے ایک نئی اردو کہانی

رضیہ فصیح احمد

بارش کا آخری قطرہ

"تو دادا جان پھر اجازت ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں بھئی! آدمی وہ کام کرے جسے وہ دیانت سے کر سکے اور حتی الامکان کمال تک پہنچا سکے۔ جس کام میں یہ دو باتیں نہ ہوں اس سے میں بھاڑ جھونکنے کو بہتر سمجھتا ہوں۔"

دادا کب سے یہی باتیں کئے جاتے تھے مگر میرے اوپر ان کا کچھ ایسا اثر نہ ہوتا تھا خواہ مخواہ کی شاعرانہ باتیں کرتے ہیں۔ آخر اور ہزاروں لاکھوں بھی تو یہی کام کر رہے ہیں۔

"ہاں کرتے ہوں گے۔ مگر ایک سچے اور دیانت دار آدمی کا کیا حال ہوتا ہے، یہ دیکھنا ہو تو کل میرے ساتھ چلنا۔"

دوسرے دن میں ان کے ساتھ گیا۔ شہر کی چوڑی سڑک چھوڑ کر ہم اندر کی طرف ایک نسبتہً پتلی اور خستہ حال سڑک پر مڑے جس کے دونوں طرف ٹین کے چھوٹے چھوٹے کیبن یا نیم پختہ دوکانیں تھیں۔ ان ٹین کے کیبنوں میں کوئی سائیکل مرمت کی دوکان تھی، چند ایک بساطی اور پنواڑی تھے ایک آدھ ہیئر کٹنگ سیلون تھا۔ نیم پختہ دوکانوں میں مٹھائی اور گوشت کی دوکانیں بھی تھیں جن میں مکھیوں کی بھیڑ آدمیوں سے ذرا زیادہ تھی۔ جگہ جگہ میلے پانی کی نہریں اور اُبلتے گٹروں کے چشمے تھے۔ دادا نے وہ سڑک بھی چھوڑی اور گھروں کے درمیان ٹیڑھے میڑھے راستوں پر مڑتے آگے بڑھنے لگے۔ خدا معلوم دادا کو کیسے اس جگہ کا راستہ یاد تھا۔ مجھے تو سب جگہ ایک سے کیبن، ایک سے گھر، ایک سی جھگیاں ایک سے ننگ دھڑنگ بچے اور ایک سی کالی دُبلی عورتیں چلتی پھرتی نظر آ رہی تھیں۔ دادا کھڑے ٹھیلوں، بڑی بڑی حیران آنکھوں والی گایوں اور بکری کی جگہ جگہ بکھری مینگنیوں سے بڑی مہارت سے بچتے چلے جا رہے تھے اور میں ان کے نقشِ قدم پر پاؤں

دھرتا چلا جارہا تھا۔ آخرکار دادا ایک گھر کے سامنے جا ٹھہرے جس کی دیوار پر بڑا بڑا لکھا ہوا تھا "گلشن کرکٹ کلب" اصل میں یہ کلب کی عمارت نہیں تھی۔ کیونکہ اس کلب کی عمارت کا کہیں وجود ہی نہ تھا۔ اس کے کلب کے جملہ ممبران اس وقت سامنے کے پتھریلے میدان میں کرکٹ کھیلنے میں مصروف تھے۔ دادا کے پکارنے پر ایک لڑکا کھیل چھوڑ بلّا ہاتھ میں لئے بھاگا ہوا آیا۔

"تمہارے نانا ہیں؟" دادا نے پوچھا۔

"جی ہاں"

"جاکر بتا ناکہ عبدالصمد آئے ہیں۔"

ذرا دیر میں پردہ ہوگیا اور وہ لڑکا ہمیں گھر میں لے گیا۔ پہلے ایک کچا صحن آیا جس کی الگنی پر بے شمار کپڑے پڑے ہوئے تھے اور ادھر اُدھر چارپائیوں، مونڈھوں اور پیڑھیوں کی افراط تھی اس کے بعد ایک مختصر برآمدے سے گزار کر وہ ایک بڑے کمرے میں لے گیا جو بہ یک وقت ڈرائنگ روم، کھانے کا اور سونے کا کمرہ تھا۔ اس کے آگے ایک چھوٹی سی سبز جافری لگی ایک جگہ تھی۔ جہاں ہمیں چھوڑ کر وہ ایسا بھاگا کہ پلٹ کر نہ دیکھا۔ اس لئے کہ سارا کرکٹ کلب اس وقت باہر کھڑا اس کا انتظار کررہا تھا۔ کھری چارپائی پر ایک ادھیڑ عمر کے کھچڑی سے بزرگ دنیا ومافیہا سے بے نیاز بیٹھے تھے۔

"سلام علیکم بھائی جلال! کیا حال ہیں؟" دادا نے خاصی گرمجوشی سے کہا۔ انھوں نے نظر اٹھاکر دادا کی طرف دیکھا۔ لمحہ بھر توقف کے بعد کہا۔

"آپ تو میری بیٹی کا سراغ لگانے گئے تھے نا، کچھ پتہ چلا؟"

دادا نے مجرموں کی طرح سر جھکا کر مغموم لہجے میں کہا "نہیں۔"

"تو پھر کیا ضرورت تھی آنے کی...... دیکھ لی آپ کی دوستی۔" ان کے لہجے میں درشتی صاف ظاہر تھی۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد دادا بولے "یہ میرا پوتا ہے، اخبار میں جانے کو کہتا ہے۔"

"کہاں جانے کو کہتا ہے؟"

"کہتا ہے جرنلسٹ بنوں گا، اخبار میں کام کروں گا۔"

"اس سے کہو کولہو میں جُت جائے، تیل نکالا کرے.... ہزار درجے بہتر ہے۔ آخر تیل تو خالص نکلے گا نا۔ سرسوں خالص ہوگی تو تیل بھی خالص ہی نکلے گا کیوں بھائی؟"

"جی صحیح ارشاد کیا آپ نے۔" دادا نے سعادت مندی سے کہا۔

"اور ہماری بیٹی کا کہیں پتہ نہیں چلا اب تک ؟"

"جی نہیں۔"

"مرگئی ہوگی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دفن کر دیا ہوگا کسی بدبخت نے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کیا خبر دفن بھی کیا، یونہی پڑی رہی ہو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لیر لیر ہوگئے ہوں گے اس کے کپڑے۔ اس کے کالے بالوں میں مٹی بھر گئی ہوگی۔ ہیں بھائی! کیسی خوب صورت دلہن بنی تھی وہ۔ انصاف سے کہنا لاکھوں میں ایک لگ رہی تھی کہ نہیں ؟"

"بے شک!" دادا نے پھر گردن جھکالی۔ جیسے ان کی بیٹی کے اغوا میں دادا کا ہی ہاتھ ہو۔

"کیسے سج رہے تھے سرخ کپڑے اس پر۔ کیسا خوب صورت زیور پہنا تھا اس نے، بالوں میں افشاں تھی اور آنکھوں میں کاجل تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پھر کیا ہوا تھا بھائی صمد! اس کے شوہر نے تو اس کی شکل تک نہیں دیکھی تھی، چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور پھر سب نے کیسے اس کے پتھر مارے تھے، کیسا اسے لہولہان کر دیا تھا۔ اس بے چاری کا کیا قصور تھا جو ایسا سنگسار کیا ان لوگوں نے۔ ان ہی لوگوں نے جنھوں نے اسے دلہن بنایا تھا۔ میں اس کی وہ معصوم صورت نہیں بھول سکتا بھائی صمد۔ کیسی ٹکر ٹکر دیکھ رہی تھی ہماری طرف۔ اس کے زخموں سے خون رس رہا تھا، افشاں جھڑ گئی تھی، کاجل بہہ گیا تھا۔ مجھ سے اس کی یہ درگت نہیں دیکھی گئی۔ میں اسے بچانے بھاگا تو مجھے پکڑ کر جیل میں ڈال دیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جیل میں ڈال دیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور پھر نہ جانے میری بچی کہاں چلی گئی، کدھر نکل گئی۔ ۔ ۔ ۔ آپ نے بھی اسے پناہ نہ دی بھائی صمد؟ دیکھ لی آپ کی دوستی۔"

وہ پھر خاموش ہو گئے اور اپنے خیالوں میں کھو گئے۔ دادا سر جھکا کر بھرنا دم سے بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد وہ پھر بولے "لوگ کہتے ہیں اب اس کی تلاش فضول ہے۔ اس نے خودکشی کر لی، حرام موت مرگئی۔" آپ حرام موت کس کو کہتے ہیں ؟ آپ جسے خودکشی کہتے ہیں میں اسے بھی قتل کہتا ہوں۔ کوئی انسان خود کو نہیں مار سکتا وہ کوئی اور ہوتا ہے جو اسے مارتا ہے۔ زمانے کے تازیانے، بھوک کے کوڑے یا کوئی اور جسمانی یا ذہنی آزار پہلے زندگی کے دروازے چاروں طرف سے بند کر دیتے ہیں پھر اگر کوئی چپ چاپ موت کے کنویں میں اُترنے لگے تو اس کو پکڑ لیتے ہیں اور کہتے ہیں یہ حرام موت مرنے جا رہا تھا۔ اور اگر مر جائے تو کہتے ہیں اس نے خودکشی کر لی، حرام موت مر گیا۔ یہ نہیں کہتے کہ اسے قتل کر دیا سنگسار کر دیا۔ کیسی ظالم دنیا ہے یہ!!!"

وہ پھر گم سم اپنے خیالوں میں کھو گئے جیسے ہم وہاں موجود ہی نہ ہوں۔ میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ یہ دادا کس پاگل کے پاس مجھے لے آئے ہیں۔ اگر ان کی بیٹی کھو گئی تو ہم کیا کریں اور اگر اس میں دادا کا بھی کچھ قصور ہے تو پھر میں کیا کروں۔

"آؤ چلیں۔" دادا اٹھ کھڑے ہوئے۔ "اب اجازت دیں بھائی جلال۔"

"خدا کی پناہ میں۔" انھوں نے اسی طرح بیٹھے بیٹھے کہا "دیکھو اس کی کھوج سے غافل نہ رہنا۔ لوگوں کو بکنے دو۔ میرا دل کہتا ہے وہ مری نہیں ہے۔ ایک دن اسے ضرور میرے پاس لے کر آنا ورنہ قیامت میں تم سب کا گریبان پکڑوں گا۔"

"خدا حافظ۔" دادا سر جھکائے چلے۔ پیچھے میں حیران اور پریشان۔ بڑے کمرے سے نکل رہے تھے کہ سات آٹھ سال کا ایک لڑکا چھوٹی سی ٹرے میں شربت کے دو گلاس لئے چلا آرہا تھا۔ اس نے وہیں ہمیں پیش کر دیے۔ ہم نے انکار کیا اس نے اصرار کیا۔ آخر کار وہیں کھڑے کھڑے وہ شربت زہر مار کیا اور باہر نکل آئے۔ پھر وہی راستے طے کرنا پڑا۔ اتنی جگہ نہیں تھی کہ ہم دونوں ساتھ ساتھ چل سکتے اس لئے دادا آگے آگے چل رہے تھے اور میں پیچھے پیچھے۔ اب میں نے دیکھا گلشن کرکٹ کلب کی اگلی دیوار پر "آفتاب فٹ بال کلب" تھا جس کے سائے میں چند لڑکے فٹ بال کھیلنے کے بہانے دھول اڑا رہے تھے۔ اس کے آگے "مہتاب باسکٹ بال کلب" تھا۔ ان سب کلبوں کے درمیان سے نکلتے، پانی کی چھوٹی چھوٹی گندی لہروں سے بچتے اور ننگے بچوں کو تکتے ہم پھر اسی کھنڈر والی سڑک پر نکل آئے۔

"دیکھا تم نے؟" دادا نے پلٹ کر مجھ سے پوچھا۔

"جی دیکھا۔" میں نے کہا۔

"کیا سمجھے؟"

"کچھ بھی نہیں سمجھا۔"

"بھائی جلال ایک زمانے میں بڑے جرنلسٹ تھے۔ انھوں نے آزادیٔ اظہار کی تحریک چلائی تھی۔ کئی سال پہلے کی بات ہے۔ انھوں نے بڑا لمبا جلوس نکالا تھا اور بڑی جوشیلی تقریر کی تھی اور تمام لوگوں سے حلف لیا تھا کہ آئندہ صرف وہ لکھیں گے جو خود صحیح سمجھیں گے۔ اس دن اخبار نویسوں کا جوش و خروش دیکھنے کے قابل تھا۔ لگتا تھا جیسے حاجیوں کا ہجوم ہو جو حج کر کے لوٹ رہا ہو اور انھیں یقین

ہو کہ پچھلے سارے گناہ معاف ہو گئے ہیں اور اب وہ دوبارہ بچوں کی طرح معصوم ہو گئے ہیں۔ ہر ایک بڑھ بڑھ کر بول رہا تھا اور لگتا تھا کہ واقعی ہر شخص پچھلی خطاؤں کی تلافی پر اُدھار کھائے بیٹھا ہے۔ اس رات ہوم جرنلسٹ کے گھر میں رات گئے تک چراغ جلتا رہا اور ہر ایک نے پوری دیانت داری اور سچائی سے صورت حال کا جائزہ لے کر اپنے دل کی بات برسوں بعد اور بہت سوں نے شاید زندگی میں پہلی مرتبہ لکھی ـــــ مگر ان میں سے کوئی بھی چیز اخبار کی روشنائی اور دن کا اجالا نہ دیکھ سکی۔ رات ہی کو آنے والے ایک زبردست ڈائرکٹ نے ان سب کو بے موت مار دیا۔ مگر بھائی جلال نے اپنے اخبار کا وہ اداریہ جوں کا توں چھاپ دیا جو رات کو لکھا تھا اور اس کی پاداش میں انھیں دس سال قید بامشقت کی سزا دی گئی۔ وہ جو اس امید میں بارش کا پہلا قطرہ بن کر اوپر سے گرا تھا کہ پچھلے قطروں کا ایک سمندر ہو گا بارش کا آخری قطرہ بن کر جلتی ریت میں جذب ہو گیا۔ آدرش بڑی چیز ہے مگر تنہائی بڑی مہیب چیز ہے۔ چاہے آپ کال کوٹھری میں تنہا ہوں مگر یہ احساس کہ آپ لوگوں کے ذہنوں میں موجود ہیں، کچھ سر پھرے ہیں جو آپ کے نقش قدم پر چل رہے ہیں یا چلنے کو تیار ہیں۔ اس یقین کے بغیر پہل کرنے والا صرف "پیغمبر" ہی ہو سکتا ہے اور بھائی جلال پیغمبر نہیں تھے۔ وہ یہ تنہائی برداشت نہ کر سکے جیل ہی میں ان کا دماغ خراب ہو گیا اور انھیں وقت سے پہلے چھوڑ دیا گیا۔

"مگر وہ تو پورے وقت اپنی لڑکی کا رونا روتے رہے۔"

"ان کی کوئی لڑکی کبھی تھی ہی نہیں۔"

"اچھا!" میں حیران ہوا۔

"ارے میاں تم سمجھے نہیں۔ یہ تو اسی آزادی بٹیا کا ماتم کرتے رہتے ہیں جسے انھوں نے دلہن بنایا تھا، جس کے شوہر "اظہار" نے اس کا منہ بھی نہیں دیکھا اور جسے لوگوں نے سنگسار کر دیا جب بھی میں جاتا ہوں مجھے یہی طعنہ دیتے ہیں کہ میں ان کی بیٹی کو نہ بچا سکا۔ تب ہی سے میں نے بھی اس پیشے کو خیرباد کہہ دیا۔ اس سے تو پولٹری اچھی، ماہی گیری بھلی یا پھر لوہار اور بڑھئی کا کام اچھا کہ انسان صرف اپنی مرضی کا تابع ہے۔ میں ایک بڑھئی کو جانتا ہوں جو ایک ایک ڈوئی پر اتنی محنت کرتا ہے جتنا کوئی مصور اپنی تصویر پر کرتا ہے۔ بھئی اگر صحیح معنی میں کوئی کمہار ہے تو وہ اس وقت تک چاک سے برتن جدا نہیں کرتا جب تک اس کا دل مطمئن نہ ہو جائے۔ درزی ایک ایک ٹانکا

اپنی مرضی سے لیتا ہے۔ فرض کرو کوئی ایسا قانون نکلے جس میں کہا جائے کہ کمہار صراحی بنا سکتے ہیں مگر اس کی گردن چھ انچ سے زیادہ نہیں رکھ سکتے یا ہانڈی صرف اس ناپ کی بنائی جا سکتی ہے جو ہم بتائیں تو تم ہی کہو کہ کوئی سچا کمہار سارے برتن بھانڈے چھوڑ کر جنگل میں نہیں جائے گا۔ اگر کسی مالی کو پابند کر دیا جائے کہ تم صرف یہ یہ پھول یہاں لگا سکتے ہو تو وہ بھی یہ پابندی برداشت نہیں کریگا۔"

"دادا لوہار ہو یا بڑھئی یا کمہار سب کو وہی چیز بنانی پڑتی ہے جس کی مانگ ہو، جو دنیا چاہتی ہو۔ مٹی کی یا کاٹھ کی گڑیاں ہی بناتے رہے تو کون خریدے گا؟"

"بابا یہ تو ہنر ہنر کی بات ہے۔ تم میری بات مانو نہ مانو، اگر آدمی کے ہاتھ میں سچا ہنر ہو تو وہ اپنی مرضی کی چیز بناتا ہے اور بیچتا ہے، نہیں تو دوسروں کی مرضی کی۔ فن کار اور کاریگر میں یہی تو فرق ہے ایک بڑھئی اور چمار بھی آرٹسٹ ہو سکتا ہے اور ایک آرٹسٹ بھی بڑھئی اور چمار ہو سکتا ہے۔ جو اچھی چیز، نئی چیز خونِ جگر سے بنائے وہ آرٹسٹ ہے اور جو لوگوں کی اور وقت کی مانگ پوری کرے وہ بڑھئی اور چمار ہے۔ اور جس پیشے میں تم جانا چاہتے ہو جب وہ بڑھئی اور چمار کے پیشے سے بھی گیا گزرا ہوا تو اس میں جانا کوئی فخر کی بات تو نہیں۔ اگر آرٹسٹ نہیں بن سکتے تو آرٹیسن ہی بن جاؤ۔ لاکھوں لوگوں کی پسند کی چیز بناؤ گے تب بھی کچھ تو ذہن کو کھل کھیلنے کا موقع ملے گا۔ کھلونے ہی بنانا شروع کر دو۔ کھلونے بنانا، کھلونا بننے سے تو بہتر ہے۔"

یہ غیر معمولی کہانی جو یقیناً ہمارے دور کی عہد آفریں آواز ہے 'عصری ادب' فخر کے ساتھ شائع کرتا ہے۔ اس کہانی کی لطیف رمزیت، گہری دردمندی اور بصیرت اردو افسانے میں ایک نئی جہت کا اضافہ کرتی ہے۔ اسے دوبار پڑھئے اور حسن کاری اور بصیرت آفرینی کی داد دیجئے۔

ادارہ

پاکستان سے نئی اردو کہانی

تیسری آنکھ

علی حیدر ملک

میں نے اسے حیرت کے زاویئے سے دیکھا۔ وہ کوئی اور نہیں میری اپنی بیوی تھی۔

"میں اپنے کنوارے جسم کی قسم کھاکر کہتی ہوں ......"

رِاہباؤں کی سی سنجیدہ یہ آواز اس عورت کی تھی جس سے میرا رشتہ ہی اِزار بند کا ہے اور جو گزشتہ تین سال سے بلاناغہ ہر رات میرے بستر کی ایک ایک شکن کی شریک رہی ہے۔

اپنی بیوی کی یہ بات سن کر میری عقل کے سارے سوتے جیسے مفلوج ہو گئے اور میں بے بسی کے عالم میں بے تحاشہ قہقہے لگانے لگا ـــــ ہاہاہا.... ہاہاہا!

"احمقوں کی طرح قہقہے نہ لگاؤ" اس نے بے شکن لہجے میں کہا اور دونوں ہاتھوں سے کنڈوم اور ڈایافرام کے کئی خالی کئی بھرے پیکٹ میرے چہرے کی طرف اُچھال دیئے۔ تب میری دونوں آنکھیں ندامت کے پانی سے بھیگ بھیگ کر مُندنے لگیں اور تیسری آنکھ آہستہ آہستہ کھلنے لگی لیکن قبل اس کے کہ یہ پوری طرح کھل پاتی، دروازے پر بڑی بے چین سی دستک ہونے لگی میں نے دروازے کے دونوں پٹ کھول دیئے۔ دستک دینے والا شخص بے دھڑک اندر آ گیا۔

"میرے ساتھ چلو۔ میں تمہیں لینے آیا ہوں۔" اُس نے کہا۔

"لیکن کہاں؟"

"یہ تمہیں ابھی معلوم ہو جائے گا۔"

"آخر کیوں؟"

"تم اس سے بھی واقف ہو جاؤ گے۔"

پھر وہ میرا ہاتھ پکڑ کر چلنے لگا۔ چلتے چلتے ہم ایک محل نما عمارت کے قریب پہنچ گئے۔ یہ ایک حسین اور فلک بوس عمارت تھی جس کے چاروں طرف محل کی دیواروں سے بھی اونچا سنگی حصار کھنچا ہوا تھا۔ اس سنگی حصار کے گرد مسلح اور چاق و چوبند سپاہیوں کی ایک فصیل کھڑی تھی۔

مجھے اُس شخص نے محل کے اندر ایک بہت بڑے کمرے میں لے جا کر کھڑا کر دیا۔ میں نے اپنی نگاہیں اٹھا کر دیکھا۔ ایک بہت بڑی اور اونچی سی کرسی پر ایک نہایت چھوٹا آدمی، کرسی کے ہتھے مضبوطی سے تھامے بیٹھا تھا۔

میرے ساتھ والے آدمی نے کرسی پر بیٹھے ہوئے آدمی کے سامنے دست بستہ کھڑے ہو کر کہا۔

"ظل سبحانی، حاکم جاودانی ـــــ سلطان عالم، معمار اعظم ـــــ فرشتہ عنایات، عقل کائنات..."

وہ اسی طرح دہلانے کیا کیا کہتا رہا لیکن میں یہ الفاظ یاد نہ رکھ سکا کیونکہ ان میں سے بیش تر میرے لیے قطعی اجنبی تھے۔ لفظوں کی برات رکی تو اس شخص نے گہری سانس لی اور پھر ذرا دم لے کر بولا "فردہ ہو کر یہ شخص اپنی ان دیکھی نسل کے بوجھ سے بیزار ہے اور خوش و خرم زندگی گزار رہا ہے جس کا ثبوت یہ ہے کہ آج یہ قہقہہ لگاتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ہے۔"

"بہت خوب ـــــ بہت خوب ـــــ" حاکم شہر کے چھوٹے سے سر پر رکھے ہوئے بڑے سے تاج میں لرزش پیدا ہوئی "اے میری خوش حال قوم کے زندہ دل فرزند! ما بدولت تجھ سے بہت خوش ہوئے ـــــ مانگ تو کیا مانگتا ہے؟"

"میرے مہربان آقا! بندہ جان کی امان کے بعد ایک سوال کا جواب چاہتا ہے۔"

"بولو ـــــ" پورا ایوان نرم دل آقا کی کرخت آواز سے لرزنے لگا۔

"سوال یہ ہے کہ میری ذاتی اور نجی باتوں کا علم اس آدمی کو کیسے ہوا؟"

سورج مکھی کی مانند اس شخص نے جو مجھے اپنے ساتھ لایا تھا، حاکم شہر کی طرف دیکھا

"اس سوال کا جواب دیا جائے ـــــ" حاکم نے حکم صادر کیا۔

"اے میرے عزیز ہم وطن! تو نے سنا ہوگا کہ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں ظل سبحانی نے شہر کی تمام دیواروں میں سچ مچ کے کان اور آنکھیں لگوا دی ہیں تا کہ رعایا کی خبر گیری کی جا سکے تمہیں اس بات کے لیے حضور پُر نور کا ممنون ہونا چاہیئے کیونکہ اسی میں تمہارا اور تمہاری قوم کا مفاد ہے سو میں نے اپنے اور اپنی قوم کے مفاد میں سر تسلیم خم کر دیا۔ اس کے عوض میری بھاری تنخواہ

مقرر کی گئی اور مجھے یہ کام سونپا گیا کہ میں شہر کے ہر محلے ہر چوراہے پر کھڑا ہو کر دن بھر قہقہوں کی بارش کرتا رہوں تاکہ ان نافرمان باغیوں کا منہ بند کیا جا سکے۔ وہ کہتے تھے کہ ایک بڑی نحوست ہم پر مسلط ہو گئی ہے جس نے ہمارے لبوں سے ہماری مسکراہٹیں چھین لی ہیں۔ شہر کے لوگ ہنسنا بھول گئے ہیں اور بچے اس لفظ سے قطعاً ناآشنا ہیں۔

میں اس الزام کو جھوٹا ثابت کرنے کے لئے ہر موڑ، ہر چوراہے پر قہقہے انڈیلنے لگا۔ لوگ تعجب سے مجھے دیکھتے اور ہمدردی کی سوئیاں میرے وجود میں چبھو کر آگے بڑھ جاتے جیسے میں کوئی پاگل ہوں۔ ایک دن ایک بچے کو حیرت سے اپنی طرف تکتے ہوئے دیکھ کر ہنستے ہنستے اچانک میری آنکھوں سے آنسو ابل پڑے اور میں رونے لگا۔ حاکم شہر کو اس کی خبر ہو گئی اور اس نے دربار میں بلا کر مجھ سے کیفیت طلب کی۔

"کیا تم باغیوں سے مل گئے ہو؟ صاف صاف بتاؤ ورنہ۔۔۔۔"

"بندہ پرور! آپ کو یہ گمان کیسے ہوا کہ آپ کا یہ غلام نمک کا ذائقہ بھول سکتا ہے؟"

"تو کیا یہ غلط ہے کہ قہقہوں کی بجائے سرِ بازار تمہاری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے؟"

"حضورِ عالی! یہ بالکل سچ ہے۔ لیکن وہ خوشی کے آنسو تھے۔ انسان جب حد سے زیادہ خوش ہوتا ہے تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔"

میری یہ بات حاکم کے دل کو لگی اور اس نے میری دانش مندی سے متاثر ہو کر مجھے اپنا مشیر خاص مقرر کر لیا۔ اب میرے سپرد یہ کام ہوا کہ میں شہریوں کے لئے معلومات اور تفریح کا سامان فراہم کروں۔

سو میں نے ہر گھر میں ایک شیشے کا گھر مہیا کر دیا جس کے پردے پر سجیلی البیلی عورتیں جب اپنے شیشے جیسے شفاف اور چمکتے ہوئے جسم کے ساتھ نمودار ہوتیں تو دیکھنے والے اپنا دل تھام کر سسکاریاں بھرنے لگتے۔

ہوا کے دوش پر گھر گھر پہنچنے والی آوازیں کانوں سے ہوتی ہوئی ناف کے نیچے تک جسم کی ہر رگ کو چھیڑتیں ورغلاتیں۔

کورے کاغذ کا سینہ رنگ برنگ کے ناپاک لفظوں کی سلاخوں سے داغ داغ کر جھوٹ کے بے لباس ہرکارے ہر طرف دوڑا دیئے گئے۔

شہاب شہر نہیں رہا بلکہ ایک آوارہ کشتی اور ایک منزل رو جستجو کی علامت میں ڈھل گیا تھا۔
ہر فرد کو راشن کے ساتھ وہ جھلیاں بھی مفت تقسیم کی جارہی تھیں جو ماں کی کوکھ کی خدمت انجام دے کر گمراہوں کے نشان مٹاتی اور انسان کا بوجھ کم کرتی تھیں۔ شرپسند باغیوں کی کسی بات کا اثر اب لوگوں پر نہیں ہورہا تھا۔
حاکم شہر ہر طرح مطمئن و مسرور تھا۔ لیکن میرے اپنے ہی منصوبے کے مطابق جب شیشے کا گھر روشن ہوتا یا ہوا کے دوش پر سفر کرنے والی آوازیں میرے کانوں پر دستک دیتیں یا اُجلے کاغذ کا داغ داغ سینہ نظروں کے سامنے آتا تو میرے پورے جسم میں ایک انجانے خوف کا سیّال گردش کرنے لگتا اور میرے ہونٹوں پر ایک دعا ایک فریاد تڑپنے لگتی۔
"اے سیارہ! اے سیتا!! اے مریم!!! تمہیں تمہاری پاکدامنی کی قسم۔ ہماری ماؤں بہنوں اور بیٹیوں کی آبرو رکھنا......"
لیکن ایک دن جب میں اپنے فرائض انجام دے کر گھر واپس آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ میری بیوی گھر سے غائب ہے ——— اور سنگھار میز پر رکھی ہوئی میری تصویر رنگ رنگ کی بجلی جھلیوں میں ڈوبی ہوئی ہے۔
دُکھ اور تاسف کے بوجھ سے میری دونوں آنکھیں مُندنے لگیں ——— مگر ٹھیک اسی سمے تیسری آنکھ کے دریچے جیسے اچانک روشن ہو گئے۔

انتظار حسین

پتّے

اگلے دن وہ پھر اسی گلی میں گیا اور اسی دوارے کھٹکھٹایا۔ پھر وہی کومل پیروں والی ڈیوڑھی پہ اور پھر اس نے نیچی نظروں کے ساتھ بھکشا پاتر آگے کر دیا اور بھکشا لے کے چلا گیا۔ یہی اُس کا نیم تھا کتنی ڈیوڑھیوں سے کتنی ناریوں کے ہاتھوں سے اس نے بھکشا لی تھی مگر کبھی نظر اٹھا کے کسی کو نہیں دیکھا اس نے جان لیا تھا کہ پنج اندریوں میں آنکھ سب سے زیادہ پاپی ہے۔ جو دکھائی دیتا ہے وہ سب مایا کا جال ہے۔ دیکھنے والا مایا کے جال میں پھنستا ہے اور دکھ اٹھاتا ہے سو آنکھ دکھ دیتی ہے۔ سو مت دیکھو اور مت پھنسو اور مت دکھ اٹھاؤ۔ سو وہ نہیں دیکھتا کہ بھکشا کس ہاتھ سے مل رہی ہے۔ سو اس نے یہاں بھی نہیں دیکھا کہ بھکشا دینے والی کون ہے، کیسی اس کی مورت ہے۔ بس اُجلے کومل پیر اس کی جھکی نظروں کے سامنے پل بھر کے لئے آتے اور اوجھل ہو جاتے۔ وہ اس ڈیوڑھی پہ ایک دن آیا، دو دن آیا اور آتا چلا گیا کہ بھکشا اس ڈیوڑھی سے بہت شردھا کے ساتھ ملتی تھی۔

وسنت پنچمی کا دن تھا۔ گلی گلی، دوارے دوارے پیلی ساڑھیاں لہرا رہی تھیں مانو سرسوں کھیتوں میں نہیں گلیوں میں پھولی ہے اور گیندا کیاریوں میں نہیں ڈیوڑھیوں میں مہکا ہے۔ اس نے آج پھر اسی دوارے جا کے سانکل بجائی اور پھر کومل پیروں والی ڈیوڑھی پہ آئی۔ پر آج ان پیروں میں مہندی لگی تھی۔ اس نے جھکی نظروں سے ان پیروں کو دیکھا اور اچنبھا کیا کہ گورے پیروں میں مہندی کیسی رچتی ہے اور پیر کیا سے کیا بن جاتے ہیں۔ وہ اچنبھے سے مہندی رچے گورے کومل پیروں کو تکنے لگا۔ یہ دھیان نہ رہا کہ اسے بھکشا بھی لینی ہے۔

"بھکشو جی! جلدی کرو، تیوہار کا دن ہے۔" اور اس آواز کے ساتھ کہ یہ آواز آج اس نے پہلی بار سنی تھی۔ بھکشا پاتر کے ساتھ ساتھ اس کی نظریں بھی اٹھ گئیں۔ اور پھر اٹھی ہی رہ گئیں۔ کیا موہنی مورت تھی۔ مکھ چندرما جیسا، بال گھٹا سے، آنکھیں مرگ کی سی، گردن مورنی کی سی، چھاتیاں ناشپاتیاں، گال بھرے بھرے، کمر پتلی پتلی، ساڑھی بسنتی، ماتھے پہ لال بندی۔ وہ سدھ بدھ کھوئے ٹکٹکی

باندھ لانے لگا۔ وہ سندری ایسی ہڑبڑائی کہ بھوجن سے بھری تھالی ہاتھ سے گر پڑی۔

سنجے اس شبھ دن خالی پاتر کے ساتھ اپنے استھان پر واپس آیا۔ من کو ایک چنتا لگ گئی تھی۔ کیا مجھ موئے نے اگھ کیا ہے۔ بہت وچار کیا، کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ جیسے اس کی مت ماری گئی ہو۔ آنند کے پاس پہنچا اور بولا کہ "پربھو! میں بیاکل ہوں۔"

آنند نے اسے دیکھا جیسے تول رہا ہو "کارن؟"

"ناری۔"

"ناری؟"

"ہاں ناری۔" اور سنجے نے اپنی ساری بپتا کہہ سنائی۔

آنند پوری شانتی کے ساتھ آنکھیں کھولے اس کی بپتا سنتا رہا۔ پھر اس نے آنکھیں موند لیں۔ آنکھیں موندے چپ بیٹھا رہا۔ پھر آنکھیں کھولیں اور بولا "بندھو! گلیاں اور ڈیوڑھیاں موہ کا جال ہیں۔ بھکشوؤں کا نیم یہ ہے کہ وہ گلیوں میں رکتے نہیں اور ڈیوڑھیوں میں ٹھہرا نہیں کرتے۔ گلی گلی، دوارے دوارے پھرتے ہیں۔ بھکشا آج یہاں سے کل وہاں سے۔ پر مورکھ تو نے اس نیم کا پالن نہیں کیا۔ تو نے وہی کیا جو سندر سمدر نے کیا تھا۔"

"سندر سمدر نے کیا کیا تھا؟"

"تو نہیں جانتا کہ سندر سمدر نے کیا کیا تھا؟"

"نہیں پربھو! میں نہیں جانتا کہ سندر سمدر نے کیا کیا تھا۔"

تب آنند نے سنجے کو سندر سمدر کی کہانی سنائی۔

سندر سمدر کی کہانی

جنم اشٹمی کا دن تھا۔ سہانی رت منگل سمے، بھادوں کی رم جھم ہو رہی تھی۔ ایک حویلی میں ایک بڈھا بڑھیا دھاروں دھار رو رہے تھے۔ ایک کنہلی ادھر سے گزری تو اس نے اچرج کیا۔ "ہے دکھیارو! تم پر کیا بپتا پڑی ہے کہ آج جنم اشٹمی کے دن جب ہر نر ناری، بوڑھا بالک آنند منا تا ہے تم آنسوؤں کی گنگا جمنا بہا رہے ہو۔"

وہ دکھ سے بولے "اری ہمارے لئے نہ اب جنم اشٹمی ہے نہ ہولی دیوالی ہے۔ پوت کے

بچھڑنے کا روگ ایسا لگا ہے کہ ہر گھڑی اسے یاد کرتے ہیں اور روتے ہیں۔"
"پوت بچھڑ گیا ؟"
"اری ہمارے ایک ہی تو پوت تھا وہ ہم سے بچھڑ گیا اور ہماری دنیا اندھیر کر گیا۔"
"کیسے بچھڑ گیا؟"
"ایک دن بدھ دیو کا اس نگر سے گزر ہوا۔ ان کے اُپدیش نے اسے ایسا بدلا کہ کہاں تو پیلا بنا پھرتا تھا اور کہاں یہ کہ سر منڈا یا، پیلا بانا پہنا اور شاکیہ مُنی کے پیچھے ہو لیا۔"
"اس پوت کا نام کیا ہے ؟"
"سندر سمدر"
"اچھا میں تمہارے پوت کو واپس لاؤں گی"
"اری تو کیسی بات کرتی ہے۔ شاکیہ مُنی کے سنگھ میں جا کے کون واپس آیا ہے ؟"
کنجنی نے تاؤ کھایا۔ بولی" وہ اپنے سمے کا مُنی ہے تو میں بھی اپنے سمے کی کنجنی ہوں۔"
یہ کہہ وہ وہاں سے چلی۔ شاکیہ مُنی کا آتا پتا لیا کہ ان دنوں کہاں براجتے ہیں اور کس نگر میں ان کے بھکشو بھکشا لینے پہنچتے ہیں۔ اسی نگر پہنچ ایک اونچی حویلی لے وہاں رہ پڑی۔ سندر سمدر روز بھکشا پاتر لے بستی میں پہنچتا کبھی اس گلی میں کبھی اُس گلی میں۔ ایک روز اس گلی میں آیا اور اس اونچی حویلی کی ڈیوڑھی پہ پہنچا۔ وہ کنجنی تو باٹ ہی دیکھ رہی تھی۔ تھال لے کے خود ڈیوڑھی پہ آئی۔ ایسی چترائی سے بات کی اور بھکشا دی کہ سندر سمدر نے اگلے دن پھر اسی گلی کا پھیرا لگایا اور اسی ڈیوڑھی پہ پہنچا۔ پھر وہ اس ڈیوڑھی سے ایسا ہلا کہ دوارے دوارے جانا چھوڑا، روز اس ڈیوڑھی پہ جا کھڑا ہوتا اور بھکشا پاتر بھروا کے لوٹتا۔ ایک دن چترائی سے کہنے لگی کہ "بھکشو جی، تمہارے نیم میں کوئی فرق نہ پڑے تو آج یہیں پدھارو اور بھوجن کرو۔ میں جانوں گی کہ میری کٹیا کو چار چاند لگ گئے۔"
سندر سمدر نے وچار کیا۔ پھر دل میں کہا کہ تتھاگت نے کبھی کسی کو نا نہیں کیا۔ ایک مورکھ نے ان کے سامنے بھوجن کے نام ماس لا کے رکھ دیا۔ اس پہ بھی نا نہیں کہا اور ماس کھا لیا۔ مجھے بھی یہی ریتی اپنانی چاہیئے۔ سو سندر سمدر نے اس دن اسی ڈیوڑھی میں بیٹھ کے بھوجن کیا۔ اس کنجنی نے دوسرے دن بھی بنتی کی اور سندر سمدر نے پھر اس کی اچھا مان لی۔ بس پھر سندر سمدر روز ہی اس ڈیوڑھی میں بیٹھ کے بھوجن کرنے لگا۔

سندر سمدر کو اپنی ڈیوڑھی پہ بلا لینے کے بعد اس کنچنی نے گلی کے بالکوں کو بہلایا پھسلایا اور سکھلایا کہ جب بھکشو جی ڈیوڑھی میں بیٹھ کے بھوجن کریں تو تم گلی میں خوب دنگا کرنا اور دھول مٹی اڑانا۔ میں دکھاوے کے لیے ڈانٹوں ڈپٹوں گی۔ تم بالکل مت ماننا۔ اگلے دن ان بالکوں نے یہی کیا۔ کنچنی نے بالکوں کو ڈانٹا ڈپٹا، مگر انھوں نے ایک کان سنی اور دوسرے کان اڑا دی۔ اگلے دن کنچنی سندر سمدر کے سامنے ہاتھ باندھ کے کھڑی ہو گئی، کہا کہ "پربھو جی! گلی کے بالک بگٹٹ ہیں، گرد مٹی اڑا کے بھوجن کو خراب کرتے ہیں۔ میں بنتی کرتی ہوں کہ آپ اندر آ کے پدھاریں اور بھوجن کریں"

سندر سمدر نے پھر بدھ نیتی کو یاد کیا اور کنچنی کی بات چپ چاپ مان لی۔ اُس دن سے سندر سمدر ڈیوڑھی سے نکل اندر دالان میں بیٹھ کے بھوجن کرنے لگا۔ وہ بھوجن کرتا اور کنچنی اس کی سیوا کرتی۔ سیوا کرتے کرتے چھب دکھلاتی۔ کیا اس کنچنی کی چھب تھی اور کیا روپ تھا۔ صورت سرخ سفید جیسے سیب انار، چٹیا ناگن جیسی، بھویں کمان سی، گول گدرائی چھاتیاں، کمر پتلی، کولھے بھرے بھرے۔ سندر سمدر جب اس کی اور دیکھتا تو جی اس کا ڈولنے لگتا۔

تتھاگت نے اپنے گیان سے جانا کہ ان کا ایک بھکشو کس گت میں ہے۔ ان دنوں تتھاگت نے اپنے پورے سنگھ کے سنگ سراوستی کے باہر اناتھ پنڈکا کے باغ میں باس کیا تھا۔ سب سنگھی اُپدیش سننے کے لیے اکٹھے ہوئے۔ تتھاگت ایک گھنے آم تلے بیر آسن مار کر بیٹھے اور آنکھیں موند لیں۔ کچھ دیر بعد آنکھیں کھولیں، سنگھیوں کو تکا، پھر ان کی گیان بھری نظریں سندر سمدر پہ آ کے ٹھہر گئیں۔ ٹکٹکی باندھ کے اسے دیکھتے رہے۔ پھر بولے "سنگھی! تیرا من کس کارن اُچاٹ ہے؟"

سندر سمدر نے سر جھکا لیا اور رکتے رکتے بولا "ہے تتھاگت، موہ کے کارن۔"

تتھاگت ٹکٹکی باندھے اسے دیکھا کیے۔ پھر بولے "بھکشوؤ! موہ میں دکھ ہے، کامنا آدمی کی دُردشا کرتی ہے۔ کامی آدمیوں سے وہ بندر بھلے جنھوں نے یہ بھید جان کو گرہ میں باندھا اور سُکھ پایا۔"

بھکشوؤں نے پوچھا "ہے تتھاگت! وہ بھلے بندر کون تھے اور کہاں تھے؟"

"کیا تم نے بھلے بندروں کی کہانی سنی ہے؟"

بھلے بندروں کی جاتک

برس برس ہوئے مُنش جاتی سے دور پرے ہمالہ کی تلہٹی میں بندروں کی برادری رہتی تھی۔ ایک بار ایسا ہوا کہ کوئی شکاری ادھر آنکلا۔ اس نے ایک بندر کو جتن کرکے پکڑا اور بنارس جاکے راجہ کو دیدیا۔ اس بندر نے راجہ کی ایسی چاکری کی کہ اس نے پرسن ہو کے اسے آزاد کر دیا۔

وہ بندر لوٹ کے اپنے جنگل پہنچا تو برادری اس کے گرد اکٹھی ہو گئی۔ سب پوچھنے لگے کہ

"بندھو تو اتنے دنوں کہاں رہا؟"

"بندھوؤ! میں منش جاتی کے بیچ رہا۔"

"منش جاتی کے بیچ؟ ...... اچھا؟ ..... پھر بتا کہ تونے اس جاتی کو کیسا پایا؟"

"بندھوو! یہ مت پوچھو۔"

"ہم تو پوچھیں گے۔"

"اچھا یہ بات ہے تو سنو کہ منش جاتی میں بھی نر مادہ ہوتے ہیں جیسے ہمارے بیچ ہوتے ہیں پر ان میں نر کی ٹھوڑی پہ لمبے لمبے بال ہوتے ہیں اور مادہ کی چھاتیاں بڑی بڑی ہوتی ہیں، اتنی بڑی کہ تھل تھل کرتی ہیں۔ تھل تھل چھاتیوں والی ٹھوڑی پہ بال والوں کو موہ میں پھنساتی ہے اور دکھ دیتی ہے۔"

بندروں نے کانوں میں انگلیاں دے لیں۔ چلائے "بندھو، بس کر۔ ہم نے بہت سن لیا۔"

پھر وہ اس ٹیلے سے یہ کہہ کے اٹھ گئے کہ ہم نے یاں بیٹھ کے بُرائی کی بات سنی ہے۔ اب یاں سے اٹھ جانا چاہیئے۔

تتھاگت یہ جاتک سنا کے چپ ہوئے۔ پھر بولے "بھکشوؤ! سنانے والا بندر میں تھا سننے والے بندر وہ تھے جو آج میرے بھکشو ہیں۔"

ایک بھکشو نے اچنبھے سے پوچھا کہ "ہے تتھاگت، ناری مرد کو کیسے دکھ دیتی ہے جب کہ مرد بلوان ہے اور وہ نربل ہے؟"

تتھاگت مسکائے "بھولے بھکشوؤ! ناری نربل ہے تو کیا ہوا، چاتر جو ہوتی ہے اپنی چترائی سے بلوانوں کے بل نکال دیتی ہے۔ کیا تم نے چاتر راجکماری کی جاتک نہیں سنی؟"

"نہیں تھا گت۔"
"تو سنو:"

جاتر راجکماری کی جاتک

بیتے سمے کی بات ہے کہ بنارس میں ایک راجہ تھا جس نے تکشیلا جا کے ودیا حاصل کی۔ بہت ودھوان، بہت بُدھیمان۔ اس کے ایک پُتری تھی۔ یہ سوچ کر کہ پتری خراب نہ ہو جائے وہ اس پر بہت کڑی نظر رکھتا تھا۔ پر ناری کو سات تالوں میں بھی رکھو تو وہ خراب ہو کے رہتی ہے۔ راجہ نے بہت چوکسی کی مگر راجکماری کے نین ایک رسیا سے لڑ گئے۔

نین تو لڑ گئے پر ملنے کی صورت نہیں نکلتی تھی کہ محل میں چوکسی پہرہ بہت تھا۔ رسیا نے اپنی دایہ کو اپنا بھیدی بنایا اور محل میں بھیجا۔ دایہ محل میں جا کے راجکماری کی چاکر بن گئی۔ ساتھ ہی تاک میں رہی کہ موقع ملے تو راجکماری سے بھید کی بات کی جائے۔ ایک دن کی بات ہے کہ وہ بیٹھی راجکماری کے سر میں جوئیں دیکھ رہی تھی۔ جوؤں کو کُریدتے کُریدتے اس نے ناخن سے سر کو کھجایا۔ راجکماری بھی اڑتی چڑیا کو پکڑتی تھی۔ بھانپ لیا کہ دال میں کالا کالا ہے۔ بولی "اری منہ سے پھوٹ کہ اس نے کیا کہا ہے؟"

دایہ نے حوصلہ پکڑا۔ کہا "پوچھتا ہے کیسے ملوں؟"

بولی "یہ کونسی بڑی بات ہے۔ سدھا ہوا ہاتھی، کالی گھٹا، نرم کلائی۔"

دایہ نے راجکماری کا کہا رسیا کو جا سنایا۔ رسیا بھی کھیلا کھایا تھا سب اشارے سمجھ گیا۔ ایک ہاتھی کو سدھایا۔ ایک نرم سے لڑکے کو ہلایا۔ جب ساون کے دن آئے اور کالی گھٹائیں گھر کر آئیں تو رات پڑے ہاتھی پر بیٹھ لڑکے کو ساتھ بٹھا محل کی دیوار تلے جا پہنچا۔ ادھر راجکماری نے راجہ سے کہا کہ مہاراج! کیسی سندر ورشا ہو رہی ہے۔ میں تو اس ورشا میں اشنان کروں گی۔

راجہ نے بہت بہلایا پھر وہ نہ مانی۔ اشنان کے لئے مینہ میں نکلی اور اس منڈیر پر جا بیٹھی جس کے برابر رسیا ہاتھی پر سوار بیٹھا تھا۔ راجہ نے یہاں بھی چوکسی کی۔ اس کے پیچھے پیچھے مینہ میں گیا۔ جب وہ کپڑے اتارنے لگی تو اس نے منہ پھیر لیا پر راجکماری کی کلائی کو پکڑے رہا۔ راجکماری بھی بلا کی بنی ہوئی تھی۔ اس نے انگیا کھولنے کے بہانے کلائی راجہ کے ہاتھ سے چھڑائی۔ پھر گھڑی بھر بعد لڑکے کی

کلائی راجہ کے ہاتھ میں پکڑا دی اور خود منڈیرے سے کود ہاتھی پہ بیٹھ گئی پھر یہ جا وہ جا۔

آدھ پہرے میں راجہ کو کچھ پتہ نہ چلا کہ کیا ہو گیا۔ اور پھر یوں بھی اس نے منہ پھیر رکھا تھا۔ بس اسی طرح منہ پھیرے کلائی پکڑے واپس ہوا۔ راجکماری کی اٹاری میں اسے دھکیل آگے سے سانکل لگا دی۔ جب صبح ہوئی تب پتہ چلا کہ راجکماری تو رسیا کے ساتھ بھاگ گئی۔ راجہ نے ہار کے کہا کہ "ناری کی چوکسی کٹھن کام ہے۔ کلائی پکڑو تو بھی جل دے جاتی ہے۔"

تھاگت جاتک سنانے کے بعد چپ ہوئے۔ پھر بولے "بھکشوؤ! جانتے ہو وہ راجہ کون تھا وہ راجہ میں تھا کہ پچھلے جنم میں راج گدی پر بیٹھا تھا اور ایک میری پتری تھی۔" چپ ہوئے۔ پھر ٹھنڈا سانس بھر کے بولے "میں نے پراکرتی کے بھید جانے پر ناری کے بھید بھاؤ نہیں جان پایا۔"

سندر سمدر جیسے سوتے سے جاگ اٹھا۔ ناری کے چکر کو جانا اور اس چکر سے نکلنے کی ٹھانی۔ من میں کہا کہ آج میں اس ناری سے کہہ دوں گا کہ کل سے میری باٹ نہ دیکھے۔ یہ پرتگیا کر کے وہ اس ڈیوڑھی پہ پہنچا۔ کنچنی نے روز کی طرح اس کی آؤ بھگت کی اور اندر لیجا کے دالان میں بٹھایا۔ پر آج اس کے سکملاتے ہوئے بالکوں نے ڈیوڑھی کے اندر آ کے دھما چوکڑی شروع کر دی۔ اس رنڈی نے پہلے تو بالکوں کو ڈانٹا پھٹکارا، پھر جب وہ نہ مانے تو سندر سمدر سے کہا کہ "بھکشو جی! یہاں یہ بالک رول مچاتے ہیں اور تمہیں ستاتے ہیں۔ اچھا ہو کہ اوپر کوٹھے پہ چل کے بھوجن کرو۔"

سندر سمدر یہ سن کر پہلے تو رکا۔ پھر سوچا کہ لوگ بالک سمان ہیں ان کی اچھا پوری کرنی چاہیئے یہی بدھ نیتی ہے اور یوں بھی آج اس گھر میں میرا آخری بھوجن ہے۔ کل میں کہاں اور یہ گھر کہاں۔ بس یہ سوچ کے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ آگے آگے کنچنی پیچھے پیچھے وہ۔ وہ سیڑھیاں چڑھتا چلا گیا۔ اپنے پیروں پر نظریں جمائے ایک ایک سیڑھی چڑھ رہا تھا۔ اس نے کہاں یہ دھیان دیا کہ آگے کون چل رہا ہے۔ مگر آگے جانے والی کئی بار رک کے کھڑی ہو گئی جیسے وہ تھک گئی ہو اور ہر بار سندر سمدر بے دھیانی میں ایک نرم گرم سائے کے ساتھ چھو گیا۔

سیڑھیاں چڑھ کے کنچنی نے سندر سمدر کو ایک سجی بنی اٹریا میں لے جا کے نرم سیج پہ بٹھلا دیا۔ پھر آپ بھی برابر میں یہ کہہ کے پسر گئی کہ سیڑھیاں چڑھ کے میں تو تھک گئی اور اے مرے منڈھو! ناری کے پاس مرد کو پھسلانے کے چالیس گر ہیں۔ وہ کنچنی ان چالیسوں گروں میں ماہر ہوئی تھی۔ اس نے پہلے تو ایک لمبی انگڑائی لی۔ انگڑائی لیتے ہوئے باہیں کہ ننگی تھیں اوپر اٹھائیں، پھر شرما کے مسکا کے

گرا دیں، پھر ناخن سے ناخن کُھرچنے لگی، پھر دانتوں میں ساڑھی کا پلّو دبا کے لجا گئی۔ بلا کسی کارن کے زور سے ہنسی، پھر ایک دم سے ہاتھوں میں منھ چھپا لیا۔ آپ ہی آپ زور زور سے بولی، پھر ایسے ہولے ہولے بولی جیسے کانا پھوسی کر رہی ہو۔ پہلے دور سمٹ کے بیٹھی، پھر وہ بیسوا بڑھ کے بیٹھ گئی۔ چھاتیوں سے پلّو ڈھلکا یا، پھر اوپر سرکا لیا۔ رانوں سے ساڑھی سرکائی، پھر جلدی سے نیچے کر لی۔ اور ایک بار تو ایسی انگڑائی لی کہ بندھا کھل گیا، پھر وہ جلدی سے سمٹ گئی۔ ایک بار ہونٹ ہونٹوں کے پاس لے آئی، پر پھر شرما کے لجا کے پیچھے ہٹ گئی۔ اور اے مرے بندھو، سندر سمدر تو بالکل موہت ہو گیا بھولا کہ وہ بھکشو ہے اور ناری اس سے چھل کر رہی ہے۔ بس گر یا گیا اور وہ تو پہلے ہی سے گرائی ہوئی تھی۔ اسے گرتا دیکھ کے کھل کھیلی۔ بے حیا نے نہ اپنے بدن پہ کوئی دھجی رہنے دی اور نہ اُس کے تن پہ لتّا رہنے دیا۔ سینہ سے سینہ، رانوں سے رانیں بھڑنے لگی تھیں۔

آنند چپ ہو گیا۔ سنجے تڑپ کے بولا "پھر کیا ہوا؟"

"پھر کیا ہوا؟" آنند ہنسا "تتھاگت بیراسن باندھے آنکھیں موندے بیٹھے تھے۔ انہیں خوب دکھائی دے رہا تھا کہ باغ سے دور شراوستی کی اس اونچی حویلی کی اٹریا میں ناری ایک بھکشو کے ساتھ کیا چھل فریب کر رہی ہے۔ متھن کی نوبت آ گئی تھی، بدن بس گڈمڈ ہونے لگے تھے کہ امی تابھ نے اس اٹریا میں اپنا درس دکھایا۔ سندر سمدر کی بسری سدھ واپس آئی۔ بس کام ندی میں ڈوبتے ڈوبتے باہر نکل آیا۔

آنند کہانی سنا کے چپ ہو گیا۔ ادھر سنجے وچاروں میں ڈوبا ہوا تھا۔ پھر ٹھنڈا سانس بھرا اور کہا کہ وہ کیسا منگل سمے تھا کہ تتھاگت ہمارے بیچ براجتے تھے۔ کوئی اگیانی ناری کے چھل میں آ جاتا تو وہ اسے جوتی دکھلاتے اور ستیہ پتھ پہ لے آتے۔" چپ ہوا، پھر بولا "مجھے ناری کے چھل سے کون بچا رے گا؟"

آنند بولا "ہے سنجے میں تجھ سے وہی کہتا ہوں جو امی تابھ نے مجھ سے کہا تھا کہ آنند تو اب آپ اپنا دیپ بن۔"

سنجے نے یہ سن کر وچار کیا پھر کہا کہ میں آپ اپنا دیپ بنوں گا۔ سو دوسرے دن جب وہ بھکشا پاترے کے بستی کی اور چلا تو پرتگیا کی کہ وہ اس گلی میں نہیں جائے گا۔ پر جب وہ بستی میں داخل ہوا تو اس نے کیا دیکھا کہ یہ راستہ اسی گلی کی اور جا رہا ہے جس رستے پہ چلنے لگا کہ وہ رستہ اسے اسی

گلی میں اسی ڈیوڑھی پر لئے جا رہا ہے۔ وہ ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔ پھیلی ہوئی شراوستی آج کتنی سمٹ گئی تھی۔ اس نگر کی ایک ایک گلی اس کی گھوندی ہوئی تھی۔ ہر گلی کی ہر ڈیوڑھی سے وہ بھکشا لے چکا تھا۔ مگر آج جس گلی جس ڈیوڑھی کا اس نے دھیان کیا تھا کہ وہاں وہ ہاتھ میں تھال لئے اس کی باٹ دیکھتی ہے۔ وہ ایک بار پورے نگر کو دھیان میں لایا۔ پھر اس نے اچنبھا کیا کہ کتنی گلیاں ہیں کہ جال کے سمان پھیلی ہوئی ہیں اور گلی گلی کتنی ڈیوڑھیاں ہیں کہ ہر ڈیوڑھی میں کوئی ناری بھکشا دینے کے لئے کھڑی ہے۔ گلیاں، ڈیوڑھیاں، ناریاں۔ اس نے سوچا کہ یہ سب مایا کا جال ہے۔ پھر وہ ان بھلے بندروں کو دھیان میں لایا جنھوں نے ناری کی بات سن کے کانوں میں انگلیاں دے لی تھیں اور اس استھان کو چھوڑ دیا تھا جہاں انھوں نے یہ بات سنی تھی۔ مجھے بھی یہ نگر چھوڑ دینا چاہیئے اور وہ نگر سے منہ موڑ کے جنگل کی اور ہو لیا۔

گلیاں، ڈیوڑھیاں، ناریاں سب پیچھے رہ گئی تھیں۔ سنجے اب گھنے جنگلوں میں چل رہا تھا چلتے چلتے اس نے پھولوں سے لدے ایک اشوک کے پیڑ کو دیکھا اور رک گیا۔ اس پیڑ کے نیچے اس نے نرجن باس کیا۔ بسنت رُت تھی۔ سرسوں پھولی ہوئی تھی، گیندا مہک رہا تھا۔ اشوک کی ڈالیاں پھولوں کے بوجھ سے جھکی ہوئی تھیں۔ سنجے یہ سماں دیکھ کے بہت پرسن ہوا۔ سو گندھت پھولوں سے لدے اشوک کو دیر تک دیکھا کیا۔ پھر وہ اچنبھے سے من ہی من میں کہنے لگا کہ ہے رام کس کنیا نے اس اشوک کو ٹھوکر ماری ہے کہ اس پر اتنے پھول آئے ہیں۔ بس اس وچار کے ساتھ اس کا دھیان مہندی والے اُجل کومل پیروں کی اور چلا گیا۔ کیا اس اشوک کو ان مہندی والے اُجل کومل پیروں نے ٹھوکر ماری ہے۔ وہ سندری بسنتی ساڑھی میں لپٹی اس کے دھیان میں ابھری۔ تھوڑی دیر تک وہ اس دھیان میں ایسے ڈوبا رہا کہ کسی بات کی سدھ بدھ ہی نہ رہی۔ مگر پھر اچانک وہ چونکا۔ یہ تو میں پھر موہ کے پھندے میں پھنس رہا ہوں۔ وہ تُرت وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس پیڑ تلے برائی کی بات میرے دھیان میں آئی ہے، مجھے یہاں سے اٹھ جانا چاہیئے۔

سنجے نے پھر ایک لمبی یاترا کی اور جنگل جنگل مارا پھرا۔ دن گزرے، مہینے بیتے، رُتیں چڑھیں اور اُتریں۔ ہر رُت اپنی چہک مہک کے ساتھ آئی اور بیت گئی۔ ہر رُت سنجے کو دکھی کر کے گئی۔ کبھی پھولتی سرسوں، کبھی بوراتے آم، کبھی ڈولتا بھنبھناتا بھونرا، کبھی منڈلاتی بھنبیری، کبھی دکھیا کوئل کی پکار، کبھی اداس دادر کی جھنکار، کبھی چمپا کی مہکار، کبھی بیلے کی باس، تو یوں کہو کہ ہر رُت سے کے

سنگ...... ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یادوں کی شانت ندی میں ہلکورے پیدا کر جاتا۔ پھر پلانے بیتا پل لوٹ کے آجاتا اور وہ سندر مورت سامنے آکھڑی ہوتی۔ سنجے سوچ میں پڑ گیا کہ یہاں بھی سب رستے اسی طرف جاتے ہیں اور سب رُتیں اسی اور جھکتی ہیں۔ کیا رُتیں بھی شراوستی کی گلیاں ہیں کہ سب اسی دوار کی اور جاتی ہیں۔ بہت وچار کے بعد اس نے یہ تت نکالا کہ رُتیں پنچ اندری سے ملی ہوئی ہیں اور پنچ اندری دکھ کے پانچ دروازے ہیں۔ آدمی موہ میں کس کس راہ سے پھنستا ہے کبھی کوئی کومل پنکھڑی چھوکے، کبھی کوئی رسیلی باتی سن کے، پھر کبھی کوئی مہک اسے لے اڑتی ہے کبھی رنگ اسے لے ڈوبتا ہے۔ سو بات یوں ہے کہ ہر رت دکھ دیتی ہے۔ یہ جان کر وہ اداس ہوا اور دکھی ہوکے کہا کہ نگر میں گلیاں ہیں اور جنگل میں رُتیں ہیں میں موہ کے جال سے کیسے نکلوں۔

سنجے انھیں وچاروں میں تھا کہ پت جھڑ آگئی۔ دن اداس ہو گئے۔ ڈول ڈول سوکھے پتے بکھرنے لگے۔ ہوا کے ہر جھونکے کے ساتھ ان گنت پتے ٹہنیوں سے گرتے اور جہاں تہاں تتر بتر ہو جاتے۔ اب یہ رُت مجھ سے کیا کہنے آئی ہے! سنجے پھر سوچ میں پڑ گیا۔ دھیرے دھیرے پھر اس کے اندر کن من ہوئی۔ اسے پھر کچھ یاد آنے لگا تھا۔ پر اب کے ایک یاد اور ہی طرح کی آئی۔ یہی رت تھی اور ایسا ہی جنگل تھا۔ تتھاگت نے بیچ پت جھڑ یہاں آکے باس کیا تھا۔ ارد گرد پیلے پیلے سوکھے پتے بکھرے پڑے تھے۔ ہاتھ بڑھا کے پتوں سے مٹھی بھری پھر آنند کو دیکھا "آنند! کیا سب پتے میری مٹھی میں آگئے ہیں؟"

آنند جھجکا پھر بولا "ہے تتھاگت، یہ رُت پت جھڑ کی ہے۔ پتے جنگل میں اتنے جھڑے ہیں کہ ان کی گنتی نہیں ہو سکتی۔"

تتھاگت نے کہا "آنند! تو نے سچ کہا۔ پت جھڑ کے ان گنت پتوں میں سے میں بس ایک مٹھی اٹھا سکا ہوں۔ یہی گت سچائیوں کی ہے۔ جتنی سچائیاں میری مٹھی میں آئیں میں نے ان کا پرچار کیا۔ پر سچائیاں ان گنت ہیں، پت جھڑ کے پتوں کے سمان۔"

اس یاد نے اس پر نرالا جادو کیا کہ وہ جہاں کا تہاں کھڑا رہ گیا۔ پھر نہ ایک قدم آگے بڑھا نہ ایک قدم پیچھے ہٹا۔ وہیں ایک گھنے پیپل کی چھاؤں میں آسن مارکے بیٹھ گیا اور گرتے زرد سوکھے پتوں کو تکنے لگا۔ پت جھڑ کے ان گنت پتے ان گنت سچائیاں۔ ایک حیرانی کے ساتھ وہ گرتے پتوں کو دیکھ رہا تھا۔ دیکھتا رہا، دیکھتا رہا۔ دھیرے دھیرے کرکے اس کی آنکھیں مندتی چلی گئیں۔ جو باہر ہے وہی میرے

اندر بھی ہے۔ آسن مارے آنکھیں موندے بیٹھا رہا۔ بیٹھا رہا جانے کتنی دیر، کتنے دن، کتنے جگ۔ جب اس نے آنکھیں کھولیں تو جانا کہ ان گنت رتیں بیت گئی ہیں اور اب وہ پت جھڑ میں ہے۔ اس کی گود میں زرد سوکھے پتے بھرے تھے۔ وہ زرد سوکھے پتوں میں نہایا ہوا تھا اور دھوپ میں تپ رہا تھا۔ اس نے نظریں اٹھا کے اوپر دیکھا۔ جس پیپل کو گھنا دیکھ کے وہ اس کی چھاؤں میں بیٹھا تھا اس پیپل کا ایک ایک پتہ جھڑ چکا تھا۔ پھر اس نے ارد گرد نظر ڈالی اور دور تک دھرتی کو زرد پتوں سے ڈھکا پایا۔ دور تک پیڑ لنڈ منڈ کھڑے نظر آ رہے تھے۔ اس نے اپنے شانت من میں جھانکا، میری کامنائیں بھی زرد سوکھے پتوں کے سمان جھڑ چکی ہے۔ پھر اس نے کہا کہ بسنت رت، برکھا رت، جاڑے کی رت، سب رتیں آنی جانی ہیں۔ پھول جھڑ جاتے ہیں، باس اڑ جاتی ہے۔ لہنیاں سوکھ جاتی ہیں۔ پر پت جھڑ امر ہے۔ اور وہ مسکایا جیسے اس کی مٹھی بھر گئی ہو۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اب وہ شانت تھا۔ من میں کہا کہ میری یاترا سپھل ہوئی۔ اب مجھے واپس چلنا چاہیئے۔

سنے جنگل میں خالی پاتر بیاکل من کے ساتھ گیا تھا۔ جنگل سے بھری مٹھی اور شانت ہردے کے سنگ لوٹا۔ جنگل سے نکل آیا تھا۔ اب وہ بھری بستی میں تھا۔ شراوستی میں اس سمے کیسی چہک مہک تھی۔ لگتا تھا کہ نگر نہیں پھلا پھولا باغ ہے۔ رنگ اور سوگندھ کی ندی امنڈی ہوئی تھی۔ چہکتے پنچھی، مہکتی کیاریاں، سندر ناریاں رنگ رنگ کی ان کی ساڑیاں، گلیوں میں آتیاں جاتیاں۔ اس نے ایک بیراگ کے ساتھ یہ سب کچھ دیکھا۔ ایک بار پھر جی میں آئی کہ بستی کے بیچ کھڑا ہو کے چیتاونی دے کہ ہے اگیانیو، ہے شراوستی کے باسیو، رنگ رس میں مت ڈوبو۔ پھول کمہلا جاتے ہیں، بو باس اڑ جاتی ہے، رنگ روپ اتر جاتا ہے، جوبن ڈھل جاتا ہے۔ سندرتا کی سب رتیں آنی جانی ہیں پت جھڑ امر رت ہے۔ پر من میں تو بیراگ رچ گیا تھا۔ بولنے کو اب جی کب چاہتا تھا۔ گم سم آنکھیں جھکائے شراوستی کی گلیوں سے گزرا۔ آنکھ اٹھا کے یہ بھی نہ دیکھا کہ کس گلی میں ہو اور کس دوار سے بھکشا مانگتے ہو۔ کیوں دیکھیں۔ مطلب تو بھکشا سے ہے۔ بیراگی کو اس سے کیا کہ کس دوار سے ملا ہے اور کن ہاتھوں سے ملا ہے۔ جھکی نظروں نے بس دینے والی کے پیروں کو دیکھا اور حیران رہ گئیں۔ بالکل ویسے ہی گورے مہندی لگے پیر۔ کیا وہ ہے۔ چونک کے نظر اٹھائی۔ کیا دیکھا کہ وہی کھڑی ہے بالکل اسی طرح۔ بدن پہ بسنتی ساڑھی، ماتھے پہ لال بندی، ہاتھ میں بھوجن سے بھری تھال۔ اٹھی نظریں اٹھی کی اٹھی رہ گئیں۔ قدم جہاں تھے وہیں جم گئے۔ نہ کوئی قدم پیچھے نہ کوئی قدم

آگئے۔ ایک پل میں جھٹ بیت گئے۔ لگا کہ جنم جنم سے وہ اس ڈیوڑھی پر اسی گت سے کھڑی ہے اور جنم جنم سے وہ اسی طرح ٹھٹھکا ہوا اسے تک رہا ہے۔

من اس کا پھر بیاکل تھا اور آتما پھر دکھی تھی۔ رُت پھر بدلنے لگی تھی۔ لنڈ منڈ پیڑوں میں کونپلیں پھوٹ رہی تھیں۔ اس نے ایک صدمے کے ساتھ اپنے اندر جھانکا، کیا میرے بھیتر پھر کوئی کونپل پھوٹ پڑی ہے۔ اور اس نے اچنبھے کے ساتھ سوچا کہ اپنے دیپ کے اجالے میں چلتے چلتے میں کہاں آگیا ہوں اور یہ کیسے پتے ہیں کہ میری مٹھی میں آگئے ہیں۔

احمد ندیم قاسمی

نیلا پتھر

امّاں نے ہمیں آدھی رات ہی کو جگا دیا۔ "اٹھو بیٹو! منہ ہاتھ دھو لو، کپڑے بدل لو، شمیرو، ملاسی اور نورا ساربان بس پہنچنے ہی والے ہوں گے۔"

اس وقت چاند سیدھا ہمارے سروں پر چمک رہا تھا۔ ہوا اتنی خاموشی سے چل رہی تھی کہ صرف بیری کے سائے میں کہیں کہیں جنبش ہو رہی تھی۔ اسی سے اندازہ ہوتا تھا کہ اوپر پتے ہل رہے ہیں۔ پنجرے میں سوتا ہوا طوطا اپنے سر کو ایک طرف کے پروں میں کچھ یوں چھپائے پڑا تھا جیسے کوئی اس کا سر کاٹ کر لے گیا ہو۔ بلی روئی کا ایک گالا بنی بیٹھی تھی۔ "مانو!" میں نے اسے بلایا تو وہ اٹھی۔ انگڑائی لی تو اپنے قد سے ڈیوڑھی لمبی ہو گئی۔ پھر وہ وہیں سے کود کر میری چارپائی پر آ بیٹھی اور خرخر کرتی ہوئی میری گود میں گھسنے لگی۔

"تم نے بلی کی نیندیں بگاڑ دی ہیں۔" اماں جو ہمارے لئے چوری بنانے کی خاطر چولہا جلا رہی تھیں بولیں "اب تمہارے جانے کے بعد وہ دو تین دن تک روتی پھرے گی۔"

بھائی جان نے پوچھا "اور اماں! ہمارے چلے جانے کے بعد آپ تو نہیں روئیں گی؟"

"نہیں تو" اماں بولیں، اور پھر رونے لگیں۔

ہم چارپائیوں پر سے کود کر اماں سے لپٹ گئے اور اماں ہم دونوں کے سروں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے روتی رہیں اور کہتی رہیں "میں کیوں روؤں؟ میں زندگی بھر کیا کم روئی ہوں کہ اب بھی روؤں جب میرے بچے میرا سہارا بننے والے ہیں۔ پھر جب تم دونوں نوکر ہو جاؤ گے نا، تو میں اپنی گزری ہوئی زندگی سے جی بھر کر بدلے لوں گی۔ میں نواڑ کے پلنگ پر سوؤں گی، میں ریشم کی چادر اوڑھوں گی، میں طلے جڑے جوتے پہنوں گی اور تمہاری بیویوں سے اپنے پاؤں دبواؤں گی۔"

"ہماری بیویاں آج کل کہاں رہتی ہیں اماں؟" میں نے پوچھا۔

اور بھائی جان ہنسنے لگے "پاگل ہے یہ، دیکھو کیا! شرم نہیں آتی۔"

اماں بھی ہنسنے لگیں اور مجھ سے بھینچ کر بولیں "وہ تمہارے چچا کے بالاخانے کی مٹی پر
ے بڑا سا ستارہ چمک رہا ہے نا! اس میں رہتی ہیں۔ یہ ستارہ تھوڑا تھوڑا ہل رہا ہے۔ بتاؤ کیوں
ہ رہا ہے؟"

میں بیری کے سائے کی ہلکی ہلکی جنبش دیکھ چکا تھا فوراً بولا "ہوا سے ہل رہا ہے"
اور اماں ہنستے ہوئے بولیں "نہیں بیٹا! ہوا سے کہاں ہل رہا ہے۔ ستارہ اس لئے ہلتا ہوا
معلوم ہو رہا ہے کہ تمہاری بیویاں تمہیں دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہی ہیں اور تالیاں بجا بجا کر ہنس رہی
ہیں اور کہہ رہی ہیں کہ اس بڑھیا کے ٹھاٹھ دیکھو، ہم سے پاؤں دبوائے گی! یہ منہ اور مسور کی دال"

"یہ کہہ رہی ہیں؟" میں نے بگڑ کر کہا "میں انھیں ماروں گا"
اچانک بلی چارپائی سے کود کر بھرے میری گود میں گھس آئی۔ اماں نے اس کی گردن کا چمڑا
مٹھی میں لے کر اسے اٹھالیا اور اسے ایک طرف ڈال کر پانی سے اپنی انگلیاں دھوتے ہوئے بولیں
"اس بے زبان کو تو پتہ چل گیا ہے کہ آخر گرمیوں کی چھٹیاں گزار کے واپس کیمبل پور جا رہا ہے"

ہم نے منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدلے، چوری کھائی اور نورے کا انتظار کرتے کرتے تھک گئے
تو اماں کے کہنے پر اسے بلانے نکلے۔

گاؤں بالکل چپ تھا جیسے سانس روکے پڑا ہے۔ جیسے کتے تک مر گئے تھے۔ "بھائی جان"
پر سناٹے کا ہول مسلط ہونے لگا "چلئے واپس چلیں۔ خود اماں کہتی ہیں کہ آدھی رات کے بعد
گلیوں میں جن گھومتے ہیں"

بھائی جان بولے "اماں یہ بھی کہتی ہیں کہ آیۃ الکرسی پڑھنے سے جن بھاگ جاتے ہیں
آیۃ الکرسی پڑھو"

میں نے سوچا اگر ایسی بات ہے تو خود بھائی جان آیۃ الکرسی پڑھتے ہوئے آگے کیوں نہیں
بڑھتے جب کہ نورے کا گھر گلی دو گلیاں دور ہے۔ مگر میرے پاس زیادہ سوچنے کا وقت نہیں تھا۔
میں آیۃ الکرسی پڑھنے لگا۔

ابھی میں "ولا نوم" تک ہی پہنچا تھا کہ گلی کے پرلے سرے پر ایک جن نمودار ہوا "بھائی جان!"
میں نے چیخنے کی حد تک سرگوشی کی اور بھائی سے لپٹ گیا۔

"آیتہ الکرسی پڑھو" انھوں نے بھی چیخ کی حد تک سرگوشی کی اور اپنے آپ کو میری گرفت سے آزاد کیا "اماں کہتی ہیں کہ جِنّ سے ڈر کر بھاگنے سے آدمی مرجاتا ہے۔ پھر جِنّ اُن بچوں کو تو بالکل کچھ نہیں کہتے جو آیتہ الکرسی پڑھتے ہیں۔"

گلی کے پتھر لُڑھک اور بج رہے تھے اور اب جِنّ ہم سے کوئی دس گز دور رہ گیا تھا۔ پھر وہ وہیں رک گیا اور بولا "کون ہو تم؟ جن ہو؟ بھوت ہو؟ کون ہو؟ بولو ورنہ پتھر مارتا ہوں"۔ اور اس نے جھک کر ایک پتھر اٹھا بھی لیا۔

بھائی جان فوراً بولے مگر عجیب طرح بولے میں ان کی آواز پہچان ہی نہ سکا "ہم اکبر اور اطہر ہیں۔"

"ارے بیڑا تر جائے تمہارا" وہ پتھر زمین پر پھینک کر ہاتھ جھاڑتے ہوئے بولا "میں تو ڈر گیا تھا۔ تم تو میرے سائیں ہو۔ میرا تو دل میرے چاروں طرف دھڑکنے لگا ہے۔ میں بھی کہوں یہ کون ہاتھ ہاتھ بھر کی چیزیں کھڑی ہیں ــــــ" اور پھر وہ ہنسا۔

"تم کون ہو؟" اب کے بھائی جان باقاعدہ کڑکے۔

وہ بولا "میں تمہارا دھوبی ہوں، زمان دھوبی۔ کیا کر رہے ہو یہاں آدھی رات کو؟"

میں پہلی بار بولا "ہماری چھٹیاں ختم ہو گئی ہیں۔ ہم کیمبل پور جا رہے ہیں۔ ہم شیرو مراسی اور نورے ساربان کا انتظار کر رہے ہیں۔"

"تم اس وقت کیا کرتے پھرتے ہو؟" بھائی جان نے زمان سے یہ سوال ایسے رعب سے پوچھا جیسے استاد بچوں سے پوچھتے ہیں۔

زمان بولا "میں پتھر کاٹنے جا رہا ہوں۔ روز اس وقت گھر سے نکلتا ہوں۔ صبح کی نماز نیلی ڈھیری پر پڑھتا ہوں۔ پھر وہاں نیلا پتھر کاٹتا ہوں۔ تمہارے چچا نیا مکان بنوائیں گے نا نیلے پتھر کا۔"

"کیا دھوبی بھی پتھر کاٹتے ہیں؟" بھائی جان نے حیران ہو کر پوچھا۔

اور زمان نے جواب دیا "جب دھوبی کے پاس دھونے کو کچھ نہ ہو تو اسے پتھر ہی کاٹنے چاہئیں ورنہ وہ انسانوں کو کاٹنے لگے گا۔" وہ ذرا سا رکا مگر ہمیں خاموش پا کر ہنس دیا۔ پھر بولا "کیا کروں چھ بچے ہیں۔ نہ ان کی ماں ہے نہ دادی۔ سب مجھ میں گھسے چلے آتے ہیں بلی کے بچوں کی طرح۔ سب کا دوزخ بھرنا ہوتا ہے اور خدا میرا سہارا ہے اور میں اُن کا سہارا ہوں۔"

سہارا! میں نے سوچا۔ یہ سہارا کیا ہوتا ہے؟ ابھی ابھی اماں کہہ رہی تھیں کہ تم میرا سہارا ہو۔ اب یہ زمان دھوبی کہہ رہا ہے کہ خدا اس کا سہارا ہے اور وہ اپنے بچوں کا سہارا ہے۔ آخر کیا ہوتا ہے یہ سہارا!

"کیوں بھائی جان! یہ سہارا ہوتا کیا ہے؟"

مگر بھائی جان نے تو میری بات سنی ہی نہیں۔ تالی بجا دی "آگیا نوالا!" انھوں نے نعرہ لگایا۔

"اب نیلی ڈھیری پر ملاقات ہوگی۔" زمان دھوبی بولا "خوشاب کا راستہ وہیں سے گزرتا ہے نا میں تمہیں ایک نیلا پتھر دوں گا جو میں نے چھپا کر رکھا ہوا ہے۔ اس میں گہری نیلی لہریں ہیں اور نیلی نیلی چڑیاں اُڑ رہی ہیں اور نیلے نیلے پھول سے کھل رہے ہیں۔ قدرت بھی عجیب عجیب کھیل کھیلتی ہے۔ میں تو دوپہر کو بھی وہ پتھر دیکھتا ہوں تو جی چاہتا ہے نماز پڑھنے لگوں۔ لے جانا اپنے ساتھ اپنے چچا جی کو دینا۔ کہنا زمان دھوبی نے بھیجا ہے۔ وہ خوش ہوں گے۔ خدا کے بعد ہم غریبوں کا وہی سہارا ہیں۔"

"سہارا!" میں باقاعدہ چونک پڑا۔ مگر زمان آگے بڑھ گیا تھا۔

دور سے اونٹ کتنا بہت سا لمبا لگ رہا تھا۔ اس کی گردن میں لٹکی ہوئی گھنٹی یوں بج رہی تھی جیسے کوئی لڑکی گا رہی ہے۔ تب ایک مرغ نے بانگ دے ڈالی۔ پھر تو بانگوں کا تانتا بندھ گیا۔ قادرے کے باڑے میں ایک بکری ممیائی اور فوراً بعد قادرے کا کتا بھونکا۔ گاؤں نے انگڑائی سی لی۔ جیسے ہمیں رخصت کرنے کے لئے اُٹھ بیٹھا ہے۔ میں اندر بھاگا۔ پھر شیرو نے دروازے پر سے پکارا "بی بی جی! پردہ۔ میں اندر آکر بچے کا صندوق اٹھا لوں۔"

"دو صندوق ہیں۔" میں نے شیرو کو ڈانٹا۔

"اہا ہا ہا!" شیرو نے میری بغلوں میں ہاتھ رکھ کر مجھے پکڑا اور اپنے سر سے بھی اونچا لے گیا۔ "اب تو میرا چھوٹا سائیں بھی صندوق والا ہو گیا۔ تمہاری مونچھیں کب نکلیں گی؟ جلدی جلدی بڑے ہو جاؤ نا۔ پھر میں تمہاری شادی پر ایسا ایسا ڈھول بجاؤں گا، ایسا ایسا ڈھول بجاؤں گا کہ تان سین نے بھی ایسا ڈھول نہ بجایا ہوگا۔ تبھی تو مجھ غریب کا سہارا ہو۔"

پھر وہی سہارا! یہ سہارے کیا ہوتے ہیں آخر؟ میں اس سے پوچھنے لگا تھا کہ اس نے صندوق اٹھا کر کندھے پر رکھا اور باہر چلا گیا۔ اندر کوٹھے میں امی ہمیں لپٹائے کھڑی رہیں اور کچھ پڑھتی رہیں اور ہم پر چھوہ چھوہ کرتی رہیں اور روتی رہیں۔ پھر شیرو دوسرا صندوق بھی لے گیا اور جاتے ہوئے کہہ گیا "چلو جی۔"

جب ہم کجاوے میں بیٹھے تو جب بھی ڈیوڑھی کے دروازے کے پیچھے سے امی کی روتی روتی آواز آرہی تھیں "اللہ انہیں خیر خیریت سے پہنچانا۔ اللہ انہیں کوئی گزند نہ پہنچے۔ اللہ تیرے بعد یہی تو میرے سہارے ہیں۔"

سہارے! ـــــــ میں بھائی جان سے ضرور پوچھتا مگر ہم دونوں کے درمیان اونٹ کا کوہان حائل تھا، اور پھر مجھے ایک دم بہت سا رونا بھی تو آگیا تھا۔ اونٹ گلی کا موڑ مڑا تو میں ضبط نہ کر سکا۔ میں نے چیخ ماری "امی جی!" ـــــــ اور بھائی جان کجاوے میں گھٹنوں کے بل اٹھے اور مجھے ڈانٹا "دیکھتے نہیں ہو ساتھ شیرو اور نورا آرہے ہیں۔ وہ کیا کہیں گے کہ ہم اتنے بزدل ہیں۔ پونچھ لو آنکھیں، چپ ہو جاؤ، آیۃ الکرسی پڑھو۔"

مجھے بھائی جان کی آواز بھی بھیگی بھیگی لگی۔ میں نے کہا "آپ بھی آنکھیں پونچھ لیں اور آیۃ الکرسی پڑھیں۔"

اور وہ جیسے مان گئے "اچھا!"

پھر میں نے کجاوے میں گھٹنوں کے بل کھڑے ہو کر کہا "بھائی جان! جب زمان دھوبی اپنے بچوں کو گھر میں چھوڑ کر نیلی ڈھیری پر جاتا ہوگا تو ہماری طرح روتا ہوگا۔"

"کیوں؟ وہ کیوں روئے؟" بھائی جان نے پوچھا۔

میں نے کہا "ہم اپنی امی کے سہارے ہیں، وہ اپنے بچوں کا سہارا ہے۔ ہم رو رہے ہیں تو وہ کیوں نہیں روتا؟" میں سہارے کو فقرے میں استعمال کر کے بہت خوش ہو رہا تھا۔

"چپ رہو۔" بھائی جان بولے "یا تم آیۃ الکرسی پڑھ رہے ہو؟"

گاؤں سے باہر جب اونٹ کھیتوں کی ایک پگڈنڈی پر چلنے لگا تو نورے نے اسے روک لیا پھر شیرو نے کجاوے کے قریب آکر کہا "لو جی اب میں واپس چلوں۔ بچے جاگیں گے تو مجھے کھاٹ پر نہ پاکر روئیں گے۔"

"تم اپنے بچوں کے سہارے ہو نا چاچا شیرو؟" میں نے سہارے کا ایک اور فقرہ گھڑا۔ اور شیرو نے نورے سے کہا "دیکھا نورے، کیسی چٹاک پٹاک باتیں کرنے لگا ہے میرا چھوٹا سائیں۔" پھر اس نے اپنا ہاتھ اوپر کجاوے کی طرف بڑھایا۔ میں نے کجاوے میں سے اپنا ہاتھ لٹکا کر مصافحہ کیا تو وہ

میرے ہاتھ کو بوسے ہوئے ہلا ہلا کر کہنے لگا " وعدہ کرو جی کہ اس ایک سال میں تم ایک دم دس سال بڑے ہو جاؤ گے۔ کہیں میں تمہاری بڑائی کی راہ تکتے تکتے کھسک ہی جاؤں اور کہیں یہ حسرت دل میں رہ نہ جائے کہ میاں اکبر اور اطہر کی شادی پر میں دو سو روپے کماؤں گا اور اپنی ماں کے دانت لگواؤں گا۔ لکھ لو کسی کتاب میں، دو سو سے کم ایک پیسہ نہیں لوں گا۔ تم کم دو گے تو روٹھ جاؤں گا۔ میری ماں بیچاری تو اسی سہارے اپنے پوپلے منہ سے پٹاخے چھوڑتی رہتی ہے۔"

شیرو اور نورا ہنسے۔ پھر شیرو نے دوسرے کجاوے میں بھائی جان سے ہاتھ ملایا۔ اس نے بھائی جان سے بھی کچھ ایسی ہی باتیں کی ہوں گی مگر میں نے سنی نہیں۔ اب اونٹ چلنے لگا تھا اور میں اونٹ کی گھنٹی کی ایک ہی رٹ سن رہا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی ——" سہارے ہی سہارے —— سہارے ہی سہارے —— سہارے ہی سہارے ——"

پھر یکا یک یوں ہوا جیسے کسی نے چار طرف آسمان کے کنارے کے ساتھ ساتھ چور بتی گھما دی ہے۔ آس پاس کی جھاڑیوں پر کہیں سے اتنی بہت سی چڑیاں آگئیں کہ اونٹ کی گھنٹی کی رٹ دب گئی۔

" یہ تو آپس میں لڑ رہی ہیں۔" میں نے بھائی جان سے کہا۔

اور اونٹ کی مہار تھام کر ہمارے آگے آگے چلتا ہوا نورا ہنس کر بولا "نہیں میاں! لڑ کہاں رہی ہیں۔ دن بھر چیں چیں کرتی ہیں۔ اس لئے گلے صاف کر رہی ہیں۔"

اس پر بھائی جان یوں ہنسے جیسے پکے فرش پر بلور کے لعل گر پڑیں۔ پھر وہ بولے "چچا نورے۔"

نورا پلٹے بغیر بولا " جی میاں۔"

بھائی جان نے کہا " کوئی کہانی سنا جیسی پچھلے سال سنائی تھی۔"

نورے نے پوچھا " وہی گیدڑ والی جو تتے توے پر بیٹھ گیا تھا اور جب گھبرا کر بھاگا تھا تو اس کے ساتھ توا بھی چمٹا چلا گیا تھا۔"

ہم دونوں نے جیسے پوری کہانی سن لی اور ہنستے ہنستے بے حال ہو گئے۔

" چلو وہی سناؤ۔" میں نے کہا " بھائی جان کو یاد ہو گی۔ مجھے تو یاد نہیں۔"

" مجھے تو یاد ہے۔" بھائی جان بولے " پر مزیدار ہے پھر سن لیں گے۔"

" تو لو سنو۔" نورا بولا " ایک تھا گیدڑ۔ چور اُچکا قسم کا گیدڑ۔ ایک غریب بڑھیا کے توے پر سے

روٹیاں اُٹھا کر بھاگ جاتا تھا۔ ایک دن ـــــــ"

اچانک بھائی جان بولے "ہم نیلی ڈھیری پر کس وقت پہنچیں گے چاچا نورے؟"

"نیلی ڈھیری پر؟" نورے نے جیسے سوچا "جب سورج پورا طاق سا نکل آئے گا نا، اس وقت ہم نیلی ڈھیری پر ہوں گے۔"

"اس وقت تک زمان دھوبی کتنا نیلا پتھر کاٹ چکا ہوگا؟" میں نے پوچھا۔

"ارے!" نورے نے چلتے چلتے پہلی بار پلٹ کر دیکھا "میاں تمہیں کس نے بتایا کہ زمان پتھر کاٹتا ہے؟"

بھائی جان بولے "ہم تمہاری راہ دیکھ رہے تھے تو گلی میں سے گزرا تھا۔ کہتا تھا میں تمہیں نیلی ڈھیری پر ملوں گا۔"

"اچھا!" نورا مطمئن ہو گیا۔ پھر بولا "یہ لوگ جاتے ہی تو پتھر نہیں کاٹنے لگتے۔ اگر کل کا پتھر رکھا ہوگا تو اسے کاٹیں گے ورنہ صبح سویرے بارود بھریں گے، پھر بارود کو فلیتہ لگائیں گے۔ زور کا ایک گولا چھوٹے گا۔ چٹانیں خربوزوں کی طرح پھاڑی پھاڑی ہو جائیں گی۔ تب زمان اور دوسرے مزدوروں کو جمع کر کے، انھیں ہاتھ ہاتھ بھر کے پتھروں میں کاٹیں گے۔"

"ارے اتنی محنت کرنی پڑتی ہے؟" بھائی جان بولے۔

"ہاں جی!" نورے نے تائید کی "خون پسینہ ایک کرنا پڑتا ہے۔ ہڈیوں کے اندر کا گودا خشک کرنا پڑتا ہے تب جا کر بال بچوں کے لئے ایک روٹی کمائی جاتی ہے۔"

بھائی جان کو صدمہ سا پہنچا۔ بولے "تو پھر ہمارے چچا جان اینٹوں کا مکان کیوں نہیں بنوا لیتے۔"

"ارے نہیں میاں!" نورا ہنسا "نیلی پتھر کے مکان کی تو شان ہی اور ہے۔ اکبر بادشاہ نیلے پتھر ہی کے محل میں رہتا تھا۔ نیلے پتھر کو بس لوہا سمجھو۔ مستری جب انھیں سنوارتے اور برابر کرتے ہیں تو ایک ایک پتھر ایک ایک دن لیتا ہے۔"

"اچھا!"

"ہاں جی۔"

سورج کا ماتھا مشرق میں چمکا تو نیلی ڈھیری کی طرف ایک دم بڑے زور کا دھماکا ہوا اور آس پاس

کی پہاڑیاں دیر تک بجتی رہیں۔ "چلو میاں" نورا بولا "بارود نے چٹان پھاڑ دی۔ اب جب ہم نیلی ڈھیری پر پہنچیں گے تو زمان اور دوسرے لوگ پتھر کاٹ رہے ہوں گے۔"

"خیر کہاں بھائی!" ان میں سے ایک بولا "کسی سے غلطی ہو گئی۔ ابھی لوگ ٹھیک طرح سے پیچھے بھی نہ ہٹنے تھے کہ دھماکا ہو گیا اور چٹان کے ٹکڑوں نے مزدوروں کو ادھر ادھر پھینک دیا۔ کتنے ہی لوگ لہولہان ہو رہے ہیں۔ ہم گاؤں سے آدمی لینے جا رہے ہیں انہیں اٹھوا کر قصبے کے ہسپتال میں پہنچانے کے لئے۔"

"زمان تو ٹھیک ہے نا؟" میں کجاوے میں گھٹنوں کے بل کھڑے ہو کر پکارا۔

"زمان؟" اس شخص نے پوچھا۔

"ہاں ہاں بھئی۔ اپنا زمان دھوبی؟" نورا بولا۔

"اچھا ہاں۔ وہ دھوبی!" وہ شخص بولا "نیلے پتھر کی کرچوں سے اس بے چارے کی تو آنکھوں کی پتلیاں بھی ٹوٹ گئی ہیں۔ کانچ کی سی تو ہوتی ہے آدمی کی آنکھ۔"

میرے اندر خوف چڑیوں کے ایک جھنڈ کی طرح اٹھا اور دور دور پھیل گیا۔

"مگر زمان تو کہتا تھا کہ خدا اس کا سہارا ہے اور وہ اپنے بچوں کا سہارا۔" بھائی جان جیسے فریاد کرتے ہوئے بولے۔

وہ شخص جلدی میں تھا۔ جاتے جاتے بولا "ہاں اس بے چارے نے بھی یہی رٹ لگا رکھی ہے۔"

اونٹ کی گردن میں بجتی ہوئی گھنٹی کے اس سوال نے اب پوری ڈھیری کو اپنے محاصرے میں لے لیا تھا اور آس پاس کی وادیاں اس گونج کی جھولیاں بھر کر جیسے اوپر آسمان کی طرف اچھال رہی تھیں۔

انور سجاد

گلٹے

ایک روز انھوں نے مل کر فیصلہ کیا تھا کہ اب گلٹے کو بوچڑ خانے میں دے ہی دیا جائے۔

—— اب اس کا دھیلا نہیں ملتا۔

ان میں سے ایک نے کہا تھا۔

—— ان مٹھی بھر ہڈیوں کو کون خریدے گا

—— لیکن بابا مجھے اب بھی یقین ہے۔ اگر اس کا علاج باقاعدگی سے۔

—— تم چپ رہو جی۔ بڑے آئے عقل والے۔

نکا چپ کر کے ایک طرف ہو گیا تھا اور بابا اپنی داڑھی میں عقل کو کریدتا ہوا اس کے بڑوں کے ساتھ سر جوڑ کر بیٹھ گیا تھا۔

میں جب زبان ہلاتا ہوں تو یہ بوچڑ بن جاتے ہیں۔ جس روز سے میں نے اپنی کو پہچانا ہے، اسی روز سے چتکبری کو بھی جانا ہے اور جس روز سے یہ لوگ اسے بوچڑ خانے لے جانے کی سوچ رہے ہیں اس دن سے ہر لحہ یتیم ہوتا ہوں۔ یتیم ہوتا ہوں میں کیا کروں یہ سب مجھ پر ہنستے ہیں کہ میں اس کی اتنی خدمت کیوں کرتا ہوں ان ہڈیوں سے اتنا پیار کیوں کرتا ہوں، کیوں کرتا ہوں۔

—— آپ اسے بوچڑ خانے کی بجائے ہسپتال کیوں نہیں بھیج دیتے۔

نکے سے رہا نہیں جاتا تھا۔

—— تم نہیں سمجھتے یہ ٹھیک نہیں ہو سکتی۔ اس کے علاج پر پیسہ خواہ مخواہ کیوں برباد کیا جائے۔

میں ناسمجھ ہوں ابھی تو کل ہی ماں نے دھاگے میں پندرہویں گرہ لگائی تھی۔

—— آپ علاج کرا کے دیکھیں تو سہی۔

——— بڑوں کی باتوں میں دخل نہ دیا کرو۔
میرا جی چاہتا ہے کہ میں آپ سب کو بوچڑ خانے دے آؤں۔
پھر سب نے مل کر گائے کی زنجیر پکڑی تھی۔ لیکن جیسے گائے کو بھی سب کچھ معلوم تھا۔ وہ اپنی جگہ سے ایک انچ نہیں ہلی تھی۔ انھوں نے مار مار کے اس کا بھرکس نکال دیا تھا۔ نکا ایک طرف کھڑا تھرائی ہوئی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔
شاباش میری چتکبری میری گائے میری گئو ماتا، ہلنا نہیں تم نہیں جانتیں یہ لوگ تمہارے ساتھ کیا سلوک کرنے والے ہیں جانا نہیں ہلنا نہیں ورنہ ورنہ نہیں تو۔
گائے اپنی جگہ پر اڑی، مڑ مڑ کے اس کی طرف دیکھتی رہی تھی۔ ذرا ہٹ کر گائے کا بچھڑا کھونٹے کے ساتھ رسّی سے بندھا بے تعلق بیٹھا تھا۔ بڈیوں پر لاٹھیوں کی بوچھاڑ اسے نہیں سنائی دیتی تھی۔ نکے کے کان بھی بند ہو رہے تھے، رفتہ رفتہ۔
سارے بزرگ ہانپتے ہوئے پھر سر جوڑ کر بیٹھ گئے تھے۔ پھر فیصلہ ہوا تھا کہ اگر یہ اب چل بھی پڑے تو ممکن ہے راستے میں کھبا ہو جائے اس لئے بہتر یہی ہے کہ اسے ٹرک میں ڈال کر لے جایا جائے۔ ٹرک میں تو اسے اٹھا کر بھی لادا جا سکتا ہے۔
اگلے روز ٹرک بھی آ گیا تھا۔
ٹرک کی آواز پر گائے نے مڑ کر دیکھا تھا۔ آنکھیں جھپکی تھیں اور پھر کھولی میں منہ ڈال دیا تھا۔ جہاں نکا چارہ ڈال کے ابھی ابھی ٹرک کو دیکھنے گیا تھا۔
——— آپ لوگ اسے واقعی۔
اسے یقین نہیں آتا تھا۔
——— نہیں تو ہم مذاق کر رہے ہیں کیا؟
ایک نے کہا تھا۔
——— بابا، یہ گائے مجھے دے دو۔ میں اسے۔
——— حکیم کی اولاد۔
دوسرے نے کہا تھا

——بابا اس کے بغیر میں۔

——مجنوں کا بچہ۔

تیسرے نے کہا تھا۔

چوتھا پانچواں سارے بزرگ سارے سالے ایک سے ہیں اور بابا جو اپنی داڑھی کو عقل کا گڑھ سمجھتا ہے جانے اسے کیا ہو گیا ہے۔

——بیٹے ٹرک والے کو دس روپے دے کر بھی ہم بہت فائدے میں رہیں گے۔

او کم بخت سوداگر مجھ سے لو روپے۔ مجھ سے یہ لو لیکن میری مٹھی میں اس وقت تو ہوا ہے جب، جب میں بڑا ہو جاؤں گا۔

ہا ہا ہا ہا۔

جب جب میں کمانے لگوں گا۔

ہا ہا ہا ہا۔

تب تب تک تو چنکبری کی ہڈیوں کا سرمہ بن گیا ہوگا میں میں کیا کروں۔

ان میں سے ایک، گائے کو لانے کے لئے کھولی کی طرف گیا تھا۔ نکا بھی اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ یونہی دیکھنے کے لئے۔ بڑے نے اس کی زنجیر کھولی تھی۔ گائے نے کھولی میں منہ مار کے دانتوں میں پٹھے دبائے تھے، مڑ کے نکے کو دیکھا تھا اور جانے کے لئے کھر اٹھایا تھا۔

——نہ۔ نہ۔ نہ۔

نکا چیخا تھا۔

——بکو مت۔

گائے کھڑی، ہو گئی تھی۔

——ہے۔ ہے۔ ہے۔

بڑے نے زور لگایا تھا۔

——نہ چنکبرے۔ نہ۔ نہ۔

——چپ بھی کرو گے یا کھینچوں زبان۔

نکے نے زبان کو قید کر دیا تھا. بڑے نے پھر زنجیر کو جھٹکا دیا تھا۔

——چلو میم صاحب ! ٹرک والا تمہارے باپ کا نوکر نہیں جو سارا دن کھڑا رہے۔

گائے کی آنکھیں باہر کو نکل آئی تھیں. زبان قید میں پھڑپھڑا کے رہ گئی تھی. لیکن وہ مشت استخواں وہیں کی وہیں تھی. نکا مسکرایا. پھر فوراً ہی اداس ہو گیا تھا۔

یہ تو یہ تو بک بھی چکی ہے اسے جانا ہی ہوگا مجھے اب بھی یقین ہے کہ اگر تھوڑی سی رقم لگا کے اس کا علاج باقاعدگی سے کیا جائے تو تو لیکن میں ان بزرگوں کا کیا کروں کاش میں حکیم ہی ہوتا اس بچھڑے کو شرم نہیں آتی ماں کے جسم پر نیل پڑ رہے ہیں اور یہ باہر کھڑا الو کے پٹھوں کی طرح دیکھے جا رہا ہے۔

زبان پھڑپھڑا کے رہ گئی تھی۔

پھر ان میں سے ایک کو بڑی اچھی سوجھی تھی. اس نے گائے کی دم پکڑ کر اسے تین چار بل دیئے تھے. وہ پیٹھ کے درد سے دور بھاگی تھی. اس نے نکے کی طرف دیکھ کر قہقہہ لگایا تھا. پیٹھ کا درد گائے کو ہانکتا ہوا بالکل ٹرک کے پاس لے آیا تھا. نکے کا دل بہت زور سے دھڑکا تھا۔

در فٹے منہ، لعنت لکھ لعنت۔

ٹرک والے نے گائے کے چڑھنے کے لئے ٹرک سے زمین پر تختہ لگا دیا تھا. گائے نے تختے پر کھر رکھا۔

——نہ چڑھنا۔

——اس کی زبان کاٹ لو—— یہ گائے کو ورغلاتا ہے، ڈراتا ہے۔

نکا پھر منہ بند کر کے پیچھے ہٹ گیا تھا. گائے نے پہلے تختے کو دیکھا پھر نکے کی طرف۔

در فٹے منہ، لعنت لکھ لعنت۔

نکے کا سر شرم سے جھک گیا تھا۔

اس کے علاوہ میں اور کیا کر سکتا ہوں کیا کر سکتا ہوں۔

وہ ابھی تک نہیں ڈری تھی. پھر اس نے مشکوک نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھ کر

بڑے زور سے پھنکار ماری تھی۔

میری چتکبری جانتی ہے جانتی ہے کہ وہ تختے پر قدم رکھ کر ٹرک میں چلی جائے گی لیکن وہ یہ نہیں جانتی کیوں کیوں وہ چڑھنا نہیں چاہتی۔

ان سب نے مل کر اس کی پیٹھ پر لاٹھیاں برسائی تھیں، گائے کی ٹانگیں تھرکی تھیں۔ لیکن وہ اپنی جگہ سے قطعی نہیں ہلی تھی۔ جب انھوں نے مل کر دوسرا وار کیا تو وہ تکلیف سے دور بھاگنے کو تھی۔ کہ بابا کی داڑھی میں عقل نے جوش مارا تھا اور اس نے جماکر اس کے منہ پر لاٹھی ماری تھی۔ گائے پھر تختے کی طرف منہ کر کے سیدھی ہوگئی تھی۔ بابا نے ہانپتے ہوئے کہا تھا۔

——آؤ بیٹو۔

اور سب نے مل کر پھر لاٹھیوں کا مینہہ برسا دیا تھا۔

نکا دور کھڑا تھا۔ بالکل بے تعلق بے حس۔

——یوں بات نہیں بنے گی۔

ایک نے اپنے سانس پر قابو پاتے ہوئے کہا تھا۔

——تو پھر؟

وہ ٹرک کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑے سوچ ہی رہے تھے کہ جانے گائے کو کیا سوجھی تھی پلٹ کر یکدم بھاگ اٹھی تھی اور دھول اڑاتی ہوئی نکے کے قریب سے بالکل اجنبیوں کی طرح گزر گئی تھی۔

نکا——جسم کا مفلوج حصہ۔

——دیکھو، دیکھو، وہ تو بائیں طرف۔

ایک چونکا تھا۔

——قدرتی بات ہے۔

بابا نے اپنی داڑھی میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا تھا۔

گائے اپنے بچھڑے کو چاٹ رہی تھی۔ بابا کی آنکھیں مکارسی مسکراہٹ سے چمک اٹھیں۔

——— اس بچھڑے کو یہاں لے آؤ ——— یہ چال تو ہمیں کل ہی چل جانی چاہیئے تھی، ٹرک کے پیسے بھی بچ جاتے۔

نکا ——— مفلوج وجود۔

ان میں سے ایک نے بچھڑے کی رسی پکڑی تھی۔ نکے کی زبان لرزی تھی۔ گائے کچھ سوچتی، قدم اٹھاتی، رکتی، چلتی بچھڑے کے پیچھے پیچھے اس کے قریب سے گزری تھی تو آہستہ سے نکے کی زبان سے گالی پھسلی تھی۔ بچھڑا تختے پر چڑھ کے پلوسیاں مارتا ہوا ٹرک میں چلا گیا تھا۔ گائے تختے کے پاس جا کے پھر رکی تھی۔ بڑی حیرانی سے بچھڑے کو دیکھ کر آہستہ آہستہ گردن موڑ کے نکے کو دیکھا تھا۔ ایک نے فوراً بغل سے پٹھوں کا گٹھا نکال کے گائے کے آگے کر دیا تھا۔ اس نے چند ڈنٹھل دانتوں میں لے لیے اور پھر کچھ سوچ کر زمین پر گرا دیئے تھے اور اگلا کھر تختے پر رکھ دیا تھا پھر دوسرا کھر۔

خدا معلوم نکے کو کیا ہو گیا تھا۔ یک دم اس کے سارے جسم میں تازہ تازہ گرم گرم لہو کا سیلاب آ گیا تھا۔ اس کے کان سرخ ہو گئے اور دماغ بے طرح بجنے لگا تھا۔ وہ بھاگا گھر میں گیا تھا اور بابا کی دونالی بندوق اُتار کے اس میں کارتوس بھرے تھے۔ اس جنون میں بھاگتا ہوا باہر آ گیا تھا اور کاندھے پر بندوق رکھ کر نشانہ باندھا تھا۔

اس نے کھلی آنکھ سے دیکھا۔ بچھڑا ٹرک سے باہر گائے کے گرائے ہوئے پٹھوں میں منہ مار رہا تھا۔ ٹرک میں بندھی گائے باہر منہ نکال کر بچھڑے کو دیکھ رہی تھی۔ ان میں سے ایک گائے کو لے جانے کے لیے ٹرک میں بیٹھا تھا اور بابا ایک ہاتھ سے اپنی داڑھی میں عقل کو سہلاتا ہوا باہر کھڑے ڈرائیور سے ہاتھ ملا رہا تھا۔

پھر مجھے پتہ نہیں کیا ہوا۔ نکے نے کسے نشانہ بنایا۔ گائے کو، بچھڑے کو، ڈرائیور کو، بابا کو، اپنے آپ کو، یا وہ ابھی تک نشانہ باندھے کھڑا ہے۔

کوئی وہاں جا کے دیکھے اور آ کے مجھے بتائے کہ پھر کیا ہوا۔ مجھے تو صرف اتنا پتہ ہے کہ ایک روز انھوں نے مل کر فیصلہ کیا تھا کہ۔

انور سجاد

زندان نامہ

لیکن مرد تھکا ہوا تھا۔ عورت ایک نظر اسے دیکھ کر اثبات میں سر ہلاتی ہے۔ ساتھ والے کمرے میں کوئی آواز نہیں۔ اس کمرے میں کہ جہاں وہ دونوں ہیں، شہر کے سنڈاس خانوں کی متعفن بو، ٹوٹے شیشوں والی کھڑکی سے سرد دھند کے ساتھ گلی سے داخل ہوتی ہے اور عورت کے لباس سے اٹھتی، گلاب کے گھٹیا عطر کی خوشبو کے ساتھ مل کر کمرے میں پھیل جاتی ہے۔ تب مرد کی تھکی ہوئی نگاہیں اندر کے گھپ تاریک کمرے سے لوٹتی ہیں، کمرے کے نیم روشن، نیم تاریک بلب پر جا پڑتی ہیں۔

عورت اسے ایک نظر دیکھ کر اثبات میں سر ہلاتی ہے۔ لیکن مرد تھکا ہوا ہے۔ ٹوٹی ہوئی آرام کرسی پر جس کا ایک بازو نہیں اور جس کے پلاسٹک کے تانے بانے جگہ جگہ سے ٹوٹ کر لٹک رہے ہیں پاؤں پسارے بیٹھا آنکھیں موند لیتا ہے۔ عورت کہتی ہے:

—— بچے سو رہے ہیں دونوں —— تم کھاؤ گے نہیں؟

—— نہیں۔ مجھے بھوک نہیں۔ تم؟

مرد کی آواز میں غنودگی ہے۔ وہ بہت تھکا ہوا ہے۔

—— مجھے بھی بھوک نہیں۔

عورت۔ بتی بجھا کے اس کے قریب سے گزرتی ہے۔ سرد دھند میں اسے سانس کا گرم لمس محسوس ہوتا ہے۔ گھٹیا عطر میں رچی شہر کے سنڈاس خانوں کی بساند ٹوٹے شیشوں والی کھڑکی سے باہر گلی میں رہ گئی ہے کہ سرد دھند کے سامنے ٹاٹ کا پردہ ہے جسے عورت نے ٹوٹے شیشوں والی کھڑکی پر ابھی ابھی ڈالا ہے۔ تب عورت اور مرد کے جسموں کی حدت کمرے کی سرد فضا میں پھیلنے لگتی ہے۔

وہ پسینے کی خوشبو کو گھٹیا عطر کی بو سے چنتا ہے لیکن تھکاوٹ ہے کہ اس کے پٹھوں کے ریشے ریشے

میں سکڑ جاتے ہے آنکھوں کے پپوٹوں میں ہوتی ہے۔

ـــــ اب اٹھاؤ نا، ورنہ دونوں میں سے کوئی جاگ گیا تو۔

وہ کہیں دور سے اس کی آواز سنتا ہے۔

ـــــ ہاں ہاں، کیوں نہیں۔

وہ اپنی بند ہوتی آنکھوں کو بمشکل کھول پاتا ہے۔ جیسے وہ اس بلاوے ہی کا منتظر تھا۔ وہ لوہے کی کرسی سے اٹھتا ہے اور پسینے کی خوشبو کا دھیان کرتا ہے کہ عورت نے گھٹیا عطر کی خوشبو کو بڑی احتیاط سے تہہ کر کے پاس پڑے ٹین کے بڑے صندوق پر رکھ دیا ہے۔

ـــــ میں یہاں ہوں۔

تاریکی میں مرد کو عورت کے سانس لینے کی آواز بہت قریب سے آتی ہے۔ مرد اس کا ہاتھ تھام کے نیم خوابیدہ لہجے میں کہتا ہے:

ـــــ میں نے اندھیرے میں تمہارا ہاتھ ـــــ

مرد کو احساس نہیں کہ عورت کا جسم تپش سے سلگ رہا ہے جس کی دہک میں اس نے اس کا ہاتھ تھاما تھا۔ وہ بستر پر لیٹ کر اسے اپنی طرف کھینچتی ہے۔ مرد بدستور گرا جاتا ہے۔ وہ بہت تھکا ہوا ہے۔

تب وہ چھوری چھدری روئی اور میلے چیکٹ ابرے والے لحاف کو دوسرے ہاتھ سے اپنے دونوں کے اوپر سرکا لیتی ہے۔ عورت نے مرد کا وہی ہاتھ تھام رکھا ہے کہ جس نے اس کے ہاتھ کو تھاما تھا۔ وہ دھیرے دھیرے اس کا ہاتھ اپنے دہکتے جسم پر پھیرتی ہے۔ جانے کیوں دونوں کو ہنسی آجاتی ہے۔

وہ سوچتی ہے ـــــ مرد ہے لیکن بچہ ہے

وہ سوچتا ہے ـــــ سب عورتیں ایک سی ہوتی ہیں۔

وہ لرز سا جاتا ہے جیسے وہ عورت کے جسم کی نرم، ملائم، دہکتی جلد نہ ہو، کینچلی ہو۔ اس کا ہاتھ رک جاتا ہے لیکن جسم سے اٹھتا نہیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا وہ اپنے اس ہاتھ کو کیا کرے جو اب عورت کی چھاتی پر ہے۔

وہ بہت تھک چکا ہے۔ روئی کے ایک ٹکڑے کے پیچھے جا گتے۔ سو گئے اپنے بچوں کے

بوجھ سے ٹھٹھرتے جسموں کے لئے عورت کی تلاش میں۔

—— ہر صبح میری ماں کہا کرتی تھی کہ کوٹ پہن کر جاؤ، پوہ کا مہینہ ہے۔ اسے معلوم نہیں کہ اب میرے پاس کوٹ نہیں ہے۔

—— تو پھر! تو پھر!

باہر دھند ہے، رات ہے، شہر میں سنڈاس خانوں کی بساند معلق ہے اور پوہ کا مہینہ ہے اور تنہا، تاریک رات میں ایک مرد پیلا، برقانی رنگ جو پہلے پیلا برقانی نہیں تھا، ٹھٹھرتا ہوا، جس کے جسم پر گرم کوٹ نہیں کہ اس کی ماں کو مرے کئی برس ہو گئے ہیں اور باہر پوہ کی دھند میں لپٹی سنڈاس خانوں کی بساند میں بچ ٹھٹھرتی سرد رات۔

—— تو پھر کیا؟ میری ماں کو پتہ تو نہیں چل سکتا کہ میرے پاس گرم کوٹ نہیں۔ اسے مرے تو کئی برس ہو گئے۔

عورت، مرد کو اپنے جسم سے چمٹا لیتی ہے۔ مرد کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کا بے جان، یرقان زدہ سا ہاتھ جو عورت کی سخت منہ چھاتی پر پڑا ہے، کیا کرے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا، دو بچوں کو ان چھاتیوں پر پالنے کے بعد بھی یہ مرے ہوئے چوہوں کی طرح کیوں نہیں لٹکیں۔ کئی کئی وقت فاقے کے باوجود ان کٹوروں میں جھپ کیوں نہیں پڑے۔ اسی طرح جوان ہیں، تازہ ہیں، سوندھی سوندھی باس لئے، جیسے اس نے پہلی مرتبہ انہیں چاک سے اتارا تھا۔

عورت کا جسم تپش سے دہک رہا ہے۔ اس کے جسم کے پسینے کی خوشبو نشیلی ہے۔ مرد کی آنکھیں خود بخود بند ہونے لگتی ہیں۔ وہ بہت تھک چکا ہے۔ انسان کے کاندھوں پر دن کا بوجھ زمین کے سینے پر پہاڑوں کے بوجھ سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔

عورت کو اس کے دل کی دھڑکن صاف سنائی دیتی ہے۔ جو پہلے تیز تھی اور اب رفتہ رفتہ مدھم ہو کر ایک خاص رفتار سے باقاعدگی اختیار کر چکی ہے۔

اس کا ہاتھ ابھی تک عورت کی چھاتی پر ہے۔

وہ اس کے دل کی دھڑکن گننے لگتی ہے۔

—— تھکاوٹ بھی کتنا تھکا دیتی ہے۔

عورت زیر لب، بہت شفیق لہجے میں کہتی ہے۔ تنفر سے، لیکن ماتا بھرے پُر شفقت لہجے میں کہ مرد اب گہری نیند سو گیا ہے۔

اب صبح ہونے والی ہے کہ ٹوٹے شیشوں والی کھڑکی پر پڑے ٹاٹ سے باہر ہلکی ہلکی سرمئی روشنی دھند میں پھیلنے لگی ہے اور چڑیوں کی ٹھٹھری ہوئی چہکار ٹھہرے سناٹے اس خانوں کی بساند میں کبھی کبھی اُبھرتی ہے، کبھی ڈوبتی ہے۔

بستر میں لیٹی اس عورت کی آنکھوں میں نیند کا دور دور تک نشان نہیں۔ اوپر کی منزلوں میں لوگ اُٹھ چکے ہیں۔ چارپائی گھسٹنے، کھانسی، کھنکار، نلکے سے پانی گرنے، برتنوں کے کھٹکنے کی آوازیں کبھی کبھی کہیں کوئی بچہ رو دیتا ہے۔ لیکن اندر کے کمرے میں سرمئی روشنی ابھی نہیں پھیلی، ابھی وہاں چپ کا بسیرا ہے۔

سرمئی روشنی ٹاٹ کے چھیدوں سے اندر آکر کمرے کی تاریکی کو چھیدتی ہے۔ اور ایک مرد ایک عورت کی چھاتی پر ہاتھ رکھے، یرقان زدہ، سوکھا سا ہاتھ رکھے، گہری نیند پڑا سوتا ہے۔ مرد، جوان مرد جو اس عورت کو کبھی بچہ لگتا ہے، کبھی بے حد جوان اور کبھی بے حد بوڑھا۔

عورت جاگتی ہے، جاگ چکی ہے یا شاید سوئی ہی نہیں تھی۔ وہ بہت احتیاط سے اس کا ہاتھ اپنی چھاتی سے ہٹا کر آہستہ آہستہ ایک طرف کو رکھ دیتی ہے۔ اپنے ہاتھ سے اس کے چہرے کو چھوتی ہے۔ مرد کا چہرہ بھیگا بھیگا سا ہے۔ وہ ساری رات اپنا یرقان زدہ استخوانی ہاتھ اس کی نرم، ملائم کٹورے جیسی چھاتی پر رکھے سوتا رہا ہے۔ اور اس کا چہرہ نم آلود ہے، بھیگا بھیگا سا، اس سرمئی سی دھندلی سرد روشنی میں اس کا چہرہ لمبوترہ، کومل، مفلس، یرقانی، تنہا، معصوم سا چہرہ، بھیگا بھیگا سا۔

عورت اس کی گردن کے نیچے سے اپنا بازو آہستہ آہستہ کھینچتی ہے۔ مرد کا سر تکئے پر ٹک جاتا ہے اب عورت بے حد تھک چکی ہے۔ تھکاوٹ اس کے بازوؤں میں، اس کی آنکھوں کے پپوٹوں میں اس کی چھاتیوں میں، اس کے پٹھوں کے ریشے ریشے میں لنگر انداز ہو چکی ہے لیکن وہ اپنے ٹوٹتے جسم کو سمجھتی ہے، بُرا نہیں مانتی، اس میں بھی لذت ہے۔ وہ مرد کے چہرے کو بھرپور طریقے سے دیکھتی ہے اس کے ہونٹوں کو، جن پر مسکراہٹ یوں پھیل پھیل کر سمٹتی ہے جیسے خلا رتی سا خواب دیکھتے میں بچے کے ہونٹوں اور ہونٹ عورت کو دیکھتے ہیں اسے دیکھتے ہیں، حتی کہ اس عورت کی آنکھوں میں حل ہو جاتے ہیں۔

یہ اکثر ہوتا ہے، ہونٹ سرگوشی کرتے ہیں۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ ہم جیسوں کے ساتھ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب ہم عورت کے برہنہ جسم کو چھوتے ہیں تو ہماری آنکھوں میں ہمارے سارے جسم کی تھکاوٹ سمٹ آتی ہے اور باوجود ہزار کوشش کے آنکھیں نہیں کھلتیں۔ اتنی تعبیر، اتنے تصور، اتنی ماںتا، اتنی شفقت سے نہ دیکھو۔ ہمیں رات میں تمہارے گول کاندھوں اور گھٹنوں سے اوپر کی کوملتا پر اپنے دانتوں کے نشان ثبت کر دینے چاہئیں تھے۔ تمہارے ماس کو ہڈیوں سے نوچ نوچ لینا چاہئے تھا حتیٰ کہ تم سرد بستر کی تاریک سلوٹوں میں بے سدھ، بے جان ہو جاتیں اور درد میں کراہتیں ــــــ میری جان بس، بس ایک بار اور ــــــ تم یہی چاہتی تھیں نا۔ لیکن نہیں، ابھی نہیں کہ ہم اس شہر میں ہیں۔ بدصورت، حرص و ہوس میں ڈوبے لالچی شہر میں، جس کی تاریک گلیوں، کشادہ بازاروں، راستوں، دروازوں اور کھڑکیوں میں جنی سنڈاس خانوں کی بساند ہمیں راہ نہیں دیتی۔ تاریک سرد کمروں میں ان گرم، پرتپش، دہکتے، دمکتے جسموں تک پہنچنے نہیں دیتی۔ جن کی چھاتیوں کو ہم نے ابھی ابھی چاک سے اُتارا ہے۔ ہم اپنے کاندھوں پر گئے دنوں کی نوید لئے نئے شہر کی تخلیق میں مصروف ہیں، جس میں تمام گلیاں، تمام راستے، تمام دروازے، تمام کھڑکیاں، تمام عورتیں، تمام بچے، ہمارے ہوں گے۔ ہر شے، ہر شے، ہر شے روشن، توانا خوب صورت جسموں سے اُمڈتی سوندھی سوندھی پسینے کی خوشبو کی مانند جو ہمارے مقدر کی تفسیر بن کے چاروں اور پھیل جائے گی ــــــ نیا شہر جہاں جھوٹے نبیوں کے گلے میں پھانسی ہوگی اور ہمارے بچوں کی گردنیں آزاد ہوں گی۔ جہاں مائیں مریں گی نہیں، باپ خودکشی نہیں کریں گے اور بیٹیوں کو سوزاک نہیں چاٹے گی۔ ایسی کھولیاں نہیں ہوں گی جہاں گٹروں کے چوہے نوزائیدہ بچوں کو نوچ نوچ کر کھائیں، اور نوجوان شہر کے ستون۔ یہ شہر ایسا ہی ہوگا، نیا شہر، جو ہماری آنکھوں میں ہے کہ تب دن پھول کی طرح ہمارے کاندھوں پر ہوگا ہم تھکیں گے نہیں، ہاریں گے نہیں، ہم ایک دوسرے کی آنکھوں میں اُتر کے رات بتائیں گے۔ نیا شہر، ہمارا شہر، میرا شہر۔

عورت مسکرا دیتی ہے۔ بے یقین، اداس سی مسکراہٹ، کہ وہ مرد جو رات روٹی کے ٹکڑوں اور اپنے بچوں، بیوی کے پلوہ میں ٹھٹھرتے جسموں کے لئے حدت کی تلاش میں دن کا بوجھ کاندھوں پر اٹھائے پھرتا تھا، جس کا چہرہ رات میں بھیگ بھیگ سا گیا تھا اور جو رات اس کے بازو پر، سر اور چھاتی پر اپنا یرقان زدہ استخوانی ہاتھ رکھے دن کے بوجھ سے نجات پانے کی سعی میں زندگی کے جنگلوں میں

کھڑکیاں تھام آنکھیں کھولتا ہے۔ عورت اس کے تیغ جرأت سے بھرپور ہونٹوں سے نظریں ہٹاکر پرے دیکھنے لگی ہے۔ وہ ہاتھ بڑھاکے اس کے ٹھوڑی کو اپنی انگلیوں میں لے کر اس کا چہرہ اپنی طرف کرتا ہے۔ دونوں لمحہ بھر کے لئے ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں۔ بے نیازی سے، رحم دلی سے، تمازت سے، پُراسرار کومل نظروں سے جیسے ایک درندہ دوسرے درندے کو دیکھتا ہے۔ وقت کی ابتدا سے ایک دوسرے سے محبت کرتے ہوئے، نفرت کرتے ہوئے، ایک دوسرے میں کھوتے ہوئے، ایک دوسرے کی تلاش میں بھٹکتے ہوئے۔

اب مرد جلدی سے بڑھ کر نلکا کھولتا ہے اور سرد پانی کے چھینٹے منہ پر مارتا ہے۔ چہرے پر سرد پانی کپکپی بن کر اس کے جسم میں پھیل جاتا ہے۔ لیکن اس کے پاس اتنا وقت نہیں کہ وہ کچھ محسوس کر سکے وہ جلدی سے قمیض کے دامن سے منہ پونچھتا ہے۔ جھانک کر دوسرے کمرے میں دیکھتا ہے جہاں ایک چارپائی پر دو بچے، لڑکے دو موٹے تازے پلے پلائے جو ہوں کے پنجوں اور دانتوں سے بے خبر، بے خطر لیٹے شرارتی سا خواب دیکھتے مسکراتے ہیں۔ وہ پلٹ کر عورت کو دیکھتا ہے۔ عورت کپڑے پہن چکی ہے اور ہاتھ میں پوٹلی اٹھائے اب دروازے کے پاس کھڑی ہے۔ پوٹلی میں صرف دو باسی روٹیاں ہیں کہ دال وہ تنور سے لے گا۔ وہ جلدی سے عورت کے ہاتھ پوٹلی لے کر دروازے سے باہر نکل آتا ہے۔ کہ دہلیز میں گھٹیا عطر کی بو اور شہر کے سنڈاس خانوں کی بساند آپس میں گڈمڈ ہو کر متلی بن کر اس کے معدے میں اُچھلنے لگتی ہے۔ وہ اس متلی کو اپنے معدے میں دبا کے، سرد منجمد کہرے میں بندھے، ہوہ کے سورج کو اپنے کاندھوں پر اٹھا کے تیز تیز قدموں سے روانہ ہو جاتا ہے۔

تب ہر رات کی طرح، ہر صبح کی طرح، عورت کے ہونٹوں پر وہ پیاسا بوسہ تڑپنے لگتا ہے جو نئے شہر کی بشارت ہے اور جو گزری ہوئی راتوں کے بانجھ پن اور آنے والی صبحوں کی زرخیزی کی گواہی ہے۔

جمیلہ ہاشمی

جوگ کی رات

ناول کا ایک باب

● اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ پھر اس لکڑی کے کیبن سے باہر نکل کر اس نے بجھتے ہوئے چاند کی مدھم پڑتی جوت کو دیکھا۔ سگریٹ کو پھینک دیا اور اپنے ستاروں جڑے پلّو کو برابر کیا۔

"کیا تم اس بات پر یقین رکھتے ہو کہ آدمی وہی کرتا ہے جو اس کے نصیب میں ہوتا ہے اور ماتھے کے لکھے کو کوئی مٹا نہیں سکتا؟" وہ اس کی راہ میں کھڑی تھی، عین دروازے میں جیسے اندھیاریں اور ا..ریں کے سنگم پر ایک عجب فیصلہ کرنے نہ کرنے کے درمیان۔ چتا کے شعلوں کا سا عکس اس کے چہرے پر پڑ رہا تھا۔ پتہ نہیں وہ کیا کہنا چاہتی ہے، کون سا گناہ ہے جس کا اعتراف کر کے وہ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتی ہے۔ یا محض ایک ڈرامائی صورت حال پیدا کر کے خوش ہو رہی ہے اور یہ سب کچھ محض اداکاری کا کمال ہے؟

میں نے کہا "جب سے دنیا بنی ہے یہ جھگڑا کہ آدمی کے اپنے اختیار میں کیا ہے اور خدا نے اسے کیا بنایا ہے، چلا آتا ہے۔ اور باقی بات حوصلے کی ہے۔ کبھی کبھار آدمی مشیت سے بھی ٹکر لے لیتا ہے اور اپنے زور میں وہ اپنی بات منوا لیتا ہے مگر ایسا بہت کم ہوتا ہے۔"

"میں تمہاری بات سمجھ رہی ہوں آفندی، مگر میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جن کے لئے خدا اپنے بنائے ہوئے نقشے میں تبدیلی کرتا ہے۔ صرف سوچتی ہوں خدا نے مجھے سرماندی کے اندھیرے پانیوں میں بھیج کر سدا اندھیرے میں کیوں رکھا۔ کیا وہ میرے نصیب میں ذرا سی روشنی نہیں لکھ سکتا تھا۔ میں جس رات پیدا ہوئی تھی، آسمان برس رہا تھا اور دیئے میں تیل بھی نہیں تھا، طوفان گرج رہا تھا اور نوکا پیچھے نکلتی سیلاب کی لہروں پر تنکے کی طرح بہی جاتی تھی۔ تم نے کبھی بنگال کی

برسات دیکھی ہے؟ کبھی وہاں گئے ہو؟ آدھا سال سیاہ گھٹائیں جھکی ہوئی برستی ہیں ـــــ نہیں ـــ؟
تو پھر تمہارے خیال میں بھی نہیں آسکتا کہ وہ موسم کیا ہوتا ہے۔ جب آسمان بھی پانی کا بن جاتا ہے اور زمین بھی پانی بن جاتی ہے۔ انسان ندیوں اور دھاروں، اور طوفانوں اور ہواؤں کا مقابلہ کرنے کے لئے بالکل اکیلا ہوتا ہے۔ گرجتے ہوئے بادل آ[دمی] کو آدمی کی نگاہ سے چھپا لیتے ہیں۔ خدا کے اور اس کے بیچ آجاتے ہیں۔ وہی ندی جو کل تک چپ چاپ اپنے کناروں کے اندر بہہ رہی تھی اُبل پڑتی ہے۔ سوئی ہوئی ناگن کی طرح پھنکارتی ہوئی لہروں کی زبانیں نکالے۔ سورج دن میں ایک آدھ بار بے بس سا، بوڑھا سا، اپنے لحاف کا کونا اٹھا کر جھانکتا ہے اور آنکھیں بند کر لیتا ہے۔
یہ سب تو قسمت ہے مگر کیا خدا میرا نصیب ایسا نہیں بنا سکتا تھا کہ مجھے چاول کے بدلے کہیں اور بیچا جاتا۔ عمدہ باجی سے میرا واسطہ ہی نہ پڑتا۔ اگر اس گھر کا دانہ میرے نصیب میں تھا [تو] کوئی اور کام دے دیا جاتا۔ اُن کی خدمت بھلا مجھے ہی کرنا تھی؟
تم عمدہ باجی کو دیکھتے تو بس دیکھتے ہی رہ جاتے۔ تم نے بڑی بڑی آنکھیں دیکھی ہوں گی۔ مگر وہ آنکھیں تو خدا نے اپنے ہاتھ سے بنائی تھیں۔ اتنی روشن اور جادو کرتی ہوئیں جیسے ان میں ستارے کوٹ کر بھر دیئے گئے ہوں۔ ان کی چمک اندھیری سیاہ راتوں میں بھی دکھائی دے جاتی تھی۔" وہ پھر خاموش ہوگئی اور باہر دیکھنے لگی۔
"جانوروں کی آنکھیں بھی رات کے اندھیرے میں خوب چمکتی ہیں۔" میں نے کہا۔ "شاید۔" اس نے پھر ہولے سے کہا جیسے بے دھیانی میں کہہ رہی ہو اور پھر ایک دم اس کو جیسے ہوش آگیا۔
"آفندی کیا کہہ رہے ہو۔ وہ آنکھیں دیکھ لیتے تو تم سب کچھ بھول جاتے۔ بس یوں سمجھ لو جیسے مندر کے دوار کھل جائیں، اور پھر وہ بھونرے کی سی پتلیاں ـــــ اتنی سیاہی تو تم نے کالی رات میں کبھی نہ دیکھی ہوگی، کالی سے کالی گھٹا بھی اُن سے کالی نہیں ہو سکتی تھی، اور عمدہ باجی کے چہرے پر وہ یوں سج جاتیں جیسے کوئی پھول لئے پوجا کرنے جاتا ہو۔ میں نے پہلے دن انھیں دیکھا تو میرا سانس اوپر کا اوپر رہ گیا۔ ان آنکھوں میں سے اندھیرا روشنی بن کر جھانکتا تھا۔"
وہ کرسی پر سے اُٹھ کر ادھر اُدھر ٹہلنے لگی۔ "مگر میں تمہیں عمدہ باجی کے عشق میں مبتلا کرنا نہیں چاہتی کیا فائدہ۔" اس نے اپنے بازو زور سے جھٹکے۔

میں نے کہا "کیا ان آنکھوں کے سوا بھی اس دنیا میں کچھ ہے؟"

اس نے میری بات سنی ہی نہیں، گردن جھکائے وہ اپنے پلو پر ایک دوسرے میں اُلجھے ستاروں کو سُلجھا رہی تھی۔ "آفندی! تمہیں معلوم ہوگا کہ نجومی ستاروں کی چالوں سے جنم پتری ترتیب دیتے ہیں۔ آئندہ کیا ہونے والا ہے، سب بتا سکتے ہیں مجھے کبھی کبھار ہنسی آیا کرتی ہے۔ انسان جس کو روٹی کے ایک ٹکڑے کے لئے در بدر ٹھوکریں کھانی پڑیں، اتنی اوپر نامعلوم دوریوں پر ستاروں کے اُلجھاوے میں گرفتار ہو اور اس کی پیشانی پر لکھی ہوئی عبارت جانے کیسے ان کی چالوں کے چکر میں آجائے۔ ایسی پیشانیاں جن پر نہ تو نور چمکتا ہے نہ روشنی ہوتی ہے۔ تمہیں یہ بات عجیب نہیں لگتی؟"

"رات بہت کم ہے اور تم عمدہ باجی کی بات کرتے کرتے کہاں جا نکلی ہو؟"

"ٹھیک کہتے ہو کہ میں عمدہ باجی کی بات کرتے کرتے کہاں جا نکلی ہوں، مگر رات کم ہے یہ غلط ہے۔ رات تو اتنی لمبی ہے کہ اس کے سرے کو ہم کبھی چھو ہی نہیں سکتے۔"

مجھے تو اس کے صحیح الدماغ ہونے میں شک ہونے لگا تھا مگر میں کر بھی کیا سکتا تھا۔ بہرحال مجھے اس کی باتیں سننا تھیں۔

"عمدہ باجی مجھ سے کوئی چار چھ سال بڑی ہوں گی۔ جوان ہوتی لڑکیوں میں جو ایک بے کلی ہوتی ہے وہ ان میں بالکل نہیں تھی۔ سوئی ہوئی سی، نہایت سادہ، ذرا سی اُداس رہنے والی زرد چہرے والی لڑکی جو زندگی سے بہت کم دلچسپی لیتی ہو۔ وہ بیمار نہیں تھیں۔ دھان پان ہونے کے باوجود ان کی صحت نہایت اچھی تھی، کچھ کرنے کی تمنا لئے ہوئے۔ مگر یہ سب کچھ تو مجھے بہت بعد میں پتہ چلا۔ آٹھ نو سال کی بھوکی لڑکی جس کی آنکھوں سے وحشت برستی تھی، پھٹی پرانی ساڑھی میں لپٹی جس سے اس کا پورا تن نہ ڈھک سکے، بھلا ایسی باتیں کیا سوچ سکتی! وہ بھرکی تجب آدمی کا پیٹ بھرتا ہے، اس کا تن ڈھانپا جاتا ہے تو اس کی آنکھوں میں وحشت کم ہوتی ہے، اسے نت نئی باتیں سوجھتی ہیں۔"

میں نے بہت لاتعلقی سے کہا "یہ نئی نہیں، بہت پرانی باتیں ہیں اور جب آنکھیں کھلتی ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ رات ختم ہونے میں نہیں آتی۔"

وہ اچانک بولی "چلو آؤ چلیں، میں تمہیں بیزار کرنا نہیں چاہتی۔"

"تمہیں بڑی باجی بہت پسند تھیں۔" میں نے اس کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا "غریب سات بھائیوں کی اکلوتی بہن، جو تمہاری مالکن بھی ہو، جو تم سے اچھا سلوک کرے تو تم اس کے لئے انتہا پیار بھار کے سوا اور کیا محسوس کر سکتی ہو" نورالنساء نے کانپ کر کہا۔ شاید اب اسے کھلی ہوا اور سردی کا احساس ہو چلا تھا۔ "بھوکے لوگوں کے قافلے شہر کی سڑکوں اور گلیوں میں مارے مارے پھرتے تھے اور میں دل ہی دل میں خوش ہوتی تھی کہ میں محفوظ ہوں، مجھے روٹی مل رہی ہے۔ بلا سے میرا بابا مجھے بیچ گیا ہے، پر وہاں تُرما کے دھاوے پر آدمی بنا کھائے پئے کب تک جی سکتا تھا۔ جی اداس ہوتا تھا، مجھے پیارا ننھا بھائی یاد آیا کرتا تھا۔ وہ اور میں مل کر اتنے کھیل کھیلتے تھے مگر اب وہ اور میں چھپنے کا لمبا کھیل کھیل رہے تھے، اب تک کھیل رہے ہیں۔ خیر یہ تو ایک علیحدہ بات ہے۔ جب گھسٹتے ہوئے مردہ وجود گلیوں میں ایک مٹھی چاول بھی نہیں پا سکتے تھے تو چپ چاپ کسی دہلیز کے باہر کسی سڑک کے کنارے، لیٹ جاتے تھے۔ تم دس گز بھی نہیں چل سکتے تھے بنا ایسی لاوارث لاشوں کو دیکھے۔"

وہ بہت دیر چپ رہی۔

"تم نے گیا میں وہ مندر کہاں دیکھا ہوگا بھلا جس میں بھگوان بدھ ایک بچارن عورت سے چاول جھپٹ رہے ہیں۔ ساکی مُنی گوتم جس کی تعلیمات دنیا تج دینے کی تھیں، جس نے جنگلوں میں گھوم کر، غاروں میں رہ کر، گیان کی روشنی کے لئے، نروان حاصل کرنے کے لئے عبادت کی۔۔۔ وہ بھی ایک مٹھی چاول کے لئے بے تاب ہوئے۔ جب شجر کے نیچے انھیں نجات کا راستہ نظر آیا ہے تو وہ یقیناً پیٹ کی دوزخ بھر کر ہی بیٹھے تھے۔ بھوکے کو نہ خدا دکھائی دیتا ہے اور نہ ہی اپنی نجات کی فکر ہوتی ہے۔ مگر تمہیں کبھی کاہے کو بھوک کے ایسے نظاروں سے واسطہ پڑا ہوگا؟

اُن دنوں بھائی لوگ بہت مصروف رہتے۔ دہلیز پر سے لاشوں کو ہٹانے، بھوکوں کے لئے روٹی مہیا کرنے اور اپنے طور پر مدد کرنے میں جٹے رہتے۔ بڑے گھر کی ڈیوڑھی میں ذرا دیر کے بعد بھیڑ لگ جاتی اور عمدہ باجی ریڈیو بند کر دیتیں۔ کانوں پر ہاتھ رکھے وہ بولائی بولائی پھرتیں۔ دالانوں اور کمروں میں۔ پھر مجھے زبردستی کھانا کھلاتیں "اور کھاؤ اور کھاؤ۔۔۔"

کالی چرن سرکار بڑے بھائی کے بچپن کا دوست تھا۔ بڑا جوشیلا اور نہایت تلخ۔ تیزی سے

باتیں کرنے اور نہایت تیز چلنے والا لڑکا جس کی باتوں کی آواز باہر سے اندر چلی آتی تھی۔ امیر لوگ غریبوں کی محبت میں، ان کی ہمدردی میں انقلابی بنتے ہیں۔ تمہیں بھی اس بات کا تجربہ ہوگا؟ کبھی کبھی بھوکے ننگے بغاوت کا جھنڈا نہیں اٹھایا۔ میں نے فاقہ کشی کی اذیت سے نجات پائی اور گرد و پیش دیکھا تو فضا میں ایک اور خطرہ منڈلا رہا تھا۔ جنگ کے سائے بڑھ اور پھیل رہے تھے۔ جاپان کی توپوں کی گھن گرج سرحدوں سے پرے سنائی دے رہی تھی۔ جنوبی ایشیا کے آتش فشاں جزیروں پر اوپر سے آگ برسائی جاتی تھی اور سمندر کی پہاڑوں سے بھی بلند موجیں اس آگ کو بجھا نہیں سکتی تھیں۔ بھاتی لوگ اور کالی چرن اور جانے کتنے دوست اپنے اُبلتے ہوئے جذبات کی تسکین کے لئے ادھر ادھر اس کی اس فضا میں سرگوشیاں کرتے تھے۔ وہ تیزی سے آتے جاتے، عجیب سے خوابوں میں مگن رہتے۔ تہہ خانوں میں گیت لکھے جاتے اور بازاروں میں گائے جاتے ــــــ اور یہ اس کے باوجود کہ خود ساختہ قحط نے پورے بنگال کو حواس باختہ کر رکھا تھا۔ ایک حد تک تو حکمران اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئے تھے مگر پھر بھی انھیں اپنے قدم ڈگمگاتے ہوئے محسوس ہوتے تھے اور وہ جال کی ڈوری کو اور تنگ کرتے جاتے تھے۔ میں نے آنکھ کھول کر اس فضا کو دیکھا اور بارود کی بو، اس سے پہلے کہ میں اس کو دوسری اور خوشبوؤں سے الگ کر سکتی، میرے بدن میں بس گئی۔ انقلاب کا لفظ بھی میں نے سنا تھا۔ ہمارے ہاں موسم شدید ہوتے ہیں۔ اپنے جذبوں کے اظہار میں بھی نہایت شدت اختیار کرتے ہیں ہم لوگ ــــ"

وہ چپ ہوگئی، گویا بہت سی یادوں میں سے ایک یاد منتخب کر رہی ہو جیسے لوگ نمائش کے لئے چیزوں کا چناؤ کرتے ہیں۔ اور میں سوچ رہا تھا کہ اب یہ عمدہ باجی کو بھول چکی ہے۔

"کالی چرن پہلے پہل مجھے بہت اچھا لگا، بجلی تھی اس کی آنکھوں میں۔ تیزی سے باتیں کرتا ہوا، اس کا چہرہ مجھے فیصل لگا کرتا۔ مصروف اور یکایک خفا ہو کر کسی بھی بات کو برداشت نہیں کیا کرتا تھا اور لگتا تھا کہ ایک بم کی طرح وہ ابھی پھٹ پڑے گا۔ اس میں رکھ رکھاؤ نام کو بھی نہیں تھا۔ جیسے پہاڑوں میں ایک حلم ہوتا ہے وہ اس کی طبیعت میں دور دور تک دکھائی نہ دیتا۔ جھگڑالو اور آگے بڑھ کر مصیبت کو آگے لگانے والا۔ غصے سے سیاہ چہرہ کئے اپنے ہی پیچھے چلنے اور من مانی کرنے والا۔ شاید وہ مجھے اور عمدہ باجی کو اس لئے پسند کرتا تھا کہ وہ بھاتی لوگوں سے الگ تھا۔

ہمارے گرد اگرد پمفلٹ اور روپے اور چھپنے اور پکڑے جانے کی سنسنی کھیلی رہتیں اور ہم ڈرتے کانپتے بھوک اور کال کے مارے لوگوں کے بیچ بیٹھے مستقبل سے بھی پرے دیکھتے رہتے۔ یہ ساری باتیں اُن دنوں میری سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔ میں نے لکھنا پڑھنا بہت بعد میں سیکھا ہے مگر یہ بھی تو سب بعد کی باتیں ہیں۔ میں بہت ذہین نہیں ہوں، باتیں میری سمجھ میں مشکل ہی سے آتی ہیں۔ ان دنوں بھی یہ سب کیا ہو رہا تھا، میری سمجھ میں بھلا کہاں آتا۔ میں کال کی ماری لڑکی جس کی آنکھوں سے ابھی بھوک کی وحشت بھی دور نہیں ہو پائی تھی۔

آفندی! انقلاب کا کھیل کھیلنے کے لئے جوان ہوتے بچے ہی ٹھیک رہتے ہیں۔ اُن کے دل میں صرف امید ہوتی ہے۔ اور بس کوئی لالچ، کوئی ذاتی غرض پوشیدہ نہیں ہوتی۔ قومیں یہ قربانی دیتی ہیں۔ آزادی کی قربان گاہ پر یہ بھینٹ چڑھانی ہی پڑتی ہے۔"

اُس نے بالکل ہی دھیمی آواز میں کہا "پھر جانے کیا ہوا وہ سب چپ ہو گئے۔ گھر کی تلاشی لی گئی۔ عمدہ باجی سب میں چھوٹی تھیں سو سبھی اس کا دُلار کرتے اور وہ ان دنوں سب سے زیادہ مضطرب رہتیں۔ ماں ہر وقت نماز پڑھتیں۔ انھیں میں نے بہت کم دیکھا تھا۔ آنگن اور دالان اور حویلی کے اندر پیڑوں کے جھنڈ اور بڑا تالاب اب گویا ان کا سایہ بھی بھول گئے تھے۔ ایک سناٹا تھا جس میں خود اپنے پاؤں کی چاپ اجنبی لگا کرتی۔ گھر سونا ہو گیا تھا، عمدہ باجی کو چپ لگ گئی تھی۔ کوئی سرگوشی بھی نہ گونجتی۔ سورج نکلتا اور ڈوبتا، رات آتی اور جاتی۔

کبھی کبھار نہ چاہنے پر بھی آدمی تباہی کا باعث بن جاتا ہے۔ ایک دن مہندی چوڑی بیچنے والی بڑی ڈیوڑھی میں سے گزر کر آئی اور کسی اور کو سامنے نہ پا کر مجھ سے باتیں کرنے لگی۔ چیزوں کا ہوکا مجھے سدا تھا اور پھر ریشمی چوڑیوں کی کھنک، ان کے دل میں کھب جانے والے اتنے بے شمار رنگ جیسے بادلوں میں دھنک اور پھر بنا پیسوں کے وہ مجھے اتنی ساری چیزیں دے رہی تھی ——— "آخر تم اس گھر کی بیٹی ہو۔"

اس کی آنکھوں میں چھپی ہنسی اتنے زمانوں کے پار سے مجھے آج بھی اسی طرح دکھائی دیتی ہے میں نے اِدھر اُدھر دیکھا اور اِتھلا کر کہا تھا "ہاں بالکل۔"

"اگر تم اس گھر کی بیٹی ہو تو تمہیں پتہ ہوگا کہ تہہ خانے کو کون راستہ جاتا ہے؟"

"ہاں بالکل" میں نے سرخ چوڑیوں پر ہاتھ پھیر کر کانوں میں ان کی کھنک کو محسوس کیا۔

بھلا بتاؤ تو کدھر کو جانا ہوتا ہے؟" اس نے بہت ہولے مجھ سے پوچھا اور میں نے عمدہ باجی کے کمرے میں الماری کے اندر سے نیچے اترنے والی راہ کا پتہ بتا دیا۔ میں گھر کی بیٹی جو تھی۔

اسی شام میں باورچی خانے کے اندر ڈاب پی رہی تھی اور عمدہ باجی کمرے میں تالاب سے نہا کر گئی تھیں کہ تلاشی لینے والے بھرے آ گئے۔ انھیں روکنے والا کوئی نہ تھا۔ وہ چیختی رہیں اور کسی نے پروا نہ کی۔ وہ ساڑھی لپیٹ رہی تھیں کہ انھیں الماری کے سامنے سے نہایت بے دردی سے ہٹا کر پولیس والے اندر گھس گئے۔ میں بھی کسی کمرے میں جا چھپی۔

آج تک اس گھڑی تک کسی کو نہیں پتا کہ اس گھر کی تباہی میرے ہاتھوں ہوئی تھی۔

بھائی لوگوں میں سے تین بڑے کالے پانی بھیج دیئے گئے اور باقی چھوٹے ناقابل معافی جرموں کے بدلے دس دس سال کے واسطے جیل بھجوا دیئے گئے۔ کچھ دنوں مجھے کسی سے بھی آنکھیں ملانے کی ہمت نہیں ہوئی تھی۔ عمدہ باجی کمرے میں بال کھولے چپ چاپ بیٹھی رہتیں۔ انھیں کپڑے کا ہوش بھی نہیں تھا۔ کبھی میری طرف دیکھ کر کہتیں "نوری! اچھا یہ تم ہو!"

کالی چرن پر بہت دنوں مقدمہ چلا اور آخر کار اسے پھانسی ہو گئی۔ کیسی کیسی صورتیں تھیں، کیسی کیسی رونقیں تھیں۔ کتنے بھرے پُرے گھر ویران ہو گئے۔ حویلی میں اُلّو بولنے لگے۔

مگر زندگی ظالم اور کٹھور اور کسی کے روکے رکنے والی نہیں۔ آنگن میں کسی نے سہاگ کے گیت نہ گائے۔ اماں ہی نہ رہیں۔ عمدہ باجی کو رخصت کر دیا گیا۔ وہ مضبوطی سے میرا ہاتھ پکڑے تھیں اور ان کا ہاتھ اتنا ٹھنڈا تھا، بالکل برف۔

بظاہر وہ ٹھیک تھیں مگر اپنے کمرے میں جاتے ہی وہ ساڑھی نوچ کر اُتار پھینکتیں اور پلنگ پر گر جاتیں۔ پھر اپنی پٹاری میں سے چاندی کے روپے نکال کر اپنے چاروں طرف پھیلا لیتیں اور ان پر چلتیں۔ دولہا میاں شمس الدین ابوالفخر کچھ دنوں ان کی دلجوئی میں لگے رہے اور پھر وہ بھی اپنی دل چسپیاں باہر ڈھونڈنے لگے اور پھر انھوں نے مجھے تاکا۔ ایک بار پھر میں عمدہ باجی کی راہوں کی روشنی کو بجھانے کا باعث بنی۔

"نور النسا!" عمدہ باجی ایک دن بڑے رسان سے کہنے لگیں "مجھے خوشی ہے کہ ابوالفخر تمہیں

پسند کرتے ہیں:" پھر وہ اٹھیں اور انھوں نے اپنی ساڑھیاں، زیور سنگار کی چیزیں لاکر میرے سامنے ڈال دیں۔" ایک طرح سے تو تمہارا بھی ان چیزوں پر حق ہے نوری۔" میں شرم سے زمین میں گڑ گئی۔ مگر بہر حال حقائق سے آنکھیں کون چرا سکتا ہے۔ جب سورج سامنے ہو تو کون اسے دیکھنے سے انکار کرے گا۔

ہمارا دل اتنی بہت سی باتوں کے لئے کٹا کرتا تھا۔ گزرا زمانہ کبھی صرف ایک گھڑی، ایک پل لگا کرتا ہے اور بیتی باتیں جو جانے کب بیتی تھیں ابھی ذرا دیر پہلے کی لگتی ہیں کیونکہ دولت کے انبار اور زیور اور کپڑا اور بنائی ہوئی عزت سب بے کار ہوتی ہیں۔ یادوں کے جس دوزخ میں میں جلتی ہوں اس سے کبھی مجھے چھٹکارا نہیں مل سکتا۔ اگر مجھے فخر کے لئے عمدہ باجی کو دھوکا دینا پڑتا تھا اور بات تھی مگر انھوں نے تو پرانے کپڑے کی طرح اسے یوں اٹھا کر مجھے دان میں دے دیا جیسے وہ بھکاری کو روٹی دیا کرتی تھیں اور خود انھوں نے جوگ لے لیا۔

وہ پھر ٹھیک نہیں ہوئیں۔

اسی گھر میں روز اُن کے سامنے جانے سے جو میری حالت ہوتی تھی، اس خوف سے جو مجھے ان کی سوتی سیج کو دیکھ کر ہوتا تھا، بچنے کے لئے میں نے فخر سے کہہ کر انھیں گھر بھجوا دیا، ان کے مائکے گھر۔

وہ بہت دن زندہ نہیں رہیں، میں کس قدر سبز قدم ہوں، جہاں گئی تباہی میرے ساتھ ساتھ گئی۔"

"لوگوں کے ساتھ ایسا ہوتا ہے اور اس میں ان کا کیا قصور۔ بنانے والے نے انھیں ایسا ہی بنایا۔" میں نے اسے گویا تسلی کے الفاظ کہے۔

ہمارے سروں کے اوپر سے ایک جیٹ گرجتا ہوا گزر گیا۔ رات اپنا آدھا سفر طے کر چکی ہوگی سیاہی مائل نیلاہٹ میں سات ستاروں کا چھوٹا قافلہ سفر پر نکلا ہوا تھا۔ کہکشاں انسان کی ترقی کے باوجود اپنے رازوں کے افشا کے خوف سے اور زیادہ سفید تھا اور اپنے ستاروں کے غبار کو اور زیادہ دبیز بنا کر اپنی رتھ کو اور زیادہ تیزی سے بھگائے جاتا تھا

عمدہ باجی بھلا کیسی ہوں گی؟ میں نے جی میں سوچا۔ ہندوستانی اصنام گری کی صنعت میں اسے کس کے ساتھ رکھا جا سکتا تھا۔ کسی یاکشی کے ساتھ؟ یا وہ بُت جو سانچی کے کھنڈرات سے برآمد ہوئے بُت گروں نے اپنے خیال کے مطابق عورت کے جسم کی ساخت کو جیسے پسند کیا، بنایا۔ انھوں نے بُت

بنانے کو پایۂ کمال تک پہنچانے جانے والے زمانے سے بہت پہلے یہ یاکشیاں بنائیں۔ آدمی اور دیوتاؤں کے بیچ بیچ یہ مرد اور عورتیں جو مافوق الفطرت طاقت بھی رکھتے تھے۔ اپنے مشاہدے اور تجربے سے یاکشیوں کے جو مجسمے فن کاروں نے بنائے ان میں جسم کے بعض حصوں کو زیادہ پُرکشش بنایا گیا۔ یہ دلآویزی ایک تہہ دار شخصیت کی آئینہ دار تھی۔ سینہ اور کولہے زیادہ نمایاں۔ کثیرالاولاد عورت بھرے پُرے گھر کی دیوی جو ماں بھی ہے اور بیوی بھی، اور پھر اس کی آنکھوں میں مسکراہٹ بھی ہے مونالیزا سے صدیوں پہلے کے بنے ان مجسموں کی مسکراہٹ جو چہرے ہی سے نہیں پورے جسم کے انگ انگ کی شرکت سے مل کر بنی لگتی ہے۔ پُرسکون، ٹھہرے ہوئے مطمئن مجسمے جو عریاں ہیں اور اپنی جادوگری میں بے مثال ہیں۔ زیوروں سے سجے ہوئے بازو اور کان اور سر پر سنگار کے سارے لوازمات، سینے پر پڑی مالائیں ناف کو چھوتی ہوئی، پیالے کی طرح کا پیٹ کولہوں تک سمٹا ہوا، متوازن سے ذرا زیادہ گولائیاں اور رانوں کی قوسیں پاؤں کی ایڑیوں تک مکمل، آنچ دیتے ہوئے جسم جیسے اپنے پتھروں کے قید خانے سے ابھی باہر نکلیں گے۔ بھلا عمدہ باجی یاکشی سے نسبت رکھتی ہیں؟ وہ جس نے اپنی نفی کی، زندگی کی نفی کی اور اپنے گرد سارے موجود لوگوں کی نفی کی۔ شمس الدین ابوالفخر کی نفی کی، نورالنہار بیگم کی نفی کی۔ آدمی جب اپنے وجود کی پرورش کرتا ہے تو گویا زندگی کو خدا کی طرف سے ایک تحفہ سمجھتا ہے، ایک امانت سمجھ کر اسے سنبھالتا ہے، اس سے محبت کرتا ہے۔ ہاں آدمی اپنی ساری کوتاہیوں کے باوجود زندگی کی شدید محبت میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ زندگی اور اس کی آسودگی کے مجسمے بناتا ہے اور اسے فن کا نام دیتا ہے۔ سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اور اس کوشش کو مختلف وجود دیتا ہے اور انھیں فن پارے کہتا ہے۔ جتنی بھی ممکنات ایک خیال میں ہو سکتی ہیں ان سب کو ہیئتوں کی وساطت سے ظاہر کرنا، اصل کے ساتھ رشتے قایم کرنا اور ان مختلف ہیئتوں سے اس ایک نقطے تک پہنچنا جسے انتہا کہا جا سکتا ہے کہ جہاں سب چیزیں معدوم ہوتی ہیں، ملتی ہیں اور ایک ہو جاتی ہیں۔ دنیا اور اس کے کاروبار میں غور کرنے والوں نے اپنے خیالوں کو ایک جامہ دیا۔ انھوں نے ان دیکھی سمتوں اور طاقتوں اور عجیب و غریب دنیاؤں تک اس کے ذریعے رسائی حاصل کی۔ خدا کا تصور ان کے نزدیک اسی ایک راستے سے ممکن تھا بُت تو یوں سمجھ لیا جائے نقشے میں؛ اس کی ذات کا احاطہ کرنے، سمجھنے کے لئے صرف اشارے ہیں۔ وہ صورتی کی ایسی ترتیب جو ہر انسانی خوب صورتی سے بلند و بالا ہو —— مگر خیال کی رسائی تو آخر

انسان کے ناتے ہوتی ہے۔ انسانی ذہن اپنے آپ کو کتنا بھی ماوراء کے ساتھ منسلک کرے، رہے گا تو آدمی کا ذہن ہی اور اس کے باوجود کہ دیوتاؤں کے بت بناتے ہوئے انھیں لامتناہی طاقت کا منبع ثابت کرنے کے لئے ان کے اَن گنت ہاتھ بنائے گئے، شکتی کا مظہر پھر بھی انسان ہی رہا۔ ان دیکھے خدا کو اور اس کی طاقتوں کو مختلف قوموں نے جتنے بھی نام دیئے، اس کے جتنے بھی بت بنائے وہ بھی ان کے ذہن کے احاطے سے بلند رہا۔ بڑے بڑے مندر، پُرہیبت معبد تعمیر کئے گئے۔ سورج، اگنی، ہوا، بارش اور قدرت کی جتنی پُراسرار طاقتوں کو دیوی دیوتا بنا کر ان کی پوجا کی گئی مگر خدا ان دیکھا ان جانا ہی رہا۔ معبد زمین بوس ہوگئے، مندر کھنڈرات میں بدلے، انسانی ہاتھوں کے کام فنا کی راہ میں آئے اور مٹ گئے۔ یاکشیاں اور یاکش، دیویاں دیوتا اور وصال کی ساری پگڈنڈیاں بالآخر خیالوں اور فلسفوں اور بحثوں کے جنگل میں گم ہوگئیں۔ انسان کی مضحکہ خیز کوششوں کے درخت بارآور ہوئے اور مرجھاگئے۔ جیسے بس ذرا سی آنچ کی کسر میں کیمیاگر اپنی عمر برباد کرتے ہیں۔ خود انسان کو اپنے ذہن اور اپنے راستوں سے شناسائی نہیں ہوسکی۔ ایک آدمی ایک وقت میں ایک کام کرتا ہے۔ آخر کیوں؟ وہ کون سے عوامل ہیں جو اسے ایک خاص طرز زندگی، طرز احساس عطا کرتے ہیں۔ اس پر کونسی چیزیں اثر انداز ہوتی ہیں؟

مختلف آب و ہوا اور خطوں میں رہنے والے لوگ ایک دوسرے سے اتنے مختلف کیوں ہیں! قومیں، مذاہب آخر کیا فرق ڈالتے ہیں؟

خون میں جو وراثتیں ملتی ہیں وہ آدمی کو کیا بناتی ہیں؟

اور پھر انسان اتنا مجبور محض کیوں ہے؟

انسان کے علم کی انتہا نہ ہونے کے باوجود کون اس بات کی توجیہہ کرسکتا ہے کہ عمرہ اور نورالنہار کیوں مختلف ہیں؟

اور پھر یہ ہر شخص کے اتنے پہلو کیوں ہیں؟

بھلا عمرہ باجی کو کیا دکھ تھا؟

آدمی کو اتنا سخت جان بنایا گیا ہے کہ وہ ہر مصیبت کو جھیل جاتا ہے، وقت کے ساتھ ساتھ بھول جاتا ہے۔ اگر عمرہ کیوں نہ بھول سکی اور اگر بھول بھی نہیں سکی تو اس کی عریانی، اس کا چاندی

کے سکوں پر چلنا، یہ سب کیا تھا۔ وہ آخر یہ کیوں کرتی تھی!

فضا آوازوں اور بوؤں سے بھری تھی، ناپاک اور متلاطم۔ میں اور نورالنہار اب گرجتے طیاروں کے شور کو سن رہے تھے۔ نیلاہٹ میں رنگ برنگ روشنیاں، اور ہم ان روشنیوں سے بھی کم تر اپنے اپنے خیالوں میں گم۔ "نورالنہار بیگم! میں ایک بات پوچھنا چاہوں گا۔ کیا عمدہ بیگم پاگل ہو گئی تھیں؟"

"تم نے یہ کیسے سمجھ لیا آفندی! کہ وہ پاگل ہو گئی تھیں؟" اس نے تیزی سے کہا۔ "ان میں سوجھ بوجھ، دنیاداری، سگھڑاپن سب کچھ تھا، صرف یہ کہ وہ عام لڑکی نہ تھی۔ دوسری لڑکیوں، سہیلیوں کے درمیان وہ چاند کی طرح جگمگاتی تھی جیسے شہزادی ہو۔ میں اسے دیکھ کر دعا کیا کرتی تھی کہ اسے کسی کی نظر نہ لگے۔" اور پھر ہولے سے اس نے کہا "اسے ضرور کسی نہ کسی کی نظر ہی لگ گئی۔"

"یہ تم کہہ رہی ہو نورالنہار بیگم۔ اتنی آزاد خیال، فیشن ایبل اور تقریباً نئی عورت!"

جھک کر نورالنہار نے سگریٹ سلگایا، گہرے کش لئے، رات کی تاریکی میں دھوئیں کی ایک لکیر سی دن کی طرح دکھائی دی۔ "میں شراب پیتی ہوں اس لئے تم مجھے نئی عورت کہتے ہو؟"

"بھئی کمال ہے! میری بات شراب پینے سے نہیں، تمہاری سوچ سے متعلق ہے۔ تم ہندھنوں اور روائتوں میں یقین نہیں رکھتیں، تم میں بے پناہ اعتماد ہے، تمہاری شخصیت میں ایک دل فریبی ہے جو مسحور کرتی ہے۔ میرا مطلب ہے تم گھر میں رہنے والی ان سب عورتوں سے مختلف تو ہو نا؟" میں رکا۔

نورالنہار اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اب اس نے کیبن کے دروازے کو بند کیا، پھر کھولا ـــــــ

"ہاں آفندی تم ٹھیک کہتے ہو۔" اس نے آہ بھر کر کہا "مگر کتنا کتنا میرا جی چاہا کرتا ہے کہ میں بھی وہ شرمیلی لڑکی ہوتی جو اجنبیوں کو دیکھ کر گھبرا جاتی ہے اور ماں کی پشت پر پناہ کے لئے چھپتی ہے جو باپ سے بھی خوف زدہ رہتی ہے اور اس کے باوجود اس کے چھوٹے موٹے کام کر کے، اس کی گڑگڑی میں آگ جما کر خوش ہوتی ہے، جو کپڑے دھوتی ہے اور چھوٹے بھائیوں کو کوئلے پر لادے رہتی ہے۔ ناریل کے جھنڈوں میں آنکھ مچولی کھیلتے کھیلتے بڑی ہوتی ہے اور تالاب میں ڈبکیاں لگاتے لگاتے ذرا ذرا سے خواب دیکھتی ہے۔ چوڑی والے کے آنے پر ریشمی چوڑیوں کے لئے ضد کر کے روتی ہے اور اپنی پھٹی ساڑھی کو نہایت حسرت سے تکتی ہے کہ کس دن اسے کوئی نیا کپڑا نصیب ہو گا۔"

میں نے سوچا بھلا اس کی کیا عمر رہی ہو گی؟ جیسے بادشاہ کے سامنے پیش کی جانے والی عورتوں

میں سب سے خوبرو، بیش قیمت اور ایک خزانے کی سی ہو جس کا قد نہ چھوٹا ہو اور نہ بہت لمبا جو نہ بہت دبلی ہو اور نہ ہی موٹی، گدرائے ہوئے جسم کی، چمپئی رنگت والی جو حسین ہونے پر بھی بہت حسین نہیں لگتی ہو عورت ہوتے ہوئے بھی دیوی لگے۔ چھونے میں نرم اور پگھلتی ہوئی مگر گرمی میں اس کا قرب فرحت بخش اور سردی میں خوشگوار دھوپ کی طرح ۔۔۔ مہکتی ہوئی جیسے صندل ہو اور اس کا منہ کنول کی سگندھ دیتا ہوا ۔۔۔ مجھے یاد نہیں آ رہا تھا کہ میں نے یہ کہاں پڑھا تھا کس نے مجھے یہ سنایا تھا ۔۔۔ جیسے شعر یاد آ تے مگر شاعر کا نام ذہن سے اتر جاتا ہے۔

" امریکہ کے مقبول شاعر رابرٹ فراسٹ سے کسی نے دریافت کیا وہ کون سا واقعہ ہے جو آپ کی زندگی پر سب سے زیادہ اثر انداز ہوا؟ فراسٹ نے جواب دیا " جب میں بارہ سال کا تھا تو ایک موچی کے ہاں کام کرتا تھا اور دن بھر منہ میں کیلیں دبائے پھرتا تھا۔ آج میں جو کچھ بھی ہوں اور جس مقام پر بھی ہوں اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ سانس لیتے وقت میں نے وہ کیلیں اور کوکے نہیں نگلے "۔

" سبھی کی مسکراہٹیں اور ہنسی ایک جیسی نہیں ہوا کرتی۔ فالسٹاف قہقہہ لگاتا ہے تو روم روم مسکرا اٹھتا ہے۔ کوئی بڑا گرتا ہے تو چھوٹے قہقہے لگاتے ہیں۔ قومیں جب اللہ کی زمین پر اترا اترا کر چلنے لگتی ہیں تو زمین اپنے ہی زہر خند سے شق ہو جاتی ہے اور تہذیبیں اس میں سما جاتی ہیں۔ شیر خوار بچے خوش ہوتے ہیں تو کلکاریاں مارتے ہمک ہمک کر ماں کی گود میں چلے جاتے ہیں۔ ادھر مونا لیزا ہے کہ صدیوں سے مسکرائے چلی جا رہی ہے اور ایک مسکراہٹ وہ بھی ہے جو نروان کے بعد گوتم بدھ کے لبوں کو ملکا سا خمیدہ کیے اس کی نظر میں جھلکا دیتی ہے"۔

مشتاق احمد یوسفی: زرگزشت

جمیلہ ہاشمی

شدّت

کھپ کے پودے پر اپنی تحقیقات مکمل کرنے کے لئے مجھے دین گڑھ جانا تھا اور اس لئے میں یزمان کی بستی میں لاریوں کے اڈے پر بیٹھا محکمۂ زراعت کے اس انسپکٹر کا انتظار کر رہا تھا جس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ یہاں آکر ملے گا سواری کا بندوبست بھی کر دے گا اور مزید اگر کسی چیز کی ضرورت ہوئی تو مہیا کرے گا۔ بینچ پر پہلو بدلتے بدلتے میری کمر دُکھنے لگی تھی دو چار جوان مارے تجسس کے گھڑی گھڑی میرے قریب سے گزرتے تھے اور کھانستے تھے۔ ادھیڑ عمر کے راہی نہایت عجلت میں سلام کرتے اور چلتے چلے جاتے۔ سگریٹ اور چائے کی دکان پر گاہک نہ ہونے کے برابر تھے۔ اونٹوں کی قطاریں، کجاووں میں بچے اور عورتیں رنگین کپڑے اور ہچکولے سب گڈمڈ ہوتے ہوئے گزر رہے تھے۔ مردوں کے ٹھٹھوں کی آوازوں پر شام کی ہوا گویا ہولے ہولے پر پھڑپھڑا رہی تھی۔

بے چین ہو کر میں نے اپنے تھیلے میں سے رنگین تصویر رسالہ نکالا جس میں صحراؤں کے مختلف مناظر تھے۔ نیلاہٹوں سے بھرے ویرانوں کی دل فریبی، تنہا کھجور کے اونچے تناور اور قدیم درخت ڈھلتی دھوپ میں اِکا دُکا قدموں کے نشانوں سے زیادہ ہوتے ریت کے لہریئے جو بل کھاتے لگتے تھے۔ اونچے ٹیلوں پر چڑھتے سورج کی لالی کا گلال۔ طویل سرابوں پر ہرنوں کی ڈاریں، ہرنیوں کے چوکنے بچے ذرا ذرا سی دُمیں اٹھائے بھاگنے کو تیار۔ رنگین لمبی کلغیوں اور بڑی بڑی دُموں والے پرندے جو جھاڑیوں میں چھپ کر بیٹھے تھے آڑمیں ہو کر صحرا پر جھانکتے ہوئے تیتر۔ اُفق کے قریب ملتے ہوئے جذبوں کی شدت سے تپتے ہوئے زمین و آسمان۔ شرمیلی مسکراہٹوں والی سیاہی مائل نیلی راتیں۔ سہاگ سنگار کو تاروں بھرے آنچل میں چھپائے اور کہیں کہیں زرد و بیمار آہستہ خرام اکیلا چاند تیتر کے پروں جیسی بدلیوں کے قید خانے میں گھبرایا ہوا۔ اونٹوں کی لمبی قطاروں کے قدموں تلے نامختتم پُراسرار راستے

"کہاں جانا ہے؟" ایک نوجوان نے پوچھا۔ وہ بینچ کے قریب کھڑا تھا۔

"دین گڑھ"

"دین گڑھا" اس نے دہرایا اور پھر بے یقینی سے کہا "دین گڑھ!"

"ہاں دین گڑھ" میں نے مسکرا کر اپنے بہترا خلاق کا گویا مظاہرہ کیا۔

"مگر صاحب بہادر" اس کی آواز میں طنز نہیں تھا "دین گڑھ تو یہاں سے کم ازکم پچاس میل ہے وہ بستی جہاں موٹر جاتی ہے دس میل دور ہے اس کے بعد ہم لوگ تو پیدل چلتے ہیں۔ آپ کیا کیجئے گا کبھی کبھی تو اونٹ بھی کرائے پر نہیں ملتے۔"

میں نے جواب دینے سے پہلے اپنی موہوم امید کے سہارے پھر محکمہ زراعت کے انسپکٹر کے لئے دور تک نگاہ ڈالی۔ لوگوں کی ایک چھوٹی سی بھیڑ اس جگہ جمع ہو گئی تھی اور سب اپنی اپنی کہہ رہے تھے۔ شام بڑی تیز سرسراہٹ سے کچے راستوں پر دھول اڑاتے ریوڑوں کے تعاقب میں گویا بھاگ رہی تھی۔ بھیڑوں کے میمانے کی آوازیں موسیقی کے ختم ہوتے بند کی طرح دور ہوتی جاتی تھیں۔ لوگ اپنی اپنی کہہ رہے تھے نزدیک ترین مگر نہایت مشکل راہوں کے متعلق آپس میں بحث کر رہے تھے۔ نہایت محبت سے گویا وہ مجھے اپنی ذمہ داری سمجھ کر میری طرف سے فکر مند تھے۔

"وہ لاری جو آپ کو بنگلے تک لے جاتی سہ پہر کو ہی چلی گئی ہے اور اب آٹھ دن کے بعد دوسری لاری ملے گی۔ ہماری مانیں تو آپ بنگلے تک کسی طرح چلے جائیں۔ وہاں سے اللہ کرے کوئی نہ کوئی اونٹ کرائے پر مل جائے۔"

"اونٹ پر دن کے وقت یہ کہاں سفر کر سکیں گے؟ دیکھتے نہیں ہو" کسی نے کہا۔

میں دلچسپی سے ان کی باتیں سن رہا تھا اور واپس لوٹ جانے کے امکانات پر دل ہی دل میں غور کر رہا تھا۔ میں جو محکمے کی ترقی کا خواہش مند تھا اور اپنا آپ ثابت کرنے کی شدید خواہش رکھتا تھا کھپ کے پودے اور ریشے کے لئے صحرا کی گرمی برداشت کرنا دلوانے کا خواب تھا اور میں نے پرسکون دفتر میں اپنے ڈائریکٹر جنرل کے سامنے یہ خواب دیکھا تھا جس کی تعبیر کے لئے پتہ نہیں مجھے کہاں کہاں خوار ہونا تھا۔ مگر میرے اندر کے مسئلے کا ان کی باتوں سے کوئی تعلق نہ تھا۔ وہ اپنی باتیں اور دین گڑھ جانے تک کی قیاس آرائیاں کئے جاتے تھے۔

جھومتے ہوئے اونٹوں کے ہوا رہے تھے، ہوئے ہلکے کرتے اور رنگین تہبند پہنے مضبوط مردوں کا ایک

قافلہ پانی کے حوض پر اُترا۔ جوان عورتیں ٹخنوں سے اونچے گھاگرے پہنے، لڑکیاں گندھی ہوئی چُٹیا
میں چاندی کے پھول پروئے ہوئے، پیلے آنچلوں میں سفید چوڑیوں سے کہنیوں تک بھرے ہوئے
بازوؤں والی بوڑھی عورتیں۔ گھونگھٹ ماتھے تک سرکائے ہوئے بھویں نہایت بھاری گھاگرے پہنے جو چال
میں یوں گھومتے تھے جیسے لہر کا رخ کسی کنارے سے ٹکرا کر لوٹتا ہو اور بنا بیاہی جوان لڑکیاں سادہ اور نگین
کپڑوں میں ہرنیوں کی سی بدکنے والی چالیں۔ بچوں نے میٹھی گولیاں اور چنے خریدے۔ لڑکوں نے بڑی بڑی
آستینیں کہنیوں تک چڑھا کر منہ دھوئے اور مشکیزوں میں پانی بھرا ادھر ادھر کی خبریں سنائیں۔

"لو بابو یہ لوگ دین گڑھ جا رہے ہیں۔ اگر چاہو تو ان کے ساتھ جا سکتے ہو۔" لوگوں نے گویا اپنے فرض
سے سبکدوش ہو کر کہا۔ "یہ اونٹ بھی کرائے پر دیں گے اور ساتھ بھی رہے گا۔ اکیلا آدمی پہلی بار سفر نہیں کر سکتا
کھانے پینے اور پانی کے ٹھکانوں کو ان سے بہتر کون جانے گا یہی ساتھ ٹھیک رہے گا۔" سب نے کہا۔

جب میں ان کے ساتھ یزمان سے نکلا ہوں تو سائے گہرے سیاہ اور بہت لمبے ہو چکے تھے۔ سورج آگ
کے گولے کی طرح تپا ہوا سرخ تھا اور مغرب کے سمندروں میں بجھایا جانے والا تھا۔ ہوا لوہار کی بھٹی کی آخری
سانس تھی کہ تپش اور چنگاریوں کے ساتھ ساتھ ٹھنڈی ہو رہی تھی۔ ہم رو ہی کی طرح بڑھ رہے تھے اور اس آخری
پل کو بہت پیچھے چھوڑ آئے تھے جو یزمان کے جنوبی علاقوں کو سیراب کرنے والی نہر پر تھا اور جس پر سے
ہر آٹھویں دن کھڑکھڑاتی ہوئی، ڈھیلے انجر پنجر والی پرانی لاری کچی سڑک پر دھول اور ریت اڑاتی گزرتی تھی۔ یہ
دھول جو راہ کے ساتھ کی جھاڑیوں پر غازے کی طرح چپکی ہوئی تھی۔

کجاوے میں ایک طرف میں سوار تھا اور دوسری طرف توازن کے لئے ان کا الم غلم سامان بھرا تھا
ہچکولوں سے میری آنکھیں خود بخود بند ہونے لگیں۔ اونٹوں کے گلے میں بندھی گھنٹیوں کی موسیقی میں لمبی تانوں
والے راگ جو آگے مہار پکڑ کر چلنے والے جوان اُٹھاتے تھے اور کبھی کبھی اس میں عورتوں اور لڑکیوں کی
آوازیں بھی مل جاتی تھیں۔ یہ لوریاں تھیں جو سمجھ میں نہیں آتی تھیں مگر ان کی سرد مٹھاس نہایت خواب آور
تھی۔ کجاوے میں جگہ کم تھی اور اس میں بیٹھنے کا یہ میرا پہلا تجربہ تھا۔ مگر جانے کیسے مجھے نیند آ گئی۔

اس ٹھنڈک کے احساس سے جو ریت پر بہتی ہوا اپنے ساتھ لاتی ہے میں جاگ گیا۔ اونٹ ٹہلتے
جا رہے تھے اور تاروں کے اجالے میں جھاڑیوں کی مختلف خوشبوئیں جادو کے دیس کی سی آوازوں میں ملی
تھیں کیونکہ پرندے سوتے میں چونک گئے تھے۔ کال کڑچھی باریک چیخ کے ساتھ ہمارے قریب سے تیر کی

تیزی سے اڑتی پھر واپس آتی اور فضا کے سنجیدہ سکون کو پریشان کر رہی تھی۔

"یہ چادریں تو شتر اب اوڑھ ہی لی:" قافلے کے سالار نے خوش دلی سے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھایا۔

میں ذرا سا ہچکچایا۔ "یہ تو اونٹ کے کرائے میں شامل نہیں تھا"۔

ہنس کر اس نے کہا تھے تو بابو تم ہمارے بچے ہو۔ یہ ریت اور آندھیوں کا ملک ہے۔ یہاں راتیں ٹھنڈی ہوتی ہیں اور پھر ہم میں سے کسی نے ابھی تک اس چادر کو نہیں پہنا"۔

میں نے خاموشی سے چادر کو اپنے گرد لپیٹ لی۔

جھاڑیوں کی آگ کا الاؤ روشن تھا اور عورتیں روٹی پکا رہی تھیں۔ بچے سوتے میں سے اٹھائے جا رہے تھے۔ عجیب دل خوشی اور گہما گہمی تھی۔ سروں کے اوپر قریب اترے ہوئے تارے دودھیا کہکشاں گھومتی ہوئی مستانہ خرام ہوا جیسے ہم دنیا کے پہلے یا دنیا کے آخری انسان تھے۔ آگ کے لپکتے شعلوں میں بہوؤں کے تپے گالوں کا رنگ ان کی آنکھوں کی چمک اور ان کی آوازوں کی موسیقی بھری نازکی میں گھلا ہوا تھا۔ اونٹنی کے تازہ دودھ کا برتن اور گرم روٹی کی خوشبو اور رس سے بھرے تھے اور تب مجھے یاد آیا کہ میں نے تو دوپہر کی دھوپ میں کچھ کھایا ہی نہیں تھا۔ اس کھلے نیلے خاموش آسمان کے نیچے جھاڑیوں میں جوئے سرسرا رہے تھے اور پرندے چونک چونک کر گویا کہانی سنتے ہوئے ہنکارے بھرتے تھے۔ پروں کی تیز پھڑپھڑاہٹ سن کر میں نے اوپر دیکھا تو میرے میزبان نے کہا "یہ سیاہ تیتر اور تیلور ہیں۔ آگ کو دیکھ کر جاگ گئے ہیں اور بے چین ہیں"۔

"سیاہ تیتر" میں نے حیرت سے کہا۔

"ہاں سیاہ تیتر جو سویرے جاگتا ہے تو خدا کی پاکی بیان کرتا ہے عبادت کرتا ہے"۔ اس نے کہا۔

"اچھا! سنا تھا وہ گھنے درختوں اور جنگلوں میں ہوتا ہے"۔ میں نے نمکین دودھ کا آخری گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔

"بابا پانی کی پیاس ہے"۔ ایک چھوٹے بچے نے اپنے دادا سے کہا۔

بوڑھے قافلہ سالار نے کھڑے ہو کر اپنا چہرہ ہولے ہولے چاروں طرف گھمایا جیسے محبت کے سحر آگیں بوسوں تلے آنکھیں جاگیں پر کھلیں نہیں۔ اس کی بند آنکھوں تلے روشنی جاگی پر سکون چہرے پر پھیکی مسکراہٹ میں ہوا کی طرح گھلی۔

"ہاں مٹھو!" اس نے بچے کو اپنے کندھے پر بٹھا لیا "تُو تو بڑا سیانا ہو گیا ہے۔ ارے پانی تو او پر ہی کو آ رہا ہے۔" اس کی آواز خوشی کی پکار تھی۔

"پانی آئے گا۔" سب ایک ساتھ بھاگے۔ جوانوں نے تیزی سے اپنی کدالیں کجاووں میں سے اتاریں اور تقریباً سخت جگہ کو دیکھ کر کھودنے لگے۔ عورتوں نے اون کے رنگ برنگ بھاری کپڑوں سے سامان کو ڈھک دیا۔ مہمان کا استقبال کرنے کو تیار ہو گئے جو ان جانے دیسوں سے اُن کی جانب آتا ہو۔

سُبل مہمان کو فلاشی دے دو۔" بڈھے نے کسی سے کہا اور خود کدال لے کر بیٹوں کی طرف چلا گیا۔

اس قافلے میں صرف میں تھا جو چپ چاپ یہ تماشہ دیکھ رہا تھا جسے کچھ کرنا نہیں آتا تھا۔

"یہ لو۔" ایک لڑکی نے بھاری کپڑا مجھ پر تقریباً پھینک دیا۔ ملائم مگر مضبوط۔ پتہ نہیں یہ کپڑا انھوں نے کہاں سے خریدا تھا۔

"کھمن کھمن۔" بچے چلائے۔ سیاہ گہرا دھواں ساتاروں کو ڈھانپتا چلا آتا تھا۔ تیزی سے روشنی کی اور لوگوں کے درمیان ایک پردے کی طرح تن رہا تھا۔ عورتوں نے آگ پر ریت ڈال کر اسے بجھا دیا تھا۔ ایک گہرا سناٹا چاروں طرف چھا گیا۔ منتظر منتظر اور لرزاں ہوا بھی تھم گئی تھی۔

پانی سے بھرے خیمے میں بڑھیا نے کہا "اور کھمن تلوار کی سی ہے۔" پھر دم دم جیسے کوئی شمع لئے ہوئے کھلے ایوانوں میں کوئی شے کھوجتا پھرے، سارے بادل جھک جھک روشن ہو گئے۔

"بہت پانی پڑے گا۔ اتنا کہ ایک سال کے لئے کافی ہو۔" بڑھیا نے کہا اور کوئی بولا تک نہیں۔ اجنبی خوشبوئیں ایک جھونکے کی طرح آئیں پھر ہوا جھاڑیوں میں سرسرائی اور پہلی بوند ٹپ سے میرے ماتھے پر گری۔ زمین تالیاں بجا کر گویا پانی کے آنے کی خوشی میں گانے لگی ہو۔ ہمیں آوازوں اور پانی نے گھیر لیا۔ سن سن کر کے تپی ہوئی ریت بجھ گئی۔ میں فلاشی کا خیمہ سا بنائے بیٹھا تھا اور اونٹ کی اوٹ میں تھا جو گردن بڑھا کر بلبلاتا تھا اور ہماری مسرت میں شریک تھا۔ پانی کی چادریں بجلی کے لہریوں اور بادل کے اندھیروں سے ہم پر پردوں کی طرح گرائی جا رہی تھیں۔

"تم بھیگ تو نہیں گئے؟ تمھیں ڈر تو نہیں لگ رہا؟" بڈھے نے نہایت اپنائیت سے پوچھا۔

"بے چارے کو ڈر تو لگ ہی رہا ہو گا۔" عورتوں میں سے کسی نے کہا۔

"یوں مت کہو مرد تو انجانے سے لڑ جاتے ہیں اور یہ تو صرف پانی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس

نے کبھی میں اتنی برسات ہوتی کبھی نہیں دیکھی ہوگی۔" پتہ نہیں یہ کون تھی۔ دھاروں کے درمیان ہم جیسے بھنوروں کے بیچ ہوں۔ بہتے بہتے پانی میں گر جاتے اور پھینکے اور گھمائے جاتے۔ بھک سے روشنی ہوتی اور گڑگڑاہٹ سے رستہ گزر جاتے اور پن چکی کے پاٹ رگڑ کھا کر چیختے۔ قدرت کی وحشی طاقتیں یکایک آزاد ہوگئی تھیں۔ ہوا ہنستی اور پانی کی چادروں کو پورے زور سے جھٹکتی پھر جھک کر بھاگتی اور چک پھیریاں کھا کر گرتی اور سنبھلتی۔ اندھیرا بادل کے ایوانوں میں روشنی کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتا تھا اور غصہ و رنجیدگی کے ساتھ آگ انھیں کوڑے مارتی اور بے فائدہ روکتی تھی۔ زمین چپکے چپکے ہنستی، روکنے کی کوشش میں ٹھنڈے سانس بھرتی تھی اور بے کسی سے گویا دامن پھیلائے ہوئے تھی۔ بھیڑ بکریاں اچانک ممیاتیں اور پھر چپ ہو جاتیں۔ پانی پڑ رہا تھا، بے رحمی سے ہنکار کے۔ ظالم دشمن کی طرح چھا گیا تھا۔

اگلی صبح ہم تازہ دم نہائے ہوئے اونٹوں پر آگے چل رہے تھے۔ بانسری کی طرح صحرا راگوں سے بھرا تھا۔ ہزار تانیں اَن دیکھے پرندوں کی بولیاں۔ ریشمی سرسراہٹ سے بہتی ہوئی ریت اور پانی میں جھلکتا سبزہ۔ اونٹ کی مہار میں بندھی ہوئی چھوٹی چھوٹی گھنٹیاں جیسے جل ترنگ اور باری باری اپنی الگ الگ راگنیوں سے بج رہی تھیں اور پھر بھی وہ ان تانوں سے اوپر نہیں اٹھ رہی تھیں جو کوے اور کاونیاں جھاڑیوں میں آ آ رہے تھے۔ چرواہے بکریوں اور مویشیوں کے گلے چراتے پھرتے تھے اور ناز بھری لمبی نے والے راگ گا رہے تھے۔ گھاس میں ہر طرف لیں لیں سنائی دیتی تھی۔ گویا کسی بڑے باجے کے سُر بجانے سے پہلے درست کئے جا رہے ہوں۔ میں گھبرا کر ایک ٹوبے کے اونچے کنارے پر کھڑا ہو گیا اور آوازوں کی سمتوں کی دریافت کے لئے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ وہ سب کچھ پکانے میں لگی تھیں۔

"یہ جادو نہیں ہے۔ جانوروں کے گلوں میں گھنٹیاں ہیں کہ وہ گم نہ ہو جائیں ان کی الگ الگ پہچان رہے۔" یہ شاید سنبل تھی۔

"یہاں گم ہونے کے لئے کون سی جگہ ہے؟" میں نے کہا۔

"واہ کیا گم ہونے کے لئے جگہ کی ضرورت ہوتی ہے جسے گم ہونا ہوتا ہے ہو جاتا ہے۔" وہ سخت خفا تھی۔

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"کیا دیکھتے ہو اجنبی نہمان ماں پوچھتی ہے کہ تم کو روٹی کے اندر پکا دیں کہ تم گڑ سے روٹی کھاؤ گے؟"

"سب ٹھیک رہے گا۔" میں نے ٹوبے میں جھانکتے ہوئے جو صحرا میں کسی آنکھ کی طرح گہرا، کھلا ہوا روشن اور ٹھنڈا تھا، چشمے کی طرح نغمہ طراز اور پُر غرور۔

دائی۔ لانے اور بھوگ پر بہار آئی تھی۔ اٹھی اور پپیہے بول رہے تھے اور ڈھلی ہوئی ریت یوں چمکتی تھی جیسے اس کے ہر ذرے میں آفتاب اُترا ہوا اور صحرا آئینہ خانہ ہو۔ بکھری افق پر دو نیلے دھبے سے دکھائی دے رہے تھے۔ "وہ ساون کی جھوک ہے۔" ایک نوجوان نے مجھے روٹی پکڑاتے ہوئے کہا۔

"اچھا لوگ اکیلے اکیلے بھی رہتے ہیں۔" میں نے نوالہ توڑ کر منہ میں بھر لیا۔

"یہ تو پھر بھی دو چار گھر ہیں۔ روہی میں تو ایک ایک گوپے کی جھوک ہوتی ہے۔"

بڑھیا نے مہربان مسکراہٹ سے میرے سر پر ہاتھ پھیرا "اچھا ہوا تم آ گئے۔ تمہارے قدم کی برکت سے روہی وقت سے ذرا پہلے آباد ہو گئی ہے۔"

"اماں میں تو ان باتوں کو نہیں مانتا۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"نہ مانو تمہاری مرضی۔" اس کی آنکھوں کی چمک بڑی گہری تھی جیسے جھیل کی سطح کرن سے جگمگائے روشنی کسی آئینے کو چھو لے۔ بادلوں کی سفیدی کے مقابلے میں یہ آنکھیں حیرت انگیز طور پر صحت مند تھیں اور معصوم ٹوبے میں آسمان اترا ہوا تھا۔

اونٹ جھاڑیوں پر منہ مار رہے تھے۔ بچے ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ کر پتنگوں کو پکڑ رہے تھے جو جھاڑیوں کے تنوں سے نکل رہے تھے۔ چھوٹی لڑکیاں اونٹوں کی ٹانگوں کے اندر باہر آنکھ مچولی کھیل رہی تھیں۔ بہوئیں اپنے منوں کو دودھ پلا رہی تھیں اور ریشم کے تاگوں سے کپڑوں پر بیل بوٹے بنا رہی تھیں کنواری لڑکیاں ڈنٹھلوں سے ریشے الگ کرتی جاتی تھیں اور جوان سوت بٹنے میں ان کا ہاتھ بٹا رہے تھے جیسے سکون کے ساتھ گاؤں آباد ہو گیا ہو۔ بڈھے نے اکتارہ نکالا۔

روہی لگڑی اے سانونی — ٹُرت رلا ہوت بہاراں
کھنیاں کھمن رنگیلڑیاں — رم جھم بارش باراں
سارے سکھن سہا گڑے — بار ملم آ باراں
بدلے گوڑے سانورے — وچ برسات دیاں دھاراں
کارن ٹھڑے یار دے — گل گلزار بہاراں

سوہنا عرشی سانورا   آ لہو ساڈیاں ساراں

وہ ایک ایک بول کو کئی کئی بار ڈہراتا تھا اور آنکھیں بند کیے کے میں کھو گیا تھا۔ بچے کھیل چھوڑ کر آلتی پالتی مار کر ریت پر بیٹھے تھے۔ بہوؤں نے اپنے بیل بوٹوں والے کپڑے الگ رکھ دیئے تھے۔ جوان لڑکے رسی بٹتے ہوئے جھومتے جاتے تھے۔ مجھے اپنے اندر ساری حرکتیں رک کر ایک نقطے پر جمع ہوتی لگتی تھیں۔ دل زور زور سے دھڑک رہا تھا اور پاؤں تال دینے کے لئے گویا بے چین تھے۔ پھر شبل کا سر اس کے گھٹنوں پر جھکتا چلا گیا جیسے اسے نیند آ رہی ہو۔ سسکیاں روکنے سے اس کا سارا جسم ہل رہا تھا۔ اکتارے پر لے تیز سے تیز ہوتی گئی۔ بجانے والا اپنا خونِ دل تاروں میں لگا رہا ہو۔ عبادت گزار کی طرح اپنے سارے اندر اور باہر کے جذبوں کے ساتھ۔

بڑھیا نے شبل کے گندھے ہوئے بال کھول دیئے۔ فضا یک لخت بہت بوجھل ہو گئی۔ ان منے دل اور بھاری قدموں سے اپنے وجود کو گھسیٹتی وہ دونوں ہاتھ ٹیک کر اپنے گھٹنوں تک اٹھی اور کسی نامعلوم محبوب کے سامنے جھک گئی۔ لمبے سیاہ بال کوڑوں کی طرح سیدھے ہوئے اور گردن بے پناہ رفتار سے گھومنے لگی جیسے ان کوڑوں کی زد سے بچنا چاہتی ہو۔ اکتارے پر بڈھے کی انگلیاں بے پناہ مشاقی سے چل رہی تھیں۔ زندگی اور موت کے مقابلے میں وہ بھی ہارنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا اور نہ ہی شبل ٹھہرنے کا۔ میری رگوں میں سنسناتی خون کی روانی خود ہی سرد پڑ گئی۔ جانے کتنی دیر بعد لڑکی کا سر اس کے کندھوں پر کم رفتار سے گھومنے اور تھکنے لگا پھر وہ ڈھے گئی اور بڑھیا نے اسے اپنے زرد ململ دوپٹے سے ڈھک دیا۔ مرد سوت کو اٹیرنوں پر لپیٹنے لگے۔ بڈھے نے اکتارے کو کجاوے میں رکھ دیا۔

"ہم تو آپ روہی کی روحیں ہیں۔" وہ بات کرتے ہوئے ڈرتا تھا اور نہایت اداس تھا۔

یہ راستے کسی زمانے میں آباد تھے خوب رواں تھے۔ تباہی کی ہوائیں چلیں اور فنا نے ہر شے کو ڈھانپ لیا۔ بے چین مخلوق نے یہاں وہاں قبضہ کر لیا۔ اب وہ کبھی کبھار کسی کو بے ڈھب پکڑ لیتی ہیں۔

لڑکی زرد دوپٹے کے نیچے آہستہ آہستہ ہلی۔ اسے ہوش آ رہا تھا۔ عورتیں مل کر اسے دبانے لگیں۔ بڑھیا نے اسے گھی ملا دودھ پلایا۔ اس کا چہرہ بالوں کی سیاہی میں دوپٹے سے بڑھ کر زرد تھا۔ وہ اتنی تھکی ہوئی تھی گویا زمانوں سے پیدل چلتی آئی ہو۔ کسی روح نے اسے نہایت بے ڈھب پکڑا تھا۔ دوسری رات ہم نے ساون کی جھوک سے آگے نکل کر پڑاؤ کیا۔ اونٹنیوں کے دودھ کی نمکین خوشبو روٹی کی رسیلی باس

سے ملی تھی اور بچوں کا رونا الگ لگتا تھا۔ بہوئیں، لڑکیاں اور لڑکوں کو جگا اور سلا رہی تھیں۔

میں نے شبل سے کہا "آج تو تم کل کے تماشے کو نہیں دُہراؤ گی؟"

اس نے منہ پھیر لیا۔ سفید دیدے گھما کر میری طرف دیکھا اور ذرا سا مسکرائی تک نہیں۔

اونچی گھاس چاروں طرف تھی۔ بڑھیا نے کہا کیمپ کا لڑکو۔ ذرا کچا بھی ہو تو کیا ہے۔ اس کے دھاگے سے ہم شبل کے بیاہ کا جوڑا بنا لیں گے۔ درانتیاں لے کر سب کاٹنے میں لگ گئے۔ میں گٹھے باندھنے میں ان کی مدد کر رہا تھا۔ گٹھے بندھواتے ہوئے میں نے پھر کہا "شبل تمہارے بیاہ کے جوڑے میں میرا ہاتھ بھی لگ گیا ہے"۔ اس نے گردن کو اور اونچا کر لیا۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھوں کو پورا کھول کر میری طرف دیکھا اور پھر منہ پھیر کر کام میں لگ گئی۔

یہ عجیب آزاد زندگی تھی میری دنیا سے یکسر مختلف سمجھے تو اس زندگی سے پیار ہو چلا تھا۔ کہیں جانے کی جلدی نہیں، کچھ کرنے کی جلدی نہیں، کوئی عجلت نہیں، کوئی ڈر نہیں، کوئی قانون نہیں اور پھر بھی ایک نظام ہے، مربوط اور سادہ جس سے ہر کام ہوتا ہے اور اندر بس امن ہی امن تھا، سکون ہی سکون نفرتیں کدورتیں، سب دھل دھلا کر گویا سب کچھ اجلا ہو گیا تھا۔ میں پہلی بار راتوں کی سجاوٹ کے جادو سے آشنا ہو کر ان کی محبت میں گرفتار ہوا تھا۔ رات کی آوازیں، اس کا سحر، ستاروں کی ان سنی جھنکاریں، لوٹتے ہوئے تاروں کی روشنی اور لکیریں۔ صرف رات کو بولنے والے پکھیرو۔ پچھلی راتوں کو خوشبو دینے والی گھاس کی سرسراہٹ، ریت پر نرم چلنے والی ہوائیں۔ سیاہی کے اندر سے پھوٹنے والی روشنیاں اور سناٹے کی گونج جیسے مجھ پر وجد طاری ہو رہی ہو۔

بے نام و نشان، بے سمت کی اس دنیا میں آسمان پر بکھرے لاتعداد تاروں میں سے چند کی رہبری میں سفر کرنا وقت کا اندازہ بھی ان کی مدھم پڑتی اور تیز ہوتی چمک سے کرنا۔ حیرت نے میرے اندر اپنے ڈیرے ڈالے تھے۔

"اگر تم محض کیمپ کے لئے دن لڑھ جا رہے ہو تو یہ تکلیف کیوں اٹھا رہے ہو"۔ بڑھیا نے لمبے ریشے کو دو انگلیوں کے درمیان آہستگی سے کھینچتے ہوئے کہا "مجھ سے بڑا ماہر تم کو ساری ردہی میں کوئی نہیں ملے گا"۔ وہ ذرا سا ہنسی "ہاں جوان"۔ میرے میزبان کے بیٹے نے کہا "ماں کو تو سب پتہ ہے"۔ پھر وہ مجھے بتاتی رہی کیسے موسم میں گھاس کے گٹھے بنائے جاتے ہیں اور سخت جاندار کپڑا بنانے کے

لئے اسے کاتا جاتا ہے۔ جب نرم اور ریشمی ملائم کپڑا بنانا ہو تو اسے بھگو کر رکھتے ہیں، کوٹتے ہیں اور زیادہ ملائمت پیدا کرنے کے لئے کونسی چیزوں کو اس میں شامل کرتے ہیں۔ کون سی جڑی بوٹیاں اس کام میں کہاں سے ڈھونڈی جا سکتی ہیں خوب گہرا رنگ دینے کے لئے کتنے دنوں لوہے کے برتن میں از زمین گڑھا کھود کر دبا دیتے ہیں۔ کون سے پھول کتنے مسلے جائیں تو کیا رنگ بنتا ہے۔

میں بے دلی سے سنتا رہا اور شبل کو دیکھتا رہا جو نہایت پرغرور اور بے حد کم گو تھی جس پر راگ سن کر عجیب کیفیت طاری ہوتی تھی اور جس کی زردی میں چاند کی روشنی گندھی تھی جو اجنبی مہمان کو ذرا سی ہمت دینے کو تیار نہ تھی۔

بڑھیا نے کہا "آتی سردی میں ہم شبل کا بوجھ اٹھا دیں گے پھر میرے چھوٹے بیٹے کی بہو آئے گی۔ کمپ کا کپڑا بنانے میں اس کا کوئی جواب نہیں۔ بہت سیانی ہے اور بڑی دلیر۔"

"مگر سبل تو بیمار ہے۔" میں نے کہا۔

"سب ٹھیک ہے بابو، یہ بیماری نہیں شدت ہے شدت۔ سمجھتے ہو شدت کیا ہوتی ہے؟"

میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"اس کو نظر ہے اوپر والوں کی پکڑ ہے۔ بہت اچھی صورت والوں کو شدت ہو جایا کرتی ہے۔ میری بہو کے بھائی کو بھی پکڑ ہے وہ۔ بڑا گھبرو جوان ہے جب دورہ پڑتا ہے تو ٹوٹے تنے کی طرح ڈھے جاتا ہے۔ ایسے ہی چلتا ہے۔ جب تک زندگی ہے سب چلتا ہے خود ہی ٹھیک ہو جاتا ہے اور موت کے آگے تو کسی کا زور نہیں۔"

میں ریشوں کو ہاتھ میں سے گزار رہا تھا اور بظاہر ان پر جھک کر خوب غور سے دیکھ رہا تھا۔ شبل نہایت ہوشیاری سے وہ پکے ڈنٹھل الگ کر رہی تھی جن کے ریشوں سے آئندہ سردی میں اس کی شادی کا جوڑا تیار کیا جانے والا تھا۔ ہرنوں کی ایک ڈار اونچے ٹیلے پر سورج کی لالی میں دکھائی دی گویا ہوا کی گنگناہٹ میں خطرے کی بو سونگھ رہی ہو۔ پرندے شور مچاتے ہوئے ہمارے سروں کے اوپر سے گزر گئے اور جھاڑیاں ہولے ہولے ہلنے لگیں جیسے ان کی آمد کی منتظر ہوں۔ فضا جاگی ہوئی چوکنی اور اپنی آوازوں کے ساتھ دن رات جاگتی ہے۔ اگر میں چند دن اور اس جادو کی سرزمین میں رہا تو اس طلسم سے رہائی ناممکن ہو جائے گی۔ اپنے دل پر میری گرفت یونہی سلامت سے کمزور ہے۔ ابھی سے یہ زمان مجھے کسی دوسری دنیا کا ٹھہرنے لگا تھا۔ ایسا دروازہ

جس کے بارے دنیا میں کبھی میں معلق تھا۔ اُس زندگی میں اور اس زندگی میں مجھے صدیاں حائل لگتی تھیں پر نئے رشتے جو میں نے ان دنوں آسمان اور زمین سے جوڑے تھے حیرت زدہ کرنے والے قدم قدم پر قدم پکڑنے والے تھے۔ فضا اور رنگ رنگینیوں کے دھارے آسمان پھول اور زندگی دینے والی زمین سے پہلی بار آشنا ہوا تھا۔ مجھے کھپ پر ساری تحقیق اور محکمے اور ترقیاں بیکار کا کھیل لگنے لگے تھے۔ وقت گنوانے کا ایک ذریعہ۔ مگر مجھ میں ہمت کی کمی تھی اس حیرت کدے سے ناتا جوڑے رکھنے کے لئے بڑھیا نے کہا "اگر تم نے کھپ کے ریشے سے کپڑا بنانے کا راز سمجھ لیا تو تم کو کیا ملے گا؟"

میں نے کہا "ہمارا ملک ترقی کر سکے گا ہم دوسروں کے مقابلے میں اپنا آپ ثابت کر سکیں گے۔"

"پھر کیا ہوگا اس سے آگے اور اس سے آگے۔" اس سادہ دل عورت نے مجھ سے نہایت مشکل سوال پوچھا۔ "اس سے آگے اور پھر اس سے آگے۔"

"کیا دھرا ہے ان سب باتوں میں۔ آدمی کی ضرورتیں ہی کیا ہیں؟" اماں نے مجھ سے کہا۔ اسے ملک اور ترقی جیسے بڑے بڑے لفظوں کے مطلب کیا سمجھ میں آتے۔

قافلہ سالار نے کہا "بچے تم اس کی باتوں میں مت آنا۔ تمہاری اپنی زندگی ہے مگر مجھے ایک بات سمجھ نہیں آتی۔ دنیا آگے جائے یا پیچھے آدمی کے لئے کیا فرق پڑتا ہے؟ تم دیکھتے ہو نا۔ دین گڑھ کے قلعے کو، ان پانچ کنوؤں کو، ان ملے ہوئے شہروں کو، یہاں سے پرے اور بھی ایسے نشان ہوں گے ہماری طرح ہم سے بہتر لوگ ہوں گے۔ پر وہ لوگ کہاں ہیں؟ موت اچھا بُرا برابر کر دیتی ہے۔" وہ چپ ہو گیا۔

بڑھیا نے کہا "اسے ایسی باتیں کرنے کا بہت شوق ہے۔" وہ ہنس رہی تھی۔

"ہاں بیٹے میں سوچتا ہوں ساری عقل لگا لو آخر یہی کچھ ہوتا ہے۔" وہ بیٹھے سے کھڑا ہو گیا اور اس نے اپنے دونوں ہاتھ پہلوؤں پر زور سے مارے "روہی اور اس سے آگے پھیلا ظالم دھو پیلا صحرا یہی کہتا ہے۔"

آسمان اور زمین کے ساتھ اپنے انوکھے جڑے ہوئے رشتے ٹوٹ جانے کے بعد میں سوچتا ہوں۔ بڈھے قافلہ سالار نے ٹھیک ہی کہا تھا ساری عقل لگا لو آخر یہی کچھ ہوتا ہے مگر کائنات سے آدمی کا رشتہ ٹوٹ جائے تو بہت فرق پڑتا ہے۔ کیوں صاحبو کیا فرق پڑتا ہے؟

اشفاق احمد

مانوس اجنبی

اسلام آباد بہت ہی خوب صورت شہر خموشاں ہے۔ صبح کے وقت اس خموشی کا مزا لینے کے لئے لوگ دور دور سے آتے ہیں۔ میں مرگلہ روڈ پر سیر کرتا ہوا اکیلا جا رہا تھا۔ ایک گھنٹہ اور بیس منٹ گزر جانے کے باوجود مجھے سوائے کھمبوں کے راستے میں اور کوئی نہیں ملا تھا ــــــ اور پھر اچانک ایک خاتون بڑے بڑے پھولوں کی پھپھوسی ساڑھی باندھے میرے قریب سے گزری۔ بیس قدم کے فاصلے پر جا کر میں نے اسے پلٹ کر دیکھا۔ بیس ہی قدم کے فاصلے پر وہ پلٹی۔

اس کی بینائی بھی کمزور تھی۔

اس کے بال بھی سیاہ تھے۔

وہ بھی وٹامن کھاتی تھی۔

وہ بھی کولون لگاتی تھی۔

اس کو بھی منسٹری سے بلاوا آیا تھا۔

اس نے بھی پی سی ون فارم غلط بھر دیا تھا۔

وہ بھی اسلام آباد میں صبح و شام سیر کرتی تھی۔

اس کی بھی ساری داڑھوں کی فلنگ ہو چکی تھی۔

اس کو بھی ایک سال کی اور ایکس ٹینشن مل گئی تھی۔

وہ بھی خوشدلی سے ڈھاکہ فال کا صدمہ سہہ گئی تھی۔

پتہ ہے کیا ہوا۔ سلیم بھائی میاں والی والے کی شادی تھی۔

اس کی پانچوں بہنوں کی بیسیوں سہیلیاں اس شادی میں شریک تھیں۔ سب شادی والے گھر ڈیرا ڈالا ہوا تھا۔ سلیم بھائی میاں والے خوشی سے پھولے نہیں سماتے تھے۔ لڑکیاں ڈھولکی پر زیادہ تر

بالوماہیا کے گیت گایا کرتی تھی ۔ مائیں، ماسیاں، پھوپھیاں اور چچی تائیاں اپنے اپنے پانچویں اور ساتویں بچے کے بعد خاوندی توجہ پر شیخیاں مارنے پر وقت گزارا کرتیں اور لڑکیاں ہر طرح کا ٹپہ گا جاتیں۔

جب میں سوٹ کیس اٹھائے دالان میں داخل ہوا تو ڈھولکی والیاں "شاوا" گا رہی تھیں اور ان کے شاباش یعنی "شاوا" کہنے پر بڑا زور لگ رہا تھا جیسے پینگ کا جھونٹا لیتے وقت گھٹنوں کو خم کر کے زور لگتا ہے بعض باتیں چھوٹی ہیں لیکن ان کے ٹکڑے بڑے لمبے لمبے ہوتے ہیں۔ شاوا کی طرح کے کئی گانے مختصر ہوتے ہیں لیکن چھوہارے کی طرح گلے پڑ جاتے ہیں گود میں اٹھاؤ تو پھسلتے ہی جاتے ہیں پھسلتے ہی جاتے ہیں۔

"ارے ارے ارے" کہہ کر لڑکیوں نے گانا بند کر دیا اور مجھے مخول کرنے لگیں۔ میں قریب ہی ایک پرانے مقدری مونڈھے پر بیٹھ گیا اور ان کے مخول میں چسکا لینے لگا۔ اس وقت میں نیا نیا ادیب بن رہا تھا اور میری چار پانچ کہانیاں چھپ چکی تھیں۔ ہفت روزہ 'قیام' میں میں نے ایک تنقیدی مضمون بھی لکھا تھا۔ 'چترا' میں میرا مزاحیہ خاکہ بہت پسند کیا گیا تھا اور میں "تو کون سی بدلی میں مرے چاند ہے آجا" بانسری پر بھی بجا لیتا تھا اور دو کلی بھی گا لیتا تھا۔ اپنی تمام تر شرافت کے باوجود مجھے پتہ تھا کہ میں کافی چندر بدن من موہن قسم کا لڑکا ہوں اور آئی سی ایس والے عبدالجبار سے دوسرے نمبر پر آتا ہوں۔ جبار بھائی کے چھوٹے قد، تنتی ہوئی بھنوؤں، پسینہ بھرے ہاتھوں اور گول تھوڑی کو ان کے آئی سی ایس کا غبارہ اڑائے پھرتا تھا انھوں نے بہت اچھے پرچے کئے تھے اور ساری لڑکیوں کے والدین ان پر فریفتہ تھے اور اپنے والدین کے تتبع میں لڑکیاں بھی ان پر جان چھڑکتی تھیں (اس زمانے میں جنریشن گیپ نہیں تھا اور اولاد اپنے ماں باپ کی دل و جان سے عزت کیا کرتی تھی) خدا کی قسم میں بھائی عبدالجبار سے دوسرے نمبر پر آتا تھا اور لڑکیاں اپنے والدین کی اشارت کے باوجود مجھ پر جان چھڑکتی تھیں لیکن ان کی جان چھڑکنے میں دوستی زیادہ ہوتی، محبت بھی کافی ہوتی، پر وہ غم نہ ہوتا اور وہ دکھ نہ ہوتا اور وہ کراہ نہ ہوتی جو ونتی کے عشق میں تھی یا کرشن چندر کے دوسرے افسانوں میں ہوا کرتی۔

جب میری خالہ زادوں نے اوئے اوئے اوئے کر کے اور میرے ساتھ ادھر ادھر اور پوں پوں قسم کی چھبیاں ڈال کر پھر ڈھولک سنبھال لی تو میں نے دیکھا کہ رولے والی کے پیچھے والی لڑکی کے ساتھ لگ کر ایک لڑکی دونوں زانوؤں پر ہاتھ رکھے التحیات کے انداز میں بیٹھی ہے اور اس کی چوٹی اس کے کندھے پر سے ہو کر اس کی گود میں ڈھیر ہے اور اس میں سیاہ ریشم کا موباف ہے اور اس کے آخر پہ

سوان انگ کی شیشی کے پیندے جتنے بڑے بڑے ہاتھی دانت کے چھتے ہیں۔ کانوں میں گہرے نیلے رنگ کے ٹاپس ہیں۔ گلے میں نسواری رنگ کا چُنا ہوا دوپٹہ ہے اور کندھے کے اوپر لیڈی ہیملٹن دو رنگ بدلتی ہے حالانکہ نہ لٹکتا ہوا بلب ہل رہا ہے اور نہ ہی اس کے کندھے میں جنبش ہے۔ ایک آستین کہنی تک الٹی چڑھی ہے اور دوسری کلائی پر بندھے اور بند آستین پر تین بٹن لگے ہیں۔ نومبر کی آفتابی کرن کے رنگ لئے۔ اور اس کے ہاتھ میں اور بازو میں تھکے ہوئے زانو میں اس کی بے توجہی ہے اور بے تعلقی ہے اور نفاست ہے اور اس کا موباف ہے اور اس کے بیٹھنے کا انداز ہے اور اس کے کندھے کا اور کمر کا اور ڈھولک او رنیچے دبے ہوئے پاؤں کے کچھ حصے کا خوب صورت سا پنسل سکیچ بنایا جا سکتا ہے پھر اس کا ادھر سے جس طرف رو ٹے والی بیٹھی ہے ایک پروفیل فوٹو بھی اتارا جا سکتا ہے۔ ٹو پوائنٹ ایٹ سنگل لینز ریفلیکس اپرچر الیون۔ ہنڈرڈ ٹو نٹی فائیو سپیڈ۔

یا پھر اس کے اس کندھے کے ساتھ لگ کر جہاں لیڈی ہیملٹن اپنا رنگ بدلتی ہے ایک چھوٹے سے جانماز پر کھڑے ہو کر نماز بھی پڑھی جا سکتی ہے۔

میں نے پہلے اس لڑکی کو اپنی خالہ زادوں کے گروپ میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اصل میں بیاہ شادیوں میں بہت سے ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جن کے ہونے پر کسی کو اعتراض نہیں ہوتا نہ ان کی بابت کوئی پوچھتا ہے نہ کوئی بتاتا ہے نہ کسی کو ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ پھر شامیانوں اور کراکری کے ساتھ ایسے لوگ بھی چلے جاتے ہیں۔

اس لڑکی کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ اس کو کسی کی پروا نہ تھی۔ ہماری جگہ اگر وہاں بھائی عبدالجبار بھی ہوتے تو بھی اس کو پروا نہ ہوتی۔ اصل میں وہ بڑی شفیق، بڑی خلیق بے حد ملنسار بہت ہی خوبصورت نہایت سیر چشم اور بڑی کائنڈ اور مہربان سی لڑکی تھی۔ اس لئے اس کو کسی کی پروا نہ تھی۔ ڈھولک بجتے ہوئے وہ ہر نئے مصرعے کو غور سے سنتی اور دوسرے مصرعے پر ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ داد دیتی۔ وہ ایسی نہ تھی جیسی گھمنڈی لڑکیاں ہوتی ہیں خواہ مخواہ۔ بے تکی، کاں کاں۔ وہ تو بوسکی کا تھان تھی ٹس ٹس چمکنے والی۔ گری نہیں پڑتی تھی۔ بزاز نکال کر دکھلائے گا تو دیکھے گی نہیں تو اپنے خانے میں رہے گی۔

جب میں کمرے میں داخل ہوا اور زور سے اوئے اوئے اوئے ہوئی تو نہ اس نے میری طرف دیکھا نہ اپنی جگہ سے ہلی نہ التحیات والی پوزیشن کو چھوڑا۔ میں نے سب لڑکیوں کو بتایا کہ پطرس صاحب پھر واپس آکر ہمارے پرنسپل لگ گئے ہیں اور مجھ سے بڑی محبت کرتے ہیں۔ پرسوں ہم دونوں تانگے پیچھے سیر صیاں

چڑھ رہے تھے ان کے ہاتھ اور میرے کندھے کے درمیان صرف چھ انچ کا فاصلہ تھا۔ مجھ سے بڑی ہی محبت کرتے ہیں۔ پھر میں نے ان کو بتایا کہ ہم ادیب لوگ کافی ہاؤس میں جمع ہوتے ہیں اور سردار راجندر سنگھ بیدی سلیٹی رنگ کی پگڑی باندھتے ہیں اور ان کی داڑھی بہت چمکدار اور سیاہ رنگ کی ہے میرے ساتھ بڑی محبت کرتے ہیں۔ دیوندر ستیارتھی موچی دروازے کے باہر سرکلر روڈ برکت علی ہال کے پاس ایک چارپائی پر بیٹھے ہوتے ہیں اور لوک گیتوں پر مضمون لکھا کرتے ہیں ان کے قریب سنگل بنانے کے کارخانے ہیں اور سنگلوں کی کڑیاں ویلڈ ہوتی ہیں۔ میں تقریباً ہر روز ان سے ملتا ہوں نہ جاؤں تو شکایت کرتے ہیں۔ لڑکیاں ڈھولک چھوڑ کر ذوق شوق سے میری باتیں سن رہی تھیں اور مجھ پر فخر کر رہی تھیں۔

میں نے ان کو بتایا کہ میں نے لاہور ریڈیو اسٹیشن پر پارٹ ٹائم نوکری کر لی ہے اور میرا کانٹریکٹ بن گیا۔ اس کانٹریکٹ پر ہمارے ڈی جی جناب ن م راشد صاحب کے دستخط ہیں۔ راشد صاحب کے دستخط ایسے ہیں جیسے سڑک پہ بجلی ٹوٹی تار کا گچھا کھل گیا ہو۔ اس کے درمیان اردو کے آٹھ جیسی گھوڑی سیڑھی ہو اور آگے تار کے گچھے چھوٹے ہوتے جائیں۔ رضیہ کا بلینک چہرہ دیکھ کر میں نے کہا "نہیں سمجھی بے وقوف"۔ اس نے نفی میں سر ہلایا تو میں نے کہا راشد صاحب اپنے دستخط چھوٹے این اور چھوٹے ایم سے شروع کرتے ہیں۔ این کے دو اور ایم کے تین کل پانچ چکر چھلے دار بناتے ہیں پھر بیچ میں راشد کا بڑا آر کھڑا کر دیتے ہیں اور پھر چھوٹے حروف ڈال دیتے ہیں۔ سب کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے کہ میں ن م راشد کے اس قدر قریب رہتا ہوں اور ان سے ہدایات لے کر اناؤنسمنٹ لکھتا ہوں۔ لڑکیوں نے کہا "ہمارے نام فرمائش بلوا سکتے ہو؟" میں نے کہا "ہر روز بلاناغہ۔ سب ایک ایک کرکے"۔

جتنے لڑکے اس وقت شادی کے اندر اور باہر کمروں میں اور تنبو کے نیچے گھوم پھر رہے تھے چھوٹے چھوٹے پیدے سے بن گئے۔ پھر دولہا میاں مسکراتے ہوئے اندر آئے اور آکر صوفے پر بیٹھ گئے۔ لڑکیوں نے ان کی طرف کوئی خاص توجہ نہ دی اور اسی طرح گاتی رہیں۔

رات کے وقت کھانے کے بعد جب لڑکیاں پھر ڈھولک پر آ بیٹھیں تو بجلی کا ایک فیوز چلا گیا۔ ماموں جان نے مجھے بلا کر میری ڈیوٹی لگائی کہ میں سوئچ بورڈ پر اس خرابی کو چیک کروں۔ ان کا خیال تھا کہ ریڈیو میں کام کرنے کی وجہ سے میں بجلی کے کاروبار سے اچھی طرح واقف ہو گیا ہوں۔ میں نے سوئچ بورڈ میں جاکر مین آف کیا تو اندر سے بڑے زور کی "ہا" بلند ہوئی اور شور و غل رک گیا۔ تھوڑی سی کوشش سے مجھے ایک ڈاہوا

فیوز مل گیا جسے میں نے تین باریک تاروں کی گت بنا کر لگا دیا۔ جب میں نے مین آن کیا تو ایک مرتبہ پھر اندر سے "ہا" کی آواز آئی۔ تمام بتیاں روشن ہو گئیں سرونٹس کوارٹرز بھی روشن ہو گئے لیکن پیچھے کا برآمدہ بدستور تاریک رہا۔ میں نے سوچا اس کی خبر کل صبح دیکھ لیں گے۔ پچھلے برآمدے میں روشنی کی ایسی کوئی خاص ضرورت بھی نہ تھی۔ ستھیا

جب میں پیچ کس اور پلاس ہاتھ میں لے کر واپس لوٹ رہا تھا تو اس تاریک برآمدے کے ایک کونے میں مجھے وہی لڑکی کھڑی نظر آئی۔ میں نے پلاس اور پیچ کس رضائیوں والی پیٹی پر رکھ دیا اور آگے بڑھ کر اس کی کلائی پکڑی۔ پھر ہم دو قدم آگے کو بڑھ گئے۔ اس کے بعد میں نے قدرے مضبوطی سے اس کو کھینچا تو اس کے قدم تیز ہو گئے اور ہم بڑی تیزی کے ساتھ ٹوٹی ہوئی پردہ وال سے نکل کر ساتھ کے پلاٹ میں اتر گئے جہاں ایک نئی کوٹھی بن رہی تھی۔

اس کوٹھی کے اندر دیواروں پر پلستر ہو چکا تھا لیکن فرش ابھی تک نہیں ڈالے گئے تھے مسلسل پانی لگنے کی وجہ سے ساری دیواریں رسی ہوئی تھیں اور اندر بڑی ٹھنڈک تھی۔ پتہ نہیں یہ کون کمرہ تھا ڈرائنگ روم یا ماسٹر بیڈ روم لیکن تھا کافی بڑا۔ اس کے اندر پاڑ کے بڑے بڑے پھٹے پڑے تھے اور فرش شپا شپ گیلا تھا۔ دروازوں اور کھڑکیوں کے چوکھٹ لگ چکے تھے ان پر پٹ نہیں چڑھے تھے۔ اندر سیمنٹ اور ٹھنڈے پانی کی خوشبو تھی اور اس خوشبو میں زندہ لگی چیل کی مہک بھی شامل تھی۔

ہم دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر پھٹوں پر بیٹھ گئے اور بڑی دیر تک چپ چاپ ایسے ہی بیٹھے رہے۔

اس کا نام امتل تھا اور وہ بہاولپور سے آئی تھی۔ وہ سمی کی ایک سہیلی نگہت کی سہیلی تھی اور لاہور سے گزر رہی تھی۔ امتل کے سر سے ایٹ کینسن ہیئر آئیل کی خوشبو آ رہی تھی اور اس نے اپنے کندھوں پر کیٹی کیورہ پاؤڈر چھڑا ہوا تھا۔ اس کی پلکیں اتنی لمبی تھیں کہ جب بھی اس کے کان میں سرگوشی کروں گال پر لگنے لگتی تھیں اور آنکھوں کی جھپک سے نفی اثبات کا ورد شروع کر دیتی تھیں۔ ان کی اپنی ایک بولی تھی اور تھوڑی ہی دیر میں یہ بولی سمجھ میں آنے لگتی تھی۔ امتل کے منہ سے ایسی خوشبو آ رہی تھی جیسے چھ ماہ کے بچے کو انرجی فوڈ بسکٹ کھلا کر اس کی ماں نے ابھی نہلایا ہوا تو لئے میں لپیٹ کر تکیوں کے درمیان بٹھا دیا ہو۔

جب ہم کافی دیر تک اسی طرح بیٹھے رہے تو اس نے آہستہ سے پوچھا "تم ریڈیو میں ملازم ہو؟"

"ہاں۔"

"کیا کرتے ہو؟"

"انااؤنسمنٹ کہتا ہوں۔"

"ہاں مصطفےٰ علی ہمدانی بھی ہے نا ـــ تمہارے ساتھ؟"

"ہے مگر بہت ہی ضعیف آدمی ہے۔"

"کیوں؟ ـــ اس کی آواز نوجوان کی سی ہے۔ بہت ہی خوبصورت۔"

"منہ میں اسٹیل کی پتری فٹ کرکے بولتا ہے بے چارا۔"

بہت ہی بھری آواز ہے۔"

"تم نے امتیاز علی تاج کو بھی دیکھا ہوگا؟"

"روز دیکھتے ہیں۔ بے چارے ایک ٹانگ سے معذور ہیں بیساکھی لگاکر آتے ہیں۔"

"ہائے اللہ ـــ یہ کیوں ـــ انھوں نے تو ورجینا میں کام کیا ہے؟"

"ورجینا میں کام کرنے سے ٹانگ تو نہیں ناں اُگ سکتی دوبارہ ـــ اچھے آرٹسٹ ہیں۔"

"اور دیہاتی پروگرام نظام دین ـــ اس کو بھی تو دیکھا ہوگا تم نے؟"

"دیکھا! وہ تو اپنا بچہ ہے۔ جتنی باتیں وہ اپنے پروگرام میں کرتا ہے میں ہی لکھ کر دیتا ہوں۔"

"ہائے اللہ ـــ سچ ـــ تم لکھتے ہو؟"

"شک ہے تو چلو کل میرے ساتھ ریڈیو اسٹیشن۔"

"نظام دین بالکل دیہاتی ہے یا کچھ پڑھا لکھا بھی ہے؟"

"تھوڑی بہت اردو پڑھ لیتا ہے۔ اپنے دستخط انگریزی میں کرلیتا ہے۔"

"نوجوان ہے؟"

"ہے تو نوجوان۔ لیکن اس کی ایک آنکھ پتھری ہے۔"

جب امتل کو اپنے تینوں ہیروؤں کی اصل حقیقت کا علم ہوا تو اس کا دل بجھ سا گیا۔ میں اسے گلے سے لگاکر دیر تک اس کا گال تھپتھپاتا رہا۔ اس نے میلے پر جانے والے بچے کی طرح میری انگلی پکڑی اور اپنا ماتھا میرے کندھے پر ٹکائے رکھا۔ پھر میں پلنگ پر لیٹ گیا اور میں اپنے ہاتھوں کی کنگھی بناکر اپنے سر کے نیچے کرلی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور میرے سر کی جانب آکر بیٹھ گئی۔ پھر اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کو اوپر نیچے رکھ کر کوزہ بنایا اور اس کوزے کو میری کنگھی کے نیچے رکھ دیا۔

"نہیں نہیں، یہ ٹھیک نہیں۔ تمہیں تکلیف ہوگی۔"

"کوئی تکلیف نہیں۔ خدا کی قسم ــــ تم لیٹے رہو۔"

"مجھے لیٹنا کچھ ایسا خاص پسند بھی نہیں۔"

"نہ بھی پسند ہو تو بھی لیٹے رہو۔"

"تم بھی لیٹ جاؤ۔"

"نہیں میں ایسے ہی ٹھیک ہوں۔"

"اتنی دیر ڈھولک کے پاس بیٹھ کر تھک گئی ہوگی۔"

"میں کبھی تھکتی ہی نہیں۔"

"پھر بھی ــــ ذرا سی دیر کے لئے۔"

"یہاں کوئی اور بیٹھتا ہی نہیں۔"

"میں اٹھ جاتا ہوں ــــ آؤ ــــ آؤ تم لیٹ جاؤ۔"

"دراصل میں ایک سگریٹ پینا چاہتا ہوں۔"

"تو پی لو۔"

"ماچس جلے گی تو اندر روشنی ہوگی۔ چوکیدار خبردار ہو جائے گا۔"

"تم ماچس جلاؤ میں تمہارے آگے کھڑی ہو جاتی ہوں۔"

اس کا خیال تھا جلتی ہوئی دیا سلائی کے سامنے کھڑے ہونے سے کمرے میں روشنی نہیں ہوگی۔ میں شفقت کے ساتھ بزرگانہ انداز میں اس کا کندھا تھپتھپایا۔

"پی لو سگریٹ۔"

"مشکل ہے۔"

"کوئی مشکل نہیں۔"

"ہے نا بھائی۔"

"میں جو کہتی ہوں کوئی مشکل نہیں۔"

"تم تو بے وقوف ہو۔"

"میں نے ایف ایس سی فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا ہے"۔

"ایف ایس سی میں بھک سے جل اٹھنے والے معاملے کی بابت کوئی سبق نہیں ہوگا"۔

"خدا کے لئے سگریٹ پی لو ــــ ہائے ہائے"۔

"یہاں کتنا کاٹھ پڑا ہے۔ آگ لگ جائے گی"۔

"آگ لگ جائے گی تو ہم بھاگ جائیں گے"۔

میں نے جیب سے سگریٹ نکال کر منہ میں دبائی، ماچس نکالی، دیا سلائی کو رگڑا اور پہلے نارنجی شعلے میں امثل کی ناک پر پسینہ دیکھا۔ دور سے چوکیدار کی آواز آئی۔

"کون اے اندر"۔

پھر ہم وہاں سے بھاگے اور ملحقہ غسل خانے کے بے پٹ دروازے سے پچھلی گلی میں سے ہوتے ہوئے ٹوٹی ہوئی پردہ وال کے پاس پہنچ گئے۔ امثل وہاں سے نکل کر اندھیرے برآمدے میں گم ہو گئی اور میں سرونٹس کوارٹرز کی طرف نکل گیا جہاں نانی کے ملازم پیاز چھیل رہے تھے۔ کافی دیر ان کے پاس بیٹھ کر میلی کے کھانے اور ولیمہ کے کھانے میں فرق معلوم کرتا رہا۔

ماموں جان مجھے تلاش کرتے ہوئے وہاں پہنچ گئے اور بولے "یار کہاں غائب ہو گئے تھے یہ برآمدے کی بتی تو آئی ہی نہیں"۔

میں نے کہا "ماموں جی اس کا فیوز کہیں الگ معلوم ہوتا ہے۔ بورڈ میں نہیں ہے اس کو صبح دیکھیں گے"۔

نانی نے کہا "خاں صاحب اس کی کوئی خاص ضرورت نہیں۔ ہمارا علاقہ روشن ہو گیا یہی کافی ہے"۔

پھر ماموں مجھے اپنے ساتھ سامنے کے لان میں لے گئے جہاں ایک دن چھوڑ کر ولیمہ کا بندوبست ہونا تھا۔ میں نے کرسیاں لگانے کے بارے میں اپنی ایکسپرٹ رائے دی اور کھانا کھلانے کے سیکشن کو تبدیل کرنے پر زور دیا۔ کچھ دیر ہمارے درمیان وزنی دلائل رہے پھر میں نے ان کی بات مان لی۔

کوئی ایک گھنٹہ بعد جب میں میوزک روم میں داخل ہوا تو لڑکیاں بڑی شدت کے ساتھ ڈھولکی کوٹ رہی تھیں اور روڑے والی کے ساتھ امثل اسی طرح التحیات کے انداز میں بیٹھی تھی۔ اس نے میری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔

میں نے لڑکیوں کو ریڈیو اسٹیشن کے لطیفے سنائے ــــ امتیاز علی تاج اور رفیع پیر کے انداز میں

بول کر سنایا۔ نظام دین کی نقل اُتاری۔ لیکن اتنل اسی طرح بیٹھی رہی۔ پھر ڈھولک کی تھاپ پر میں نے اور خورشید خال نے ناچ کیا ـــــ لڑکیوں نے ناچ کیا۔ لڑکیوں نے خوب ہلڑ مچایا۔ اتنل اسی طرح زانوؤں پر ہاتھ رکھ کر بے حس و حرکت بیٹھی رہی۔ سلام ہی نہ پھیرا۔

اچانک وہ اٹھی اور اس نے سیمی کے کندھے کو چھوا۔ وہ بھی اس کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی اور دونوں کمرے سے باہر نکل گئیں۔ ان کے چلے جانے کے بعد میرا اور آپا زہرہ کا ناچ ہوا۔ لڑکیوں نے ہم کو چار چار اور آٹھ آٹھ آنے کی ویلیں دیں اور ہمارے پاس گیارہ روپے جمع ہو گئے۔ جب ہم تھک کر بیٹھ گئے تو میں نے لڑکیوں کو اناؤنسمنٹ کے ساتھ راگ شدھ بلاول سنایا جس کا وادی سُر کومل اور سم وادی کھرج تھا کیس مورچھنے تھے اور تال باون تھی۔ ولمپت لَے کے بول تھے "باج رہی پائلیا"۔ طبلے پر سنگت قادر بخش کی تھی اور سارنگی استاد ظلو سے خاں بجا رہے تھے۔

جب میرا راگ ختم ہوا اور تالیاں بج چکیں تو میں ہڑبڑا کر اپنی جگہ سے اٹھا اور تیزی کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گیا۔ سیمی گیٹ پر سے لوٹ رہی تھی۔

"یہ کون ہے تمہاری سہیلی؟"

"کون؟"

"یہی جو تم کو کمرے سے باہر لے گئی تھی"۔

"میری سہیلی نہیں نگہت کی سہیلی ہے۔ بڑی نک چڑھی، مغرور اور خود پسند سی ہے"۔

"توبہ توبہ۔ صبح سے آئی ہے اور ایک بات تک نہیں کی ہم سے"۔

"ذرا اس کو بلاؤ ہم اس سے انٹرویو کریں گے ٹیپ ریکارڈ پر"۔

"وہ تو چلی گئی"۔ اس کے ابا ساتھ تھے۔ دراصل وہ شادی میں شرکت کے لئے آئے تھے پشاور جانے کے لئے ایک دن یہاں رکے تھے"۔

"لیکن اس وقت کون سی گاڑی جاتی ہے؟"

"بس جاتی ہے، رات کے ساڑھے تین بجے پنڈی رکے بغیر سیدھی پشاور"۔

"اچھا ـــ اچھا ـــ تو یہ ہے شاید ایک سروس ـــ ٹھیک ہے ـــ ٹھیک ہے"۔

ممتاز مفتی

روغنی پُتلے

شہر کا الیٹ شاپنگ سنٹر — جس کی دیواریں شلف الماریاں بلور کی بنی ہوئی ہیں جس کا بنا سجا فیکیڈ جلتے بجھتے رنگ دار سائینز سے مزین ہے جس کے کاؤنٹرز مختلف رنگوں کے گلو کلرز پینٹس کی دھاریوں سے سجے ہوئے ہیں اور شلف دیدہ زیب سامان سے لدے ہیں جس کے کاؤنٹر پر سمارٹ متبسم لڑکیاں اور لڑکے یوں استادہ ہیں جیسے وہ بھی پلاسٹک کے پُتلے ہیں۔ جو ان کے ارد گرد یہاں وہاں سارے ہال میں جگہ جگہ رنگا رنگ لباس پہنے کھڑے ہیں — ہاں فیشن آرکیڈ سے کون واقف نہیں۔

چاہے انھیں کچھ نہ خریدنا ہو لوگ کسی نہ کسی بہانے فیشن آرکیڈ کا پھیرا ضرور لگاتے ہیں، وہاں گھومتے پھرتے نظر آنا ایک حیثیت پیدا کر دیتا ہے۔ کچھ پاش چیزوں اور نئے ڈیزائنوں کو دیکھنے آتے ہیں تاکہ محفلوں میں لیٹسٹ فیشن کی بات کر کے اپ ٹو ڈیٹ ہونے کا رعب جما سکیں۔ نوجوان آرکیڈ میں گھومنے پھرنے والیوں کو ننگا ہوں سے ٹٹولنے آتے ہیں۔ غنڈے سیل گرلز سے اٹا سٹا لگانے کی کوشش کرتے ہیں۔ لڑکیاں اپنی نمائش کے لئے آتی ہیں۔ بوڑھے خالی آنکھیں سینکتے ہیں۔ گھاگ بیگمات کریم یوتھ کی ٹوہ میں آتی ہیں۔ وہ صرف فیشن آرکیڈ ہی نہیں رومان آرکیڈ بھی ہے کیوں نہ ہو آج محبت بھی تو فیشن ہی ہے۔

کون سی چیز ہے جو فیشن آرکیڈ مہیا نہیں کرتا۔ زر بفت سے گاڑھے تک۔ موسٹ ماڈرن گیجٹس سے سوئی سلائی تک۔ سی تھرڈ سے رنگین مالاؤں تک، سب کچھ وہاں موجود ہے۔ لوگ گھوم گھوم کر تھک جاتے ہیں تو آرکیڈ کے ریستوران میں کافی کا پیالہ لے کر بیٹھ جاتے ہیں۔

فیشن آرکیڈ کی اہمیت کا یہ عالم ہے کہ فارن ڈگنیٹریز نے خرید و فروخت کرنی ہو تو انھیں خاص انتظامات کے تحت آرکیڈ میں لایا جاتا ہے۔

آرکیڈ ہال میں جگہ جگہ روغنی پُتلے طرح طرح کا لباس پہنے کھڑے ہیں۔ چہروں پر جوانی کی سرخی جھلملا رہی ہے۔ آنکھوں میں دعوت بھری چمک ہے، ہونٹوں پر رضامندی بھرا تبسم کھلا ہے۔ جسم کے پیچ و خم ہر لحظہ

یوں اُبھرتے محسوس ہوتے ہیں جیسے سپردگی کے لئے بے تاب ہوں۔

اگرچہ یہ ڈمی پتلے پلاسٹک کے جمود میں مقید ہیں مگر صناع نے انھیں ایسی کاریگری سے بنایا ہے کہ ان کے بند بند میں حرکت کی الیوژن لہریں لے رہی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے رواں دواں ہوں۔

سی تھرو لباس والی پتلی کو دیکھو تو ایسے لگتا ہے جیسے وہ ابھی ابھی اپنی برہنہ ٹانگ اٹھا کر کہے گی "مجھے سنبھالو میں گری جا رہی ہوں۔" اور جیکٹ والا اپنی عینک اتار کر مونچھوں کو لٹکاتے ہوئے چل پڑے گا "ہولڈ آن ڈارلنگ۔ میری گود میں گرنا۔"

آرکیڈ میں بہت سی پتلیاں پوز بنائے کھڑی ہیں۔ منی سکرٹ والی، ساڑھی والی، بیدنگ کاسٹیوم والی، میکسی والی، سی تھرو لباس والی لٹکتے بالوں والی، پتلون والی، ننگے پاؤں والی، ہپن ٹوکرا بالوں والی، انگلی سے لگے بچے والی۔

ان کے ساتھ ساتھ پتلے کھڑے ہیں شکاری جیکٹ والا، دانشور، موٹر سائیکل والا بلیک سوٹ، اچکن، ہپی، کرتے پاجامے والا اسٹوڈنٹ، ڈینڈی، مصور۔

آرکیڈ ہال کے اوپر دیوار کے ساتھ ساتھ ایک گیلری چلی گئی ہے جہاں نظروں سے اوجھل دُکان کا کاٹھ کباڑ پڑا ہے۔ پرانی میزیں کرسیاں، شلف اور پتلے جن کا رنگ روغن اُڑ چکا ہے۔

رات کا وقت ہے آرکیڈ بند ہو چکا ہے ہال میں سات آٹھ بتیاں روشن ہیں۔ شیشے کی دیواروں کی وجہ سے ہال جگمگ کر رہا ہے۔

گھڑی نے دو بجائے ـــــ سارے ہال میں حرکت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ پتلوں نے آنکھیں کھول دیں۔ پتلیوں کی لمبی لمبی پلکیں یوں چلنے لگیں جیسے پنکھیاں چل رہی ہوں۔

سی تھرو نے انگڑائی لی۔

منی سکرٹ نے اپنی ٹانگ اٹھائی۔

جیکٹ والے دانشور نے اپنا قلم جیب میں ٹانگا عینک صاف کی اور سی تھرو کی طرف بھوکی نظروں سے دیکھنے لگا۔

موٹر سائیکل والے نے پیچھے بیٹھی لٹکتے بالوں والی پر گلیڈ آئی چمکائی لٹکتے بالوں والی سے جھینپے اُڑنے لگے۔

"مائی گاڈ" سی تھرو چلائی، "دیکھو اس نے اپنی ٹانگ لہرائی میری ٹانگ پر نیلی رگیں اُبھر آئی ہیں کوڑے کوڑے۔

"کیوں نہ ہو بلیو بلڈ ہے" بلیک سوٹ مسکرایا۔

دور سے ایک آواز آئی "ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلی میں" سب لوگ بجس کے پاس کھڑی پتلون والی کی طرف دیکھنے لگے۔

"تیرے ہاتھ تو خالی ہیں۔ کہاں ہے ساغر؟" گرتے پاجامے والے نے پوچھا۔

"اندھے وہ تو خود ساغر ہے۔ دِکھتا نہیں تجھے" جین والا ہنسا۔

"میں تو بور ہو گئی" منی سکرٹ نے آنکھیں گھما کر کہا۔

"کیوں مذاق کرتی ہو" موٹر سائیکل نے گلیڈ آئی چمکائی۔

"تم تو سراپا حرکت ہو تمہاری تو بوٹی بوٹی تھرکتی ہے تم کیسے بور ہو سکتی ہو؟"

"کیوں بناتے ہو اسے اس کے جسم پر بوٹی ہی نہیں، تھرکے گی کہاں سے؟" دور کونے میں کھڑے اچکن والے نے کہا۔

"ہاں" پہلوان نما گرتے والے نے سر اثبات میں ہلایا" وہ تو مٹیار کا زمانہ تھا جب بوٹی بوٹی تھرکا کرتی تھی۔ اب تو کاٹ ہی کا ٹھ رہ گیا ہے"۔

"شٹ اپ" بیچ جین والے نے آنکھیں دکھائیں "اپنے دقیانوسی رجعت پسندانہ خیالات سے فیشن آرکیڈ کی فضا کو متعفن نہ کرو"۔

"ابے مسٹر اچکن" اسٹوڈنٹ چلایا" ذرا آئینہ دیکھو یوں لگتے ہو جیسے سارنگی پر غلاف چڑھا ہو"۔

"یہ مسٹر اچکن تو خالص ہسٹری ہے ہسٹری۔ اسے تو میوزیم میں ہونا چاہیئے"۔

"اینٹیکس میوزیم میں" جیکٹ والے نے قہقہہ لگایا۔

"بالکل۔ ان روایتی لوگوں کو جینے کا کوئی حق نہیں"۔

"یہ لوگ زندگی کو کیا جانیں"۔

"ہپوکریٹس" ہر طرف سے آوازیں آنے لگیں۔

"اگنور و م ہٹاؤ۔ کوئی اور بات کرو" سی تھرو آنکھیں گھما کر بولی۔

"ہاؤ کین وی اگنور انہیں۔ یہ لوگ ہمارے راستے کی رکاوٹ ہیں۔"

"نانسنس! ہمارے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں بن سکتا۔ وی آر آل فار پروگرس مومنٹ۔" جیکٹ والا چلا کر بولا۔

"ہیئر ہیئر" تالیوں سے ہال گونجنے لگا۔

"ہاہاہاہاہا" اوپر گیلری میں کوئی قہقہہ مار کر ہنسا۔ اس کی آواز کچھ عجیب انداز والہانہ تھا۔

تالیاں رک گئیں۔ ہال میں خاموشی چھا گئی۔ پھر سرگوشیاں ابھریں۔

"کون ہے یہ؟"

"کون ہنس رہا ہے؟"

"پتا نہیں اوپر سے آواز آرہی ہے۔"

"ہے میں تو ڈر گئی کتنی ہورس آواز ہے۔"

قہقہہ رک گیا۔ پھر قدموں کی آواز سنائی دی ٹھک ٹھک ٹھک ٹھک۔

"کون چل رہا ہے اوپر؟"

"ہے میری تو جان نکلی جا رہی ہے۔"

"پتا نہیں کون ہے۔" منی سکرٹ بولی۔

"ڈونٹ فیئر ڈارلنگ۔ آئی ایم ہیر بائی یور سائیڈ۔"

"وہ دیکھو وہ۔" ٹوکرا بالوں والی نے اوپر کی طرف اشارہ کیا۔

"اوپر گیلری سے جنگلے پر۔" ساڑھی والی ڈر کر بولی۔

سب کی نگاہیں اوپر جنگلے کی طرف اٹھ گئیں۔

گیلری کی ریلنگ سے ایک بڑا سا بھیانک چہرہ جھانک رہا تھا۔

"توبہ۔ اُف۔ ہائے۔" پتلیوں نے شور مچا دیا۔

"کون ہے تو؟" موٹر سائیکل والا اپنا سائیلنسر نکال کر غرایا۔

"میں وہ ہوں جو ایک روز مشہدی لنگی باندھے وہاں کھڑا تھا جہاں آج تو کھڑا ہے۔"

"اس کی آواز اتنی بھدی کیوں ہے!" سی تھرو نے سینہ سنبھالا۔

"کہاں سے بول رہا ہے یہ؟" پتلون والی نے پوچھا۔
"میں وہاں سے بول رہا ہوں جہاں بہت جلد تم پھینکی جانے والی ہو" لنگی والا کہنے لگا۔
پتلیوں کا رنگ زرد پڑ گیا۔ ان کے منہ سے چیخیں سی نکلیں "نو نو۔ نو نو۔ نیور۔ مائی گاڈ۔ ہے اللہ"
وہ سب سہم کر پیچھے ہٹ گئیں۔
"ڈونٹ مائنڈ ہم ڈارلنگ" جین والا بولا "یہ تو پٹا ہوا مہرہ ہے۔ پھٹے ہوئے مہرے سے کیا ڈرنا"
"دیٹس اٹ دیٹس اٹ دے بلانگ ٹو دی پاسٹ"
"یہ اب بھی ماضی میں رہتے ہیں اور ہم کو ماضی کی طرف گھسیٹنا چاہتے ہیں" جیکٹ والا حقارت سے بولا۔
"بڑے میاں سلام" جیکٹ والے نے ماتھے پر ہاتھ مار کر طنزیہ سلام کیا "ماضی پرستی کا دور ختم ہوا حضرت اب جدیدیت کا زمانہ ہے"
گیلری میں اوندھا پڑا ہوا رومی ٹوپی والا لنگڑا سوٹی پکڑ کر اٹھ بیٹھا "احمق ہیں یہ جدیدیت کے دیوانے اتنا بھی نہیں جانتے کہ اس دنیا میں نہ قدیم ہے نہ جدید جو آج ہے وہ کل قدیم ہو جائے گا"
"یہ ظاہر کے دیوانے کیا سمجھیں گے" مشہدی لنگی نے قہقہہ لگایا کہ "وہ ایک گھومتا ہوا چکر ہے جو آج اوپر ہے کل نیچے چلا جائے گا جو آج نیچے ہے کل اوپر آ جائے گا"
جین والے نے اپنی پتلون جھاڑی "ان کباڑخانے والوں کی باتیں نہ سنو یہ بے چارے کیا جانے جدیدیت کو"
"جدیدیت کے دیوانے آج تیری پتلون کے پائنچے کھلے ہیں کل تنگ ہو جائیں گے پرسوں پھر کھل جائیں گے یہی ہے نا تیری جدیدیت" رومی ٹوپی نے قہقہہ لگایا۔
"ذرا اس کی جین کی طرف دیکھو" لنگی والا بولا "نیلی پتلون پر سرخ ٹلی لگی ہوئی ہے ہا ہا۔ ہا ہا" وہ قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔
"احمق یہ ٹلی نہیں۔ پیچ ہے پیچ۔ پیچ فیشن ہے۔ پیچ لگی جین کی قیمت عام پتلون سے دوگنی ہوتی ہے تجھے کچھ پتا بھی ہو"
"پیوند کبھی غربت کا نشان تھا۔ پیوند لگے کپڑوں والے سے لوگ یوں گھن کھاتے تھے جیسے کوڑھی

ہو۔ آج تم اس پیوند کی نمائش پر فخر محسوس کر رہے ہو" مشہدی لنگی والا ہنسے "تم عجب تماشہ ہو"

"رومی ٹوپی نے قہقہہ لگایا دورِ جدید کے تخیل کا فقدان ملاحظہ ہو پیوند کو فیشن بنا بیٹھے ہیں ہی ہی"

"سارا کریڈٹ ہمیں جاتا ہے" ہپی نے سر اٹھا کر کہا۔

"ہائیں یہ کیا کہہ رہی ہے" پتلون والی نے پوچھا۔

"لو" سی تھرو زیر لب گنگنائی "چلنی بھی بولی"

"ہاں" ہپی نے سینے پر ہاتھ مارا "سارا کریڈٹ ہمیں جاتا ہے"

"کس بات کا کریڈٹ؟"

"تعفن کا کریڈٹ، غلاظت کا کریڈٹ اور کونسا" بیدنگ کاسٹیوم بولی۔

ساڑھی والی نے ناک چڑھائی۔

ہپی نے قہقہہ لگایا "جدیدیت کے ذہنی تعفن کو دور کرنے کا کریڈٹ، جدیدیت کے بت توڑنے کا کریڈٹ، جھوٹی قدروں کو پاؤں تلے روندنے کے لئے ہمیں غلاظت کو اپنانا پڑا"

سپورٹس گرل نے بیڈمنٹن ریکٹ کو گھما کر دانت نکالے۔

"ڈینٹل کریم کا اشتہار کسے دکھا رہی ہو میڈم" ہپی ہنسا "ہم نے دورِ حاضر کے سب سے بڑے بت دولت کو پاش پاش کر دیا۔ ہم نے جھوٹے رکھ رکھاؤ کا بت ریزہ ریزہ کر کے رکھ دیا۔ ہم نے ماڈرن ایج کے واحد دل بہلاوے سمال کنفرٹس کی نفی کر دی۔ ہم نے مغربی تہذیب کا جنازہ نکال دیا"

"یہ بے چارے کیا جانیں" ہپن بولی "ظاہریت کے متوالے۔ جب کوئی تہذیب متعفن ہو جاتی ہے تو اسے مسمار کرنے کے لئے مجاہد بھیج دیئے جاتے ہیں۔ ہم وہ مجاہد ہیں"

"تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی" رومی ٹوپی والے نے قہقہہ لگایا۔

"بالکل درست" لنگی والا چلایا "یہ ٹرانزیشنل دور ہے جب ایک شو ختم ہو جاتا ہے تو دوسرے شو کے واسطے ہال صاف کرنے کے لئے جمعدار آجاتے ہیں یہ دور جمعداروں کا دور ہے"

"سلی فول" سی تھرو ہنسی "یہ تو رومانس کا دور ہے"

"رومانس" گیلری کے کاٹھ کباڑ سے ایک مجنوں صفت دیوانہ لپک کر ریلنگ پر آکھڑا ہوا "تم کیا جانو رومان کیا ہوتا ہے ـــــ تمہارے دور نے تو عشق کا گلا گھونٹ دیا۔ عاشق کو غنڈا بنا کر رکھ دیا۔ محبوب

سے محبوبیت چھین کر اسے رنڈی بنا دیا۔ عریانی کو رومان نہیں کہتے بی بی۔"

"بالڈر ڈیش۔"

"نانسنس۔"

رومی ٹوپی نے ایک لمبی آہ بھری "دوستو! ہمارے زمانے میں عورت کا نقاب سرک جاتا تھا تو گال دیکھ کر مرد میں تحریک پیدا ہوتی تھی۔ لیکن اب ننگے پنڈوں کی یلغار نے مردانہ حس کو کند کر دیا ہے۔ تمہارے دور نے مرد کو نامرد اور عورت کو بانجھ کر کے رکھ دیا ہے۔"

جیکٹ والا آگے بڑھا۔ اس نے قلم جیب میں ڈالا عینک اتاری "ہم جنس کے متوالے نہیں۔ ہم جنس کی لذت کی دلدل میں ڈوبے ہوئے نہیں ہیں۔ دورِ حاضرہ میں سب سے اہم ترین مسئلہ اقتصادیات کا ہے۔ تم حالات حاضرہ سے چشم پوشی کرتے ہو۔ ہم تمہاری طرح حالات حاضرہ سے آنکھیں نہیں چراتے۔ ہم ترقی پسند لوگ ہیں۔"

"حالات حاضرہ۔" رومی نے قہقہہ لگایا "تمہارے نزدیک حالات حاضرہ روٹی، کپڑا اور مکان ہیں۔ ہمارے نزدیک سب سے بڑا مسئلہ انا کا ہے، Self کا۔ میں کا۔"

"روٹی کپڑے والو ہماری طرف دیکھو۔" ہپن چلائی "جو ملتا ہے کھا لیتے ہیں جہاں بیٹھ جاتے ہیں وہی ٹھکانہ بن جاتا ہے۔ جو میسر آتا ہے پہن لیتے ہیں۔ کہاں ہیں وہ مسئلے جنہیں تم اہرام مصر بنائے بیٹھے ہو۔"

"انہیں کچھ نہ کہو یہ تو فارن خیالات کی ایڈ کے بل بوتے پر کھڑے ہیں انہیں کوئی کچھ نہیں سکتا۔" رومی ٹوپی والا بولا۔

"کل جب روٹی، کپڑا اور مکان کا مسئلہ حل ہو جائے گا پھر تمہارے ہاتھ پلے کیا رہ جائے گا بتاؤ؟" ہپن بولی۔

"یہ تو حرکت کے متوالے ہیں منزل کے نہیں۔ انہیں صرف چلنے کا شوق ہے پہنچنے کا نہیں۔" مشہدی لنگی نے منہ بنایا۔

"بکواس نہیں۔ ہمارے راستے میں جو شخص روڑے اٹکائے گا اس پر رجعت پسندی کا لیبل لگا دیا جائے گا۔"

ہپی قہقہہ مار کر ہنسا "سو واٹ۔ ہم ہپیوں پر رجعت پسندی کا لیبل بے شک لگاؤ ہم نے کیپٹل ازم کی بنیادیں کھوکھلی کر دی ہیں۔ ہم نے اقتدار پسندی کا تمسخر اڑایا ہے ہم میں اور ان گوریلوں میں کیا فرق ہے جو سرمایہ داری کے خلاف جان کی بازی لگائے بیٹھے ہیں؟"

"صرف یہی کہ طریق کار مختلف ہے۔" ہپی نے لقمہ دیا۔

ہال پر سناٹا چھا گیا۔

سی تھرو والی نے جسم کے پیچ و خم کا جائزہ لے رہی تھی۔ ساڑھی اپنا پلو سنبھال رہی تھی۔ بٹکے بالوں والی منہ میں انگلی ڈالے کھڑی تھی۔ پتلون والی کا چہرہ حقارت سے چقندر بنا ہوا تھا۔ جیکٹ والا سر کھجلاتے ہوئے گنگنا رہا تھا "کتابوں میں تو یہ بات کہیں نظر سے نہیں گزری۔"

مجنوں نما نے قہقہہ لگایا "خود کو زندگی کے متوالے گردانے والے کتابوں کی بیساکھیوں کے سہارے بغیر چل نہیں سکتے۔ زندگی کتابوں سے اخذ نہیں کی جاتی مسٹر زندگی حال ہے کسی صاحب حال سے پوچھو۔"

"جو قیل و قال کے دیوانے ہیں انھیں حال کا کیا پتا۔" لنگی والا بولا "انھیں اتنا نہیں پتا کہ حال پر قیل و قال نہیں ہو سکتا۔ حال کو رد نہیں کیا جا سکتا۔ حال سب سے بڑی حقیقت ہے۔"

ہال پر خاموشی چھا گئی۔

پھر دور سے ایک سرگوشی ابھری "میں کہاں آپھنسی ہوں میں کہاں آپھنسی ہوں؟" بچے کو انگلی لگائے کھڑی ماں گنگنا رہی تھی "یہ دور ماں کا دور نہیں۔ یہ تو عورت کا دور ہے میں کہاں آپھنسی ہوں۔"

"عورت کا نہیں بی بی۔" پہلوان کرتے والے نے سر ہلا کر کہا "یہ تو لڑکی کا دور ہے انھیں کیا پتا عورت کسے کہتے ہیں۔ بال سفید ہو جاتے ہیں پھر بھی یہ لڑکیاں ہی بنی رہتی ہیں۔"

"خاموش۔" آرکیڈ کی فرنٹ رو میں کھڑی ٹوکرا بالوں والی بولی "سنو سنو یہ کیسی آواز ہے۔"

"کون سی آواز؟"

"کدھر ہے آواز؟"

"چپ۔" ٹوکرا بالوں والی نے ہونٹوں پر انگلی رکھ لی۔

سب کان لگا کر سننے لگے۔

"ارے۔" موٹر سائیکل چلایا "یہ تو ٹیلی فون کی گھنٹی بج رہی ہے۔"

"یہ آواز تو باہر سے آرہی ہے۔" منی سکرٹ نے کہا۔

جیکٹ والے نے عینک صاف کی اور باہر دیکھنے لگا۔

"ہائے اللہ۔" سی تھرو بولی "یہ آواز تو پبلک فون بوتھ سے آرہی ہے جو باہر پورٹیکو میں ہے۔"

"خاموش" شکاری ڈانٹ کر بولا "سب اپنی اپنی جگہ کھڑے ہو جاؤ۔ وہ آ رہا ہے"۔

"کون آ رہا ہے؟" سی تھرو نے زیر لب پوچھا۔

"چوکیدار"

"چوکیدار" پتلیاں سہم کر پیچھے ہٹ گئیں۔ پتلے باہر جھانکنے لگے۔

سامنے ایک اونچا لمبا جہلمی جوان خاکی وردی پہنے سر پر پگڑی لپیٹے ہاتھ میں سونٹا اٹھائے بوتھ کی طرف بھاگا آ رہا تھا۔

"بالکل اُجڈ نظر آتا ہے" پتلون والی نے حقارت سے ہونٹ نکالے۔

"گاؤں کر وڈ۔ ان کو تھو" ٹوکرا بالوں والی دانت بھینچ کر بولی۔

"میرے بدن پر تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اسے دیکھ کر" سی تھرو نے کہا۔

چوکیدار نے سونٹا باہر کھڑا کیا اور خود جلدی سے بوتھ میں داخل ہو گیا۔ اس نے ٹیلی فون کا چونگا اٹھایا اور فون پر باتیں کرنے لگا۔ اس کے ہونٹ ہل رہے تھے لیکن بات سنائی نہیں دے رہی تھی چند ایک منٹ کے بعد وہ بوتھ سے باہر نکلا اور حسب معمول ہال کا چکر لگانے کے بجائے ہال کی طرف پیٹھ کر کے کھڑا ہو کر سڑک کی طرف دیکھنے لگا۔

"ضرور کوئی ایمرجنسی ہے" شکاری نے جمائی لیتے ہوئے سکوت کو توڑا۔

گیلری میں رومی ٹوپی والا ہنسا "ایمرجنسی۔ یہ دور تو بذات خود ایک سٹیٹ آف ایمرجنسی ہے"۔

"ایک اُبال ہے بے مقصد اُبال" ننگی والے نے قہقہہ لگایا۔

منی سکرٹ نے لمبی لمبی پلکیں جھپکا کر اوپر دیکھا۔

"اگنور ہم مائی ڈیئر" موٹر سائیکل نے سائیلنسر فٹ کر کے کہا۔

"میں کہتا ہوں ضرور کسی کے انتظار میں کھڑا ہے ضرور کوئی آنے والا ہے" سٹوڈنٹ زیر لب بولا۔

"چوکیدار کو دیکھ کر میری روح خشک ہو جاتی ہے" سی تھرو نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

ننگی والے نے مسکرا کر پوچھا "بی بی کیا تیرے اندر روح بھی ہے ہوتی تو تو سی تھرو نہ ہوتی"۔

"کتنی ڈراؤنی شکل ہے چوکیدار کی" پتلون والی، ننگی والے کے سوال کو دبانے کے لئے بولی۔

رومی ٹوپی والا ہنسنے لگا "کتنی عجیب بات ہے اپنوں کو دیکھ کر ڈر کر سہم جاتی ہیں۔ بے گانوں کو

دیکھ کر ایٹ ہوم محسوس کرتی ہیں۔"

"شٹ اپ۔" پتلون والی ڈانٹ کر بولی "یو۔ ان کلچرڈ ان کو تھ سیوج۔"

"ول سیڈ۔" بلیک سوٹ نے کہا "ہیر ہیر جنٹل مین چیرز۔"

سارا ہال تالیوں کی آواز سے گونجنے لگا۔ "ہمارے دور میں ان سویلائزڈ۔ ان ایجوکیٹڈ لوگوں کو لب ہلانے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔" جیکٹ والا منہ سے جھاگ نکالتے ہوئے بولا۔

"تمہارا دور۔" مجنوں نما ہنسا۔ "نقالوں کا دور۔ چربہ دور۔ یہ دور مغربی تہذیب کی کاپی ہے۔ بیگانوں کی طرزِ زندگی کی نقل کرو ان کے خیال کو اپناؤ۔ اپنوں سے لگتوں سے نفرت کرو یہی نا۔"

"مغربی تہذیب مغرب میں خودکشی کر چکی ہے چاند غروب ہو چکا ہے۔ اس کی آخری شعاعیں یہاں سرابی رنگ دکھا رہی ہیں۔" ہپی مسکرایا "اور ـــــ"

"میں کہتی ہوں۔" ہپن نے اس کی بات کاٹی "اگر نقل ہی کرنی ہے تو کسی ایسی قوم کی کرو جس میں جان ہے زندگی ہے۔ چربہ بننا ہے تو کسی ایسی تہذیب کا۔ جو ابھر رہی ہے۔ کیوں ڈوبتے سورج کو پوج رہے ہو؟"

جیکٹ والے نے اپنا قلم جیب میں اٹکایا، عینک کو سنبھالا۔ لمبے لمبے ڈگ بھرے اور ہال کے درمیان آکر بولا "کون نہیں جانتا کہ کون سی قومیں ابھر رہی ہیں۔"

مشہدی لنگی قہقہہ مار کر ہنسا "ذرا اس فیشن آرکیڈ پر نظر دوڑاؤ۔ کیا یہ رنگ اُن قوموں کا ہے جن کا تم حوالہ دے رہے ہو؟"

"کیا یہ منی سکرٹ، یہ سی تھرو بی بی اس آئیڈیل کے مظہر ہیں جس کے تم دعویدار ہو۔ کیا تمہارا دور جس پر تم اتنے نازاں ہو تمہارے مقاصد کی نشان دہی کرتا ہے؟" رومی ٹوپی والا جوش میں بولا۔

"ابھی ہم جدوجہد کے عالم میں ہیں۔" سٹوڈنٹ نے اپنے ٹوکرا بالوں کو جھٹک کر سنوارتے ہوئے کہا۔

مجنوں نما ہنسا "ذرا آئینہ دیکھو میاں کیا جدوجہد کرنے والوں کی شکلیں ایسی ہوتی ہیں جیسی تمہاری ہیں، کیا ان کی قلمیں سارنگی نما ہوتی ہیں۔ کیا ان کے سروں پر بالوں کے ٹوکرے دھرے ہوتے ہیں کیا ان کی آنکھوں میں سُرمے کی دھار ہوتی ہے کیا وہ ایسے بنے ٹھنے ہوتے ہیں جیسے تم ہو تم نے تو لڑکیوں کو بھی مات کر دیا ہے۔"

ہال پر خاموشی طاری ہو گئی۔

سب چپ ہو گئے۔ رومی ٹوپی ہنسنے لگا۔

کسی نے رومی ٹوپی کو جواب نہ دیا۔

"وہ دن کب آئے گا؟" دور سے یوں آواز سنائی دی جیسے کوئی آہیں بھر رہا ہو۔

"کون سا دن بی بی؟" کرتے پاجامے نے پوچھا۔

"جب مجھے ماتا کے جذبے پر شرمندگی نہ ہوگی۔" بچے کو انگلی لگائے کھڑی ماں بولی "جب آر کیڈ میں میں سر اٹھا کر کھڑی ہو سکوں گی۔"

"سچ کہتی ہو بی بی آج کے دور میں مائیں اپنے بچوں کو پالتے ہوئے شرم محسوس کرتی ہیں۔" رومی ٹوپی نے کہا۔

"وہ ماں کہلوانا نہیں چاہتیں۔" کرتے پاجامے والا بولا "بچوں سے کہتی ہیں مجھے باجی کہہ کر بلاؤ۔"

"آج کی عورت عورت بن کر جینا چاہتی ہے ماں بن کر نہیں۔" لنگی والا بولا۔

"میں پوچھتا ہوں کیا عورت کو عورت بن کر جینے کا حق نہیں۔ تم نے اسے ماں بنا کر قربانی کا بکرا بنا دیا تھا۔ ہم نے اسے عورت کی حیثیت سے جینے کا حق دیا ہے۔" بلیک سوٹ نے کہا۔

"تمہیں کچھ پتا بھی ہو۔" رومی ٹوپی ہنس کر بولا" وہ سب تہذیبیں تباہ کر دی گئیں جنھوں نے ماتا کو رد کر دیا تھا اور عورت کو عورت بن کر جینے کا حق دیا تھا۔ اس دنیا میں صرف وہی تہذیب پنپ سکتی ہے جو بچے کو زندگی کا مقصد مانے۔"

"پاگل ہیں یہ ماضی کے دیوانے۔" جیکٹ والے نے عینک اتار کے صاف کی" اتنا نہیں جانتے کہ آج سب سے بڑا معاشی مطالبہ یہ ہے کہ بچوں کی پیدائش کو روکا جائے۔"

"بالکل بالکل۔" بلیک سوٹ نے ہاں میں ہاں ملائی۔

"بچے کم خوشحال گھرانا۔" موٹر سائیکل گنگنانے لگا۔

"سبحان اللہ۔" مشہدی لنگی بولا" سوشلزم کے نام لیوا سرمایہ داروں کے حربے کا پرچار کر رہے ہیں۔"

"بھائی صاحب بچے تو غربت کی پیداوار ہیں۔ قدرت کا اصول ہے جس گھر میں پیسے کی ریل پیل ہوگی بچے پیدا کرنے کی قوت کم ہو جائے گی۔ اگر غریبوں کی یہ صلاحیت ختم کر دی گئی تو تخلیق کا عمل مدھم پڑ جائے گا شاید ختم ہو جائے۔" رومی ٹوپی نے کہا۔

"مین پاور کی عظمت کو ماننے والے بچوں کی پیدائش کو معاشی رکاوٹ سمجھ رہے ہیں۔" مجنوں نما

قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔

پتلیاں ایک دوسرے سے سرگوشیاں کرنے لگیں۔

"کیا کہہ رہا ہے یہ؟"

"گاڈ نوز۔"

"تھے۔ چلڈرن آر اسے نو سے سنس۔"

"سیانوں نے کہا تھا" کرتا پاجامہ کہنے لگا

"کون سیانے؟" جیکٹ والے نے پوچھا۔

"ہمارے مگتے لوگ" کرتا پاجامہ نے وضاحت کرنے کی کوشش کی۔

"تم اپنے مگتوں کی کیا بات کر رہے ہو؟" لنگی والے نے اسے ٹوکا۔ انھیں سمجھ میں نہیں آئے گی۔ ان کے مگتے تو مغرب میں رہتے ہیں۔ یہ تو مغربی تہذیب کے دیوانے ہیں۔"

"وہ دن دور نہیں" اچکن والے نے کہا "جب انہیں اپنے مگتوں کو اپنانا پڑے گا۔"

"بھول جاؤ وہ دن" جیکٹ والا جلال میں بولا "وہ دن کبھی نہیں آئے گا۔"

"ہم ترقی کی جانب قدم اٹھا رہے ہیں۔ ہم آگے بڑھنے کے قائل ہیں۔ ہم کبھی واپس ماضی کی طرف نہیں جائیں گے۔" موٹر سائیکل نے لٹکے بالوں والی کی طرف دیکھا "کیوں ڈارلنگ۔"

"فارگٹ دیٹ ڈے۔ اٹ ول نیور کم۔" لٹکے بالوں والی نے بال جھٹک کر کہا۔

گیلری کے کاٹھ کباڑ سے ایک پتلا اٹھ بیٹھا اس نے ایک لمبا چغہ پہن رکھا تھا سر پہ بلا تھا "کون نہیں مانتا اس دن کو۔ کیا تمہیں نظر نہیں آ رہا کہ دنیا کا نظام بدل رہا ہے؟"

"اچھا بدل رہا ہے کیا!" شکاری نے طنزاً کہا۔

سب پتلے ہنسنے لگے۔

"دنیا کے سارے مذہب سارے نجومی۔ سارے سیز آنے والے گولڈن ایج کو مانتے ہیں" چغے والا چلایا۔

"عیسائی مسلمان یہودی ہندو سبھی مانتے ہیں۔ اسٹرالوجرز اس کی شہادت دیتے ہیں" رومی ٹوپی نے کہا۔

"وہ گولڈن ایج" چغے والے نے انگلی اٹھا کر کہا "جب ترقی کا رخ مادی سہولتوں سے ہٹ کر روحانی مقاصد کی طرف مڑ جائے گا۔ جب توجہ باہر کے آدمی کی بجائے اندر کے آدمی پر مرکوز ہو جائے گی۔ جب

اسی ہوگا۔ اطمینان کا دور دورہ ہوگا۔"
موٹر سائیکل نے طنز بھرا قہقہہ مارا۔
جیکٹ والے نے چلا کر کہا "ضعیف الاعتقادی نہیں خوش فہمی ہے یہ۔"
"اچھا۔" ماں بولی "کیسا گولڈن ایج ہوگا وہ؟"
"نشاۃ الثانیہ۔" چشمے والا چلا کر بولا۔
"نشاۃ الثانیہ۔" ہال کی دیواریں گونجنے لگیں۔
"دنیا پر مبارک ترین ستاروں کا اکٹھ ہو رہا ہے۔ ایسا اکٹھ جو کبھی آج تک نہیں ہوا تھا۔" چشمے والا بولا۔
"اس کے اثرات ۲۰۰۰ء تک یا اس کے لگ بھگ ظہور میں آئیں گے۔"
ٹوکرا بالوں والی نے منہ میں انگلی ڈال لی۔ "سچ۔"
ساڑھی والی نے سینہ سنبھالا۔
سی تھرو کا رنگ اڑ گیا۔
سارے پتلے سہم گئے۔
خاموش بیٹھے بالوں والی چلائی "وہ دیکھو۔" اس نے انگلی سے باہر کی طرف اشارہ کیا۔
سب انگلی کی سیدھ میں پورٹیکو کی طرف دیکھنے لگے۔
"کیا ہوا؟" دور سے پورٹیکو کے قریب کھڑی پتلون والی نے پوچھا۔
"کیا بات ہے؟"
"پتا نہیں۔"
"کون ہے؟"
دور کھڑی پتلیاں سرگوشیاں کرنے لگیں۔
موٹر سائیکل نے اپنا سائیلنسر لیٹ کر کے کہا "وہ آرہے ہیں خاموش۔" اس نے دور کھڑے پتلوں
کو خبردار کیا "وہ آرہے ہیں۔ ادھر آرہے ہیں۔"
"ہاں ہاں۔" بیٹھے بالوں والی بولی "انتظامیہ کے لوگ آرہے ہیں۔"
"بالکل۔" ساڑھی والی نے کہا "وہ ضرور اندر آئیں گے۔"

جیکٹ والے نے اپنی عینک صاف کی۔ اسے پھر سے لگایا اور پھر تحکمانہ لہجے میں بولا "سب اپنے اپنے مقام پر اپنا مخصوص پوز بنا کر کھڑے ہو جاؤ یقیناً کوئی ایمرجنسی ہے۔" موٹر سائیکل والا بولا "ورنہ اس وقت ناظم کا یہاں آنا؟"

سارے پتلے اپنی اپنی جگہ کھڑے ہونے کے لئے دوڑے۔

گیلری میں کھڑے پتلے کونوں میں جا کر ڈھیر ہو گئے۔

ہال پر سناٹا طاری ہو گیا۔

آرکیڈ کا صدر دروازہ کھلا۔ ناظم اندر داخل ہوا اس کے پیچھے نائب تھا۔ نائب کے پیچھے دس بارہ کاریگر تھے۔ انھوں نے پینٹ کے بڑے بڑے ڈبے اور برش اٹھائے ہوئے تھے۔

ناظم کرسی پر بیٹھ گیا۔ نائب اور کاریگر اس کے سامنے کھڑے ہو گئے "دیکھو اس وقت تین بجے ہیں۔" ناظم نے گھڑی کی طرف دیکھ کر کہا "ہمارے پاس صرف چھ گھنٹے ہیں۔ حکومت کے معزز مہمان جو دنیائے اسلام کے بہت بڑے سربراہ ہیں ٹھیک ساڑھے نو بجے آرکیڈ دیکھنے کے لئے آ رہے ہیں۔ ان کے آنے سے آدھ گھنٹہ پہلے سارا کام مکمل ہو جانا چاہئے سمجھے۔" ناظم نے نائب سے مخاطب ہو کر کہا۔

"یس سر" نائب نے جواب دیا "اٹ شیل بی ڈن۔"

"ہوں۔" ناظم نے کہا "ہمارے پرائم منسٹر صاحب کا کہنا ہے کہ معزز مہمان توقع رکھتے ہیں کہ پاکستان کا سب سے بڑا شاپنگ سنٹر پاکستانی رنگ میں رنگا ہو گا اور پاکستانی زندگی، دست کاری اور فن کا مظہر ہو گا۔ میں چاہتا ہوں کہ آرکیڈ کی ہر تفصیل پاکستانی ہو سمجھے۔"

"آپ فکر نہ کریں سر" نائب نے کہا۔

پھر وہ کاریگروں سے مخاطب ہوا "دیکھو بھئی اتنے تھوڑے وقت میں اتنے شارٹ نوٹس پر ہم نیا سامان مہیا نہیں کر سکتے۔ اس لئے اسی سامان کو رنگ روغن کر کے گزارا کرنا ہو گا۔"

"جی صاحب" کاری گروں نے جواب دیا۔

اگلے روز ساڑھے نو بجے جب معزز مہمان آرکیڈ میں داخل ہوئے تو صدر دروازے کے اوپر فیشن آرکیڈ کی جگہ پاکستان آرکیڈ کا بورڈ لگا تھا۔ اندر دروازے کے عین سامنے اچکن والا بڑے طمطراق سے کھڑا تھا۔ اس کے پاس ہی دائیں طرف رومی ٹوپی والا اپنا پھندنا جھلا رہا تھا۔ بائیں ہاتھ طرہ باز مونچھ کو تاؤ دے

رہا تھا۔ قریب ہی بچے کو انگلی لگائے چادر میں لپٹی ہوئی خاتون بچے کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی اس کے بھرے کرتے پاجامے والا چھاتی پھلائے استادہ تھا۔

ساڑی والی تالیاں بجائے جا رہی تھی۔

سی تھرو پینٹ کا گھگرا پہنے سر پر بال کی ٹائی کر کے قدم اٹھائے کھڑی تھی۔

سکرٹ والی چست پاجامہ پہنے بازو پر جدید لمبا کوٹ اٹھائے مسکرا رہی تھی۔

اطلاع نامہ مطابق فارم ۴

نام رسالہ :۔	عصری ادب
زبان :۔	اردو
وقفہ :۔	سال میں چار بار
نام مالک :۔	سید بہاء الدین احمد
قومیت :۔	ہندوستانی
نام ایڈیٹر، پرنٹر، پبلی شر :۔	سید بہاء الدین احمد
قومیت :۔	ہندوستانی
پتہ :۔	ڈی ۷، ماڈل ٹاؤن۔ دہلی ۹

میں سید بہاء الدین احمد اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ معلومات میرے علم و اطلاع کے مطابق صحیح ہیں۔

سید بہاء الدین احمد

نسیم نیشو فوز

انسان، خدا اور استوپہ

وہ ٹیکسلا کے کھنڈر شہر "سرکپ" کے وسط میں کھڑا سوچنے لگا کہ صدیوں سے تباہ شدہ تہذیبیں دوبارہ کیوں دریافت کی جاتی ہیں جب کہ ہر تہذیب کے تخلیق کار آدم کا باطن اسی قدر جانفشانی سے دریافت نہیں کیا جاتا اور پھر اس تہذیب کی خاک فشاں ارضیت کو انسانی سود و زیاں کے پلڑوں میں تول کر کیوں مادرِ وطن کے نام سے منسوب کر دیا جاتا ہے۔

وہ ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ کسی مجذوب کا کشکول اس کے قدموں میں آ گرا۔ اسے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ کشکول میں خیرات کے سکوں کے بجائے کچھ عجیب تراش کے رنگ برنگے کانچ کے ٹکڑے پڑے ہوئے ہیں۔

مجذوب نے کانچ کا ایک ٹکڑا سورج کی جانب لہرایا تو اس کی بصارت نے دیکھا کہ شام کا قرمزی سورج جیسے افق میں آرام و استراحت کرنے کے بجائے اس کانچ میں ڈوب گیا۔

" مجذوب نے سوال کیا "تم اس ویران شہر میں کیا لینے آئے ہو؟"

اس نے جواب دیا " خدا کی آواز سننے!"

مجذوب نے کہا "عجیب بات ہے کہ میں انسان کی آواز سننے یہاں آیا ہوں جسے میں سالہاسال شہر اور گاؤں کی آبادیوں میں کبھی نہیں سن سکا، لیکن تمہارے سوال کا جواب جلد ہی مل جائے گا۔ سنو! یہ خدا کی آواز ہے جو درحقیقت تمہاری شہ رگ سے آ رہی ہے...."

کانچ کا ایک ٹکڑا اس کی آنکھوں کے سامنے رکھ دیا گیا۔

" یہ خدا کی آواز ہے۔"

تب خدا نے صفات کے " صد ہزار رنگ فانوس " سے اپنا رخ اس کی سمت کرتے ہوئے بڑے ہی دھیمے لہجے میں کہا:

" تہذیب نے مستعار نام سے تمہارا انسانیت کا سفر اب ختم ہونے کو ہے۔ تمہارا نام مجھے

ابدیت کی فہرست سے خارج کر دیا ہے کیونکہ لفظ ابدیت تمہاری ذہنی رفعتوں کا ایک سنگ میل محض ہے۔ تم نے عجز و انکساری کی دعاؤں کی جھوٹی عبا پہن کر ابدیت کے اس سنگ میل تک پہنچنے کی کوشش کی ہے۔ تم خاک نژاد ہو کر بھی عرش و فرش کی انتہائی سمتوں میں اپنی ہستی کو وسیع سے وسیع تر کرنے کی آرزو کرتے رہے۔ میں اپنا حکم صادر کرتے ہوئے وہ زمینی خاک تک اپنے فرشتوں کے نام معنون کرتا ہوں۔ .... اُن فرشتوں کی دائمی حمد و ثنا کا انعام و اکرام ہے...... پھر تم عرش و فرش کے سارے خاکی ذرّوں میں اپنے مادر وطن کی تلاش کرتے پھروگے۔ پھر کوہ طور کو عرش کا ایک گمنام حصہ بنا دیا جائے گا اور تمہاری پیغمبری اور نبوت میرا فرد شندہ الوہی خواب محض بن کر رہ جائے گی۔ یوں میں ہر آدم کو نار کا شرانگیز اضطراری لباس پہنا کر ایتھر کے انجانے خلاؤں میں جھونک دوں گا۔ میں اپنے جمال کی ہر شفق رنگ شفقت تم سے چھین کر کسی نئے جہاں کے تصرف میں دے دوں گا۔"

اس نے اپنی ہتھیلی مجذوب کی آنکھوں کی جانب بلند کی۔

ہتھیلی پردۂ مجاز بن گئی "اب تم انسان کی آواز سنو۔"

"اے خدا! اے ایزد ہشت دہ ہزار عالم! میں بھی تجھے کسی نئے اور حاضر نام سے پھر کبھی نہ پکاروں گا۔ میرے لئے تو "ال" نہ ہوگا۔ "ایلوہا" نہ ہوگا۔ گنتھا نہ ہوگا۔ کاتھرانہ ہوگا۔ وبھو یا نہ ہوگا۔ گوڈ نہ ہوگا۔ گوادہ نہ ہوگا۔ یا...... میری قوت نطق کا مسئلہ تک نہ ہوگا۔ تیری قدرت کا ہر جوہر تخلیق مجھے ہی تراشنے پر مجبور کرے گا۔ میں تیرے حرم غیب میں ہر ہر سمت لات و منات کا افسانہ ہوں گا خرد و جنوں کے اس نئے افسانے میں کبھی میں وحدت بنوں گا کبھی تو کثرت۔"

"اے حمد و ثنا کے ممدوحی پارے! میں دنیا جہاں میں پھیلی ہوئی ہر زبان کی روح میں داخل ہو کر تم تک اشارہ پانے والے ہر آہنگ و صوت کو ایسی بلا خیز نَے نوازی بخشوں گا کہ الہیات کا خزانہ ہی خالی ہو جائے گا۔ پھر تیرا اسرار اخزانہ میری بندگی کے کشکول میں سمٹ آئے گا۔ میرے جنوں کی فراست یہ کہتی ہے کر چکا ہے وادیٔ سینا میں کھڑا وہ کوہ طور تیری خدائی کی علامت رہے یا میری بشری عظمت کی پیغمبری کا تہذیبی نشان میں بھی اسے فقط مٹی کا ایک ایستادہ تودہ خیال کر کے ٹھکرا دوں گا۔ جس میں بنی اسرائیل کا فسانہ اب تک سنگ سار ہے۔ میں تو اب تلمیحات کی کہنہ زبان کہہ چکا۔"

مجذوب نے اس کی ہتھیلی پکڑ کر یوں کہا:

"زندگی کا کوئی مسئلہ تہذیب کا مسئلہ نہیں ہوتا خدا اور آدم کے ازلی رشتے کا ہوتا ہے۔ زندگی

کا معجزاتی رقص جس بانسری پر ہو رہا ہے وہ نرکل کی بانسری نہیں۔ صورِ اسرافیل کے اس درخت کی لکڑی ہے جس کے نیچے پہلی بار آدم سویا تھا۔ میں سویا تھا۔ تم سوئے تھے۔"

مجذوب نے یہ کہہ کر اپنے مٹیالے جھولے سے ایک عجیب تراش والی بانسری نکالی۔

"سنو! اگر تم یہ بانسری بجاؤ گے تو ٹیکسلا کی صدیوں سے خوابیدہ گندھارا تہذیب جاگ اٹھے گی حتیٰ کہ گوتم بدھ بھی نروان کے ابدی خواب سے جاگ اٹھے گا۔"

"لیکن یہ بانسری۔"

مجذوب نے جواب دیا:

"ہم طریقت اور حقیقت کے جاسوسِ قلب ہوتے ہیں مگر میں نے قلندرانہ ترنگ میں سروشِ فنا کا یہ صور چرایا ہے صورِ اسرافیل۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

وہ بانسری بجانے لگا۔ اس کی موسیقی میں سحر داؤدی بھی تھا اور یونانی آرفیوس کا حزن آلود ترنم بھی مگر آہستہ آہستہ ان دونوں کے گرد موت کی پُراسرار شبیہیں ان ستوپوں کے عرض و بلد پر ELONGATE اور DEFRACT ہونے لگیں۔

اس نے بانسری منہ سے ہٹالی۔

مجذوب "حق ہو" کا ایک فلک شگاف نعرہ بلند کرتا ہوا کسی استوپے کے پیچھے چلا گیا۔ اس مجذوب کا آخری جملہ یہ تھا۔

"خاموشی ــــــ روح کی سلامتی ہے۔"

اس نے مجذوب کا کشکول ایک استوپے پر رکھتے ہوئے کہا:

"کاش تمہارے اس کشکول میں ہر تہذیب کا تقدس سما جائے۔"



شراب نے کئی گھر اجاڑے ہیں

اپنے کنبے
کی خوشحالی
کے لئے
اس سے بچئے

پاکستان کی اہم اردو مطبوعات

تنقید

حسن عسکری: ستارہ یا بادباں
وزیر آغا: نئی نظم کی کروٹیں
سلیم احمد: پوری نظم آدھا آدمی
محمد علی صدیقی: توازن

نثر

مشتاق احمد یوسفی: زرگزشت / خاکم بدہن
شفیق الرحمن: تزک نادری
ابن انشا: ابن بطوطہ کے تعاقب میں
محمد خاں: بجنگ آمد
ابراہیم جلیس: دو ملکوں کی کہانی
اسحاق محمد خاں: حسن ناصر کی شہادت
ڈاکٹر ایوب مرزا: ہم کہ ٹھہرے اجنبی

شاعری

ن۔م۔ راشد: گمان کا ممکن
لا = انسان
فیض: دست صبا، سروادیٔ سینا
مجید امجد: آب جو
جعفر طاہر: ہفت کشور
منیر نیازی: دشمنوں کے درمیان
شام
ظفر اقبال: گلافتاب
افتخار جالب: مآخذ
ناصر شہزاد: چاندنی کی پتیاں
ابن انشا: چاند نگر
ناصر کاظمی: برگ نے

ناول

شوکت صدیقی: خدا کی بستی
خدیجہ مستور: آنگن
عبداللہ حسین: اداس نسلیں
جمیلہ ہاشمی: تلاش بہاراں
چہرہ رو برو
رضیہ فصیح احمد: آبلہ پا
فضل احمد کریم فضلی: خون جگر ہونے تک
ممتاز مفتی: علی پور کا ایلی

افسانے

انتظار حسین: کنکری / شہر افسوس

غلام عباس: جاڑے کی چاندنی

دھنک، کن رس

انور سجاد: استعارے

متفرقات

سبط حسن: پاکستان میں تہذیب
کا ارتقا

مبشر حسین: شاہراہ پاکستان

فیض احمد فیض: پاکستانی ثقافت

جمیل جالبی: پاکستانی کلچر

رسالے

"نقوش" لاہور

"فنون" لاہور

"اوراق" لاہور

"سویرا" لاہور

"الفاظ" لاہور

"نیا دور" کراچی

"سیپ" کراچی

"اردو" کراچی

مغربی بنگال شاہراہ ترقی پر

مغربی بنگال میں نئی حکومت کا ایک سال

* بے روزگاروں کے لئے بیروزگاری الاؤنس
* ہر دیہات میں پنچایتوں کا آزاد انتخاب
* عوام میں نئے اعتماد کی لہر

اگلا بچہ کب؟

کیا آپ بچوں کی پیدائش میں وقفہ رکھنے کے لئے کسی معیاری طریقے کی تلاش میں ہیں؟ یا آپ ابھی سوچ ہی رہے ہیں کہ آپ کا اگلا بچہ کب ہو؟ بچوں کی پیدائش میں وقفہ رکھنے کے مسئلے کو حل کرنے کے کئی طریقے ہیں. جی ہاں

دس الگ طریقے

کنڈوم (نرودھ)	جیلی
پیسری	ڈایا فرام
لوپ	ردھم طریقہ
کاپر "ٹی"	مرد کی نس بندی
فوم گولیاں	عورت کی نس بندی

پہلا بچہ ابھی نہیں
تین کے بعد کبھی نہیں

آپ تو یہ بات جانتے ہی ہیں۔ جی ہاں! براہ کرم یہ ان کو بتا دیجئے جو نہیں جانتے لیکن جن کے لئے اس کا جاننا ضروری ہے۔ شکریہ

سکھی پریوار کا منصوبہ بنائیے

davp 77/564


یہ اہم نہیں کہ کسی ٹانک کے اجزا کیا ہیں
اہم بات یہ ہے کہ
آپ کے جسم کو اِس سے کیا ملتا ہے؟
سنکارا میں ضروری وٹامنوں اور معدنی اجزا کے ساتھ ہی چودہ جڑی بوٹیاں
خاص کر شامل ہیں، جن سے ہضم کی طاقت بہتر کام کرتی ہے اور جن کی
مدد سے آپ کا جسم سنکارا میں شامل وٹامنوں وغیرہ کو
بہت تیزی سے جذب کر لیتا ہے اور آپ کی غذا
صحیح طور پر اور تیزی سے جزو بدن ہو کر آپ کو
بہت جلد قوت حاصل ہوتی ہے
cinkara
سنکارا
وٹامنوں اور قدرتی اجزا سے بھرپور
ہر موسم میں خاندان بھر کے لیے بے مثال ٹانک
ہمدرد
سنکارا آپ کے جسم کو بہت کچھ دیتا ہے

اترپردیش اردو اکادمی

کی نئی مطبوعات

۱۔ مرآۃ الشعر	عبدالرحمٰن	فوٹو آفسیٹ اڈیشن
۲۔ تنویر الشمس	شمس	
۳۔ روح نظیر	مخمور اکبرآبادی	

۴۔ قصیدہ نگاران اترپردیش — علی جواد زیدی

۵۔ انتخاب منظومات — خورشید الاسلام و مسعود عالم

۶۔ موناوانا — ترجمہ: سرتیج بہادر سپرو

۷۔ اودھ کے اردو ادیب — مرزا جعفر حسین

۸۔ انیسیات — مسعود حسن رضوی ادیب

اترپردیش اردو اکادمی نے اردو مصنفین کی کتابوں کی فروخت کے لئے اپنا بک ڈپو قایم کیا ہے۔ مصنفین اپنی کتابیں اکادمی کو مناسب کمیشن پر بھیج سکتے ہیں۔ تفصیلات کے لئے سکریٹری اترپردیش اردو اکادمی۔ آر کے منٹن روڈ لکھنؤ سے رجوع کریں۔

15 اگست

خوشیوں کا دن —— قدرت اور نصب العین کے لئے اپنے آپ کو وقف کرنے کا دن۔

آج کے دن ہم یاد کرتے ہیں:

— مہاتما گاندھی کی رہنمائی میں آزادی کی تاریخی جدوجہد۔
— جانے لاکھوں کروڑوں ہم وطنوں کی قربانیاں اور مصائب۔
— آزادی کا استحکام، ملک کی یکجہتی اور اقتصادی ترقی کی راہ پر رکھنے کے عظیم کام۔

آج ہم عہد کرتے ہیں:

— ہم ملک کی سالمیت، وحدت اور آزادی کا تحفظ کریں گے۔
— ہم نئے 5 اور 76 نکاتی پروگراموں کے ذریعے غریبوں کی بہبود کا کام جاری رکھیں گے اور ان کی صحت، تعلیم اور روزگار کی طرف زیادہ توجہ دیں گے۔
— ہم ملک کے کمزور طبقوں کو اپنے ساتھ لے کر ان کے حقوق کی حفاظت کرتے ہوئے سماجی اور اقتصادی ترقی کی راہ پر آگے بڑھیں گے۔

آزادی کی اس اکتیسویں سالگرہ پر آئیے ہم عہد کریں کہ ہم مہاتما گاندھی کے سپنوں کا بھارت تعمیر کریں گے — آئیے! ہم ہر آنکھ سے آنسو پونچھنے کی کوشش کریں۔





فیض کے ڈرائنگ روم میں
بیگم ایلیس فیض

فیض — محمد حسن



شعبۂ اردو کراچی یونی ورسٹی کے استقبالیے کا فوٹو گروپ
پروفیسر مجنوں گورکھ پوری۔ پروفیسر ابواللیث صدیقی۔ محمد حسن۔ پروفیسر محفوظ علی پرو وائس چانسلر
عبدالقیوم صدر بزم ادب۔ ڈاکٹر شاہ علی۔ ڈاکٹر ابوالخیر کشفی۔ ڈاکٹر جمیل اختر۔ سحر انصاری۔ ڈاکٹر [illegible]



ارباب قلم کراچی کے استقبالیے میں تقریر کرتے ہوئے

حاضرین: فصیح احمد۔ رضیہ فصیح احمد۔ روشن محمد حسن۔ انور اکرام بریلوی۔ غلام عباس۔ راغب مرادآبادی۔ ابوسلمان شاہجہاں پوری۔ مشفق خواجہ۔ [illegible]
محمد علی صدیقی۔ شہزاد منظر۔ اقبال صفی پوری۔ جاذب قریشی۔ شان الحق۔ بیگم سلمیٰ شان الحق حقی۔ خواجہ حمید الدین شاہد [illegible]